دو چند نظمیں۔ مقدمہ از عبد الماجد مع سادہ و رنگین تصاویر ... نے کتابت و طباعت کا حسن دوبالا کر دیا ہے۔ قیمت عہ

کلام الملوک مولوی حمید اللہ خاں نے تقریباً اسی شاہزادوں کے اردو کلام کا یہ انتخاب مرتب کیا ہے۔ قیمت ۱۰/

مطلع انوار منشی مہاراج بہادر برق دہلوی بی اے کی نظموں کا دلآویز مجموعہ۔ مع مقدمہ ... لال رتن و دیباچہ از اصغر گونڈوی۔

دنیائے راز ابوالاثر ... راز چاند پوری کی قدیم و جدید طرز کی مختصر نظموں کا منتخب مجموعہ ۱۰/

جنگ نامہ عالم علی خاں ایک دکنی شاعر کی کتاب تصنیف ...

شاہنامہ اسلام (حصہ دوم) پنجاب کے نامور شاعر حفیظ جالندھری کی مشہور و مقبول تصنیف کا دوسرا حصہ جس میں جنگ بدر وغیرہ کے حالات ہیں قیمت ے/

پطرس کے مضامین پنجاب کے مشہور ادیب احمد شاہ بخاری ایم اے کے ظریفانہ مضامین کا قابل دید مجموعہ

او پردیسی پیر علی اختر بی اے ایل ایل بی شاعر دیوان حافظ و خیام کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ۱۲/

نوادر مرزا محمد عسکری ۱۵/ مترجم تاریخ ادب اردو نے اس کتاب میں ہر طبقہ کے اکابر رجال کے لطائف و ظرائف جمع کیے ہیں شروع میں ممتاز حسین عثمانی ایڈیٹر اودھ پنچ کی پیشگفت اور مرتب کا مقدمہ۔ قیمت عہ

خیام

مشہور فارسی شاعر حکیم عمر خیام کے مستند و مفصل حالات زندگی۔ انکی تصانیف پر تبصرہ اور انکے عقائد و فلسفہ پر بحث اور آخر میں خیام کے سات اصل رسائل عربی مع ترجمہ و تحشیہ کے بعد مع اسماء اشخاص و قبائل و کتب وغیرہ کی مفصل فہرستوں کے مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے۔ حجم ۵۰۰ صفحے قیمت عہ

ترانہ مرزا واحد حسین یاس عظیم آبادی ثم لکھنوی کا مجموعہ رباعیات جس میں ... استاد الدہر

انقلاب دہلی غدر کے بعد دہلی کی بربادی پر شہر کے باکمال نے دہلی و تاثر جو ماتم سرائی کی اسکا عبرت انگیز و قابل دید مجموعہ ... نفیس ...

داستان عجم (حصہ اول) شاہنامہ فردوسی کے ایک درجن نظموں کو اردو لباس پہنایا گیا ہے۔ قیمت ۱۰/

سیلاب تبسم نوجوان مزاحیہ نگار شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا تیسرا مجموعہ عہ

طوفان تبسم - مشہور نوجوان مزاحیہ نگار ادیب شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا جدید مجموعہ عہ

ملنے کا پتہ - الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

جلالستان نیاز فتحپوری کے اُن ۲۱ افسانوں کا ضخیم مجموعہ جو ۱۹۲۱ء کے بعد لکھے گئے اور ملاستان میں شامل نہیں ہیں۔ قیمت للعہ

فردوس خیال منشی پریم چند کے افسانوں کا ایک مجموعہ۔ قیمت ؎

جلوۂ ایثار پریم چند کے افسانوں کا یہ مجموعہ پہلے نواب رائے کے نام سے شایع ہوا تھا۔ ؎

چھیتا بھائی مرزا عظیم بیگ چغتائی کا یہ مشہور ناول جو کم عمروں کے سلانے کے لیے لکھا گیا ہے مع مقدمہ از مسٹر منوہر سہائے انور ایم۔ اے۔ عمر

انار کلی سید امتیاز علی تاج کا ڈراما۔ جس میں شہنشاہ اکبر کی محبوب کنیز و جہانگیر کے معاشقہ و اسکے دردناک انجام کی داستان بیان ہوئی ہے تین تصاویر اور خوشنما جلد۔ قیمت ؎

خر ریوی بی مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل کے مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت ؎

کیمیا گر اور دیگر افسانے پروفیسر محمد مجیب کے ۱۹ افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ

فاوسٹ جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کا یہ ڈراما دنیائے ادب و تخیل میں مشہور ہے ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے نے اُردو میں با مقدمہ پیش کیا ہے۔ للہ

نواب جمیل الشان

منشی عبد الرؤف عباسی، ایڈیٹر حق کا ناول جس کا دیباچہ مولوی عبد الماجد بی۔ اے نے لکھا ہے۔ شستہ زبان، پاکیزہ خیالات، دلنواز انداز بیاں اور حد درجہ دلچسپ، ایسے اچھے ناول بہت کم شایع ہوئے ہیں قیمت عہ

فرانسیسی افسانے اس مختصر مجموعہ میں پروفیسر محمد دین تاثیر ایم۔ اے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ایم۔ اے وغیرہ کے ۶ فرانسیسی افسانوں کا ترجمہ ہے۔ قیمت ؎

پھول کماری پنڈت پیارے موہن دتاتریہ بی۔ اے ایل ایل بی تخلص جناب کیفی دہلوی کا ایک بالکل نئے طرز کا ڈراما ۱۲

محب وطن جرمن ادیب الفرڈ نیومن کے انتہائی ناول کا ترجمہ از سراج الدین احمد نظامی۔ قیمت ؎

نیرنگ بارہ افسانوں اور ایک ڈرامہ کا مجموعہ ۲۵۰ صفحوں میں ایس آر کے کی جانب سے شایع ہوا ہے۔ قیمت ؎

بیلہ میں میلہ سید دہلی کی شہزادیوں کی دلآویز سرگزشت از مولانا خواجہ حسن نظامی ۱۲

دامن باغباں مشہور ادیب و اخبار نویس ڈاکٹر سعید احمد صدیقی بریلوی کے افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

چند ڈرامے — فرمائش محمد عمر صاحبان مصنف نالک ساگر کے سات ڈراموں کا مجموعہ۔ قیمت ۸ر

رانی کیتکی — سید انشاء اللہ خاں انشا کی بےمثل کہانی جس میں عربی فارسی کا ایک لفظ نہیں آنے پایا۔ قیمت ۴ر

ایسپ کی کہانیاں — انگریزی ادب کی مشہور کتاب جس میں سو کہانیاں مع ۸۶ تصاویر قیمت ۸ر

شیخ چلی کی کہانی — یہ گیارہ کہانیاں ماڈرن ریویو کلکتہ میں بزبان انگریزی چھپی تھیں اب اردو میں منتقل ہوئی ہیں

کہانی کیسے لکھنا چاہیے — منشی کنہیا لال ایم اے وکیل ایڈیٹر اردو ... نے افسانہ نگاروں کے لئے یہ ہدایت نامہ تیار کیا ہے۔ ۸ر

گنجینۂ اقوال و خزینۂ امثال — زبان کے نقاط سے چار ہزار اقوال و امثلات اپنے محل و تصرف اور دلچسپ کہانیوں کے جو مثلوں اور کہاوتوں سے متعلق ہیں۔ قیمت ۱ر

سرود گیتی — سرود من کیپتی کا اردو ترجمہ ۱ر

بہار گلشن کشمیر

(۲ جلد)

اس ضخیم تذکرہ کے ۱۲ سو سے زائد صفحات میں چار سو کے قریب کشمیری الاصل شعراء کے حالات اور منتخب کلام ہے سوا سو تصاویر دینے کے علاوہ ساری کتاب دو رنگ میں چھپی ہے۔ کتابت، طباعت جلد سب دلکش

قیمت صرف عہ

ریاست — حکیم افلاطون کی مشہور عالم تصنیف ری پبلک جو انکے سارے فلسفہ اور عمر بھر کے تجربہ کا نچوڑ ہے اسکا قابل دید ترجمہ۔ از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں پرنسپل جامعہ ملیہ قیمت ۱عہ

ریڈیو — پروفیسر تاج الدین ایم ایس سی نے نظریۂ اضافیت کے بعد اب بے تار پیام رسانی کے علم پر بیش قدر کتاب لکھ کر اردو کو مالامال کیا۔ قیمت ۱۲ر

رموز حکمت — حکمت و فلسفہ کا تفصیلی بیان، قدیم فلاسفہ کے پہلو بہ پہلو علوم جدیدہ کے انکشافات۔ از مولوی حکیم محمد شریف مصطفیٰ آبادی۔ قیمت ۳ر

دختر فرعون — مشہور جرمن ماہر علوم مصریہ جارج ایبرز کی قابل قدر کتاب کا ترجمہ۔ از ڈاکٹر لطافت حسین خاں آئی ایم ایس، جسکے مطالعہ سے مصر و ایران کا تمدن و طرز معاشرت اور وہاں کے باشندوں کی تہذیب و شائستگی کا حال معلوم ہوگا۔ قیمت ۱عہ

دیوان گرامی ۱ر   **رباعیات گرامی** ۸ر

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

معاجم القرآن الفاظ قرآنی کے معانی اور تخریج آیات و الفاظ کی قابل قدر فہرست ۔ قیمت ؏

فتاوی حنفیہ فقہ کی مشہور کتاب شامی کا اردو خلاصہ ۔ جلد اول قیمت سے،

نزہۃ البساتین اردو امام ابی محمد عبد اللہ بن یافعی کی مشہور کتاب روضۃ الریاحین کا ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے کر دیا ہے مترجم نے امام یافعی کی پانچسو حکایات پر پانچسو ستر حکایات کا اضافہ بھی کیا ہے ۔ ؏

خواب و مکالمہ حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کامل التعبیر کا اردو ترجمہ بشمول مقدمہ و سوانحعمری مصنف ۔ حجم ۵۰۰ صفحے قیمت سے،

التشبہ فی الاسلام از مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند جس میں تشبہ الکفار کی اہمیت، اس کی شرعی و عقلی حیثیت اسکے منشاء و ماخذ، نفسی درجات اور قدرتی نتائج پر عقلی و نقلی دلائل سے بحث کی گئی ہے اور مسلمانوں کے لیے زمانہ حال کی ضروریات کے لحاظ سے نہایت قابل قدر کتاب ہے ۔ قیمت ؏

کشف الظلام علامہ تقی الدین سبکی نے ابن تیمیہ کے رد میں کتاب شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام لکھی تھی ۔ جس میں زیارت قبور، استمداد، توسل، تشفع، حیات انبیاء و شہداء، مقام محمود، اقسام شفاعت، احیا نورہ، عیسوی بحث ہے مولانا شاہ عز الدین پھلواروی نے اسے اردو لباس پہنایا ۔ قیمت ؏

اصل الاصول مولانا شاہ علی اکبر قلندر کی کتاب کا ترجمہ ۔ از شبیر احمد علوی بی اے ۔ حقیقت سلوک، شرائط شیخ، اقسام بیعت، آداب پیر و مرید وغیرہ ۔ قیمت ۴،

بزرگوں کی باتیں جس میں بزرگان دین کے ۵۰۰ واقعات معتبر کتابوں سے اخذ کر کے جمع کیے گئے ہیں ۔ از محمد حسین خاں بی اے سابق ڈائرکٹر تعلیمات افغانستان ۔ قیمت ۸،

حسن وفا ۔ عہد رسول اللہ صلعم کے معاہدوں کا ترجمہ جو عہد نبوی و خلفاء عباسی جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ابتداء میں اسلام کیونکر پھیلا ؏

دُرَرِ فرائد

علامہ محمد بن سلیمان مغربی نے حدیث شریف کی ۱۴ مستند کتابوں کی دس ہزار حدیثیں بحذف سند و ترک مکررات جمع الفوائد میں جمع کی تھیں اور ہر حدیث کے آخر میں لکھا تھا کہ کس کتاب میں ہے اور کس حد تک قابل عمل ہے ۔ ان چودہ کتابوں میں سے ۴، آج تک طبع نہیں ہوئیں ۔ جمع الفوائد کو مولانا عاشق الہی صاحب نے پہلی بار ہندوستان میں طبع کیا اور اب مع اصل متن ترجمہ شایع کر رہے ہیں ۔ جلد اول ۔ حجم ۴۰۰ صفحے ۔ قیمت للعہ،

ملنے کا پتہ ۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

تاریخ اسلام (جلد سوم) مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی کی تاریخ اسلام کے دو حصے شایع ہوکر حسن قبول حاصل کرچکے ہیں تیسری جلد اب شایع ہوئی ہے۔ قیمت ے

تاریخ صقلیہ (جلد اول) مولوی ریاست علی ندوی رفیق دار المصنفین نے صقلیہ میں اسلامی عہد حکومت کی مفصل تاریخ پہلی بار مرتب کی ہے جس سے فاتحین کے عظیم الشان کارناموں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ حجم ۵۰۰ صفحے قیمت للعہ

تاریخ افاغنہ (۲ حصے) افغانوں کا سلسلہ نسب تاریخ قبائل و نامور سلاطین و اولیا کا تذکرہ مع سوانح امیر عبدالرحمٰن خاں۔ قیمت عار

ترجمۂ تاریخ فرشتہ

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں حکومتوں اور سلاطین کے حالات میں تاریخ فرشتہ نہایت مشہور و مستند کتاب ہے۔ اُس کا اُردو ترجمہ بڑے اہتمام سے دو جلدوں میں شایع ہوا ہے۔ حجم ۱۳۰۰ صفحے۔ قیمت صمہ

انقلاب افغانستان امان اللہ خاں کے زوال حکومت کے حالات اور اسباب اور غازی نادر شاہ کے خدمات و فتوحات محمد حسین خاں بی اے کے قلم سے۔ قیمت ع

ترکوں کی اسلامی خدمات اور انکی زبان و ادبیات پروفیسر ڈاکٹر جولیس جرمانس پروفیسر بڈاپسٹ یونیورسٹی نے جامعہ عثمانیہ میں جو لکچر دیے تھے۔ انکا ترجمہ پروفیسر سید وہاج الدین

صاحب نے کیا ہے۔ قیمت عہ

معین الآثار مولفہ مولوی معین الدین احمد اکبرآبادی جس میں آگرہ کی مشہور و معروف عمارات روضۂ تاج محل کی مبسوط تاریخ اور شاہجہاں کی چہیتی بیگم ممتاز محل ارجمند بانو بیگم کی سوانح عمری کے علاوہ دیگر عمارات متعلقہ کے حالات ہیں متعدد عکسی تصاویر و نقشہ جات مستزاد۔ قیمت عار

میرے وطن کی کہانی اس باتصویر کتاب کے ۱۲۔ ابواب ہیں جن میں مختلف ہندوستان کے زمانوں کے مشہور تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں۔ قیمت ۱۰ر

دلچسپ تاریخی تحفے طلبا کے لیے اقوام ممالک غیر کے حالات کا یہ سلسلہ سلالہ کے انداز میں حضرت اصغر گونڈوی نے تحریر کیا ہے۔ حسن طباعت اور تصاویر کے اضافہ نے مزید دلکشی پیدا کردی ہے۔ ہر کتاب کی قیمت دس آنے (۱۰/۱) ہے۔ تحفۂ چین۔ تحفۂ جاپان۔ تحفۂ آسٹریلیا۔ تحفۂ مصر و حبش۔ تحفۂ لندن۔ تحفۂ جرمنی۔ تحفۂ فرانس۔ تحفۂ روس۔ تحفۂ امریکہ۔ تحفۂ فلسطین۔

دولت غزنویہ - باتصویر۔ سلطان محمود غزنوی اور اُسکے جانشینوں کے کارنامے۔ قیمت عار

سیر الصحابہ جلد ششم مرتبہ مولوی حاجی معین الدین ندوی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ امام حسن و حسین علیہما السلام اور حضرت امیر معاویہ و حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے سوانح، اخلاق و فضائل اور انکے مذہبی، علمی و سیاسی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے اور تمام پیچیدہ مذہبی و سیاسی مباحث کو تاریخ کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے قیمت عہ

سیر الصحابہ جلد ہفتم جس میں ایک سو پچاس صحابہ کے حالات ہیں جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا یا اس سے پہلے مشرف باسلام ہوئے لیکن ہجرت نہ کر سکے یا عہد رسالت میں صغیر السن تھے۔ مرتبہ مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت عہ

کے مختصر حالات اور خصوصیات علمی و اخلاقی و ...

سیرۃ الغازی مصطفےٰ کمال پاشا کے سوانح اور تحریک آزادی وطن ترکی کی مکمل و مستند تاریخ مصنفہ امین محمد سعید و کریم خلیل ثابت مصری کا ترجمہ۔ از مولوی ظلم باقی لودی۔ عہ

افغان بادشاہ غازی امان اللہ خاں سابق تاجدار افغانستان کے مشہور حالات اور انکے عظیم الشان کارنامہائے حکومت۔ محمد حسین خاں صاحب بی اے سابق ڈائرکٹر تعلیمات افغانستان کے قلم سے جو ۱۲ سال تک افغانستان میں رہے تھے۔ قیمت ۸ر

رحمۃ للعالمین (جلد سوم)

قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی مشہور تالیف کی تیسری جلد ۴۹۰ صفحوں پر شایع ہوگئی ہے۔ خصائص نبوت خصوصیات نبوت محمدی، خصائص قرآن و خصائص اسلام کا جامع اور مدلل بیان۔ قیمت عہ

رہنمایان ہند ہندوستانی پیمبروں سری کرشن، اور گوتم بدھ کے سوانح حیات اور انکی تعلیمات نیز شنکر اچاریہ، رامانج، رامانند اور کبیر داس کے حالات۔ قیمت ۸ر (طبع جدید)

حیات احمد بن حنبل امام احمد بن حنبل کے حالات انکے معتقدات، انکی عظیم الشان دینی خدمات اور خلق قرآن کے مسئلہ میں حکومت کے جبر و استبداد کے مقابلہ میں انکی عجیب و غریب استقامت عہ

مشاہیر امت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کی عربی تصنیف مع ترجمہ و شرح اردو۔ جس میں خلفائے راشدین و دیگر اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ائمہ اربعہ و دیگر اکابر متقدمین

سیرت محمد علی مولانا محمد علی مرحوم کے سوانح اور کارنامہائے قومی و ملکی خدمات کا بیان۔ مرتبہ مولوی رئیس احمد جعفری۔ حجم ۴۰۰ صفحے مع تصاویر۔ قیمت عہ

امرائے ہنود۔ عہد اکبری کے نامور ہندو امرا و ملکی حالات۔ از مولوی سید احمد مارہروی مصنف افسانہ ...

موازنۂ ہلال و صلیب از عبدالسمیع خاں صاحب بسمت شاہجہاں پوری

جس میں یورپین مصنفین کے بیانات کی مدد سے عہد ہلالی کے تمدن و تعلیم و شائستگی کا عہد صلیبی کے تمدن و تعلیم سے موازنہ کر کے مسلمانوں کی فوقیت دکھائی گئی ہے ۔ عہ

مشاہدات سائنس سائنس کے مختلف شعبوں پر بارہ مفید و دلچسپ مضامین از مسٹر مسنو انجنیر قیمت عہ

شعرستان سید محمد حاتم علی مترجم تاریخ اسلام کی نظموں کا مجموعہ عہ

قوم کی آواز یعنی مہاتما گاندھی کی ان تقریروں کا مجموعہ جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس لندن میں کی گئیں ۔ عہ

آئینۂ جمال مشہور شاعرہ محترمہ بلقیس خاتون صاحبہ جمال کی نظموں کا قابل قدر مجموعہ ۱۲ر

ادب زریں محترمہ حجاب امتیاز صاحبہ کے مضامین کا دوسرا مجموعہ قیمت ۱ر

نغمات محترمہ حجاب امتیاز کے مضامین کا پہلا مجموعہ ۔ قیمت ۱ر

روحانی شادی منشی پریم چند کا ایک دلچسپ ڈرامہ ۔ قیمت ۸ر

ہنسانے فسانے سید ابو تمیم صاحب فرید آبادی کے مزاحیہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ۔ عنقریب از طبع ہوگی ۔ عمر

آرسین لوپن جاسوس مارس لیبلانک سراغرسانی کے افسانوں کے لیے بہت مشہور ہے ۔ اسی کے ایک مشہور ناول کا ترجمہ منشی تیرتھ رام فیروزپوری نے کیا ہے عہ

چڑیا کی ٹکی ڈلبنائٹن ویلز کے ایک ہوشربا جاسوسی افسانہ کا ترجمہ ۔ از منشی تیرتھ رام فیروزپوری قیمت ۱۲ر

مصنوعی انسان منشی تیرتھ رام فیروزپوری کے کیارہ منتخب افسانوں کا مجموعہ ۔ ۱۲ر

سنبلستان بنگال کے مشہور افسانہ نگاروں کے چیدہ منتخب افسانوں کا ترجمہ ۔ از منشی تیرتھ رام فیروزپوری ۔ قیمت ۱ر

نقد الادب ۔ افسر میرٹھی کی تنقیدی کتاب عہ

مرآۃ المثنوی

مولانا جلال الدین رومی قدس سرہ العزیز کی مثنوی معنوی کے قصص و حکایات کی تلخیص، حکم و معارف کی تعبیر اور اشعار مشتمل بر آیات قرآنی و محتوی بر احادیث نبوی کی ترتیب قاضی تلمذ حسین ایم اے (علیگ) رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی ۔ مع مقدمہ از پروفیسر نکلسن ۔ قاضی صاحب نے سالہا سال کی عرق ریزی و دماغ سوزی کے بعد مثنوی مولانا روم کا خلاصہ نہایت دلچسپ بنا دیا ہے ۔ حجم ۱۱۰ صفحے طباعت و جلد اعلیٰ ۔ قیمت ص

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱ جلد ۲۸ جولائی سنہ ۱۹۳۴ء

نئی زندگی

پورے پچیس سال ہوئے جولائی سنہ ۱۹۰۹ء میں الناظر کا پہلا پرچہ شائع کیا گیا تھا اب چار سال کی تعطیل منانے کے بعد پھر جولائی سنہ ۱۹۳۴ء سے نیا دور شروع ہوتا ہے

اللہ اللہ! ربع صدی کے ارتقا میں؛ تغیر میں دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ حکومتیں بدل گئیں۔ جغرافیے تبدیل ہو گئے۔ پرانی بادشاہتیں ختم ہو گئیں۔ نئی جمہوریتیں بن گئیں۔ محکوموں کی گردنوں سے غلامی کے طوق اتر گئے۔ آزاد قومیں علمبرداری کے پردہ میں غلام بنی ہوئی ہیں۔

ہندوستان نے بھی سوتے سوتے انگڑائی لی اور مرکزی حکومت سے لیکر قصبات و دیہات تک کا نظام بدل دیا صوبوں کی تعداد پہلے کے مقابلہ میں دگنی ہو گئی۔ ۳ کے بجائے ۹ گورنریاں قائم کی گئیں۔ ۴ ہائیکورٹوں کی جگہ اب ۸ عدالتہائے عالیہ داد انصاف دے رہی ہیں اور ۵ کے بجائے ۱۸ یونیورسٹیاں ملک میں اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کر رہی ہیں۔ پہلے اگر ہائیکورٹ کی ججی اور ضلع کی کلکٹری اہل ملک کی بے معراج تھی، تو اب حکومتِ ہند کے اراکین، ہائیکورٹ کے چیف جسٹس، صوبوں کے وزیر اور ہوم ممبر بلکہ گورنر تک ہندوستانی ہوتے ہیں۔ میونسپلٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور یونیورسٹیوں کا انتظام اراکین حکومت کے ہاتھوں سے نکل کر خود اہل ملک کے تحت میں آگیا ہے کونسلوں اور اسمبلی میں نمائندگان قوم صدارت کرتے اور کبھی کبھی حکومت کی تجاویز کو مسترد کر کے قصر اقتدار کو ہلا دیتے ہیں۔

جو پہلے لال پگڑی یا فرنگی گورے کی صورت دیکھ کر حواس باختہ ہو جاتے تھے اب علی الاعلان آزادی کے نعرے لگاتے اور قومی جھنڈے لہراتے ہیں۔ جہاں ملک کے بڑے بڑے سردار اپنی خواہشات کا اظہار مودبانہ عرضداشتوں کے ذریعہ کرنے اور اپنی شکایات کے متعلق احتجاجی تجاویز منظور کرنے پر قناعت کیا کرتے تھے وہاں اب مقاطعہ، ترک موالات، اور قانون شکنی تک نوبت آجاتی ہے۔

آزادی کامل کی طلب ہر زبان و قلم پر جاری ہے

دنیائے اردو بھی، العالم متغیر کے انقلاب آفریں اثرات سے محفوظ نہیں رہی۔

حیدرآباد دکن، جسکی علم پروری و ادب نوازی کی روایات بہت پرانی ہیں، اب عثمانیہ یونیورسٹی اور اسکے دارالترجمہ کی بدولت خدمتگزاران ادب کی امیدوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

پنجاب جہاں کے باشندوں کو سرسید مرحوم نے زندہ دلی کی سند عطا فرمائی تھی، اخبارات و رسائل کی کثرت اور مطابع و مطبوعات کی فراوانی کے باعث ادبی دنیا کا سرتاج بن گیا ہے

دہلی، جو ہندوستان کے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے تصرف سے نکل کر پنجاب کا ایک ضلع بن گیا اور تجارتی منڈی ہونے کے سوا کوئی امتیاز نہ رکھتا تھا اب حکومت کا صدر مقام قرار پایا اور مملکت ہند پر حکمرانی کر رہا ہے۔ اردو کی اس قدیم راجدھانی کی ادبی سرگرمیاں اگرچہ زیادہ وقیع نہیں تاہم رسائل و مطبوعات کی اشاعت میں اسکا قدم تیز ہوتا جاتا ہے اور مسلمانان ہند کی آزاد قومی یونیورسٹی اور اسکی اردو اکیڈمی کی وجہ سے وہاں ادب اردو کا ایک قابل قدر مرکز بن جانے والا ہے۔

صوبۂ متحدہ میں ایک نیم سرکاری ہندوستانی اکیڈمی قائم ہو گئی ہے جو اہل قلم اور نوجوانوں کے قلوب میں ادبی خدمت اور تصنیف و تالیف کا ولولہ پیدا کر رہی ہے۔

بہار، جو بنگال کی قید و بند سے نکل کر اب مستقل صوبہ بن گیا، اپنا جدا ہائیکورٹ رکھتا اور علیحدہ یونیورسٹی قائم کر چکا ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی کی قسم کے ایک ادارہ کی صنعت گری میں مصروف ہے اور مطبوعات و جرائد کی تعداد میں تیزی سے اضافہ کر رہا ہے۔

ہمارا لکھنؤ جو شاہان اودھ کی اولوالعزمیوں کی بدولت "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" اور اردو کے نامور پیغمبران سخن کی جائے پناہ اور آرامگاہ ہونے کی بنا پر کبھی دہلی سے ہمسری کا دعوٰے رکھتا اور مرزا غالب سے "فردوس چشم جہاں" کا لقب حاصل کر چکا تھا، منشی نولکشور کی علم دوستی و

ادب نوازی اور اودھ پنچ کی بذلہ سنجیوں کا دور گزار کے۔ لکھنؤ یونیورسٹی اور اس کے حلقۂ السنۂ مشرقیہ کا جولان گاہ ہے۔ اخبارات و رسائل، مطبوعات و مطابع کی تعداد میں اضافے کے باوجود یہاں کی بزم ادب پر شاعروں اور مشاعروں کا اب بھی تسلط و اقتدار ہے، اور غالباً سنجیدہ علمی و ادبی تحریکات کی تاسیس و نشو و نما کے لیے ابھی ایک نسل اور انتظار کرنا پڑے گا۔

بنگال، بمبئی، مدراس، سرحد، بلوچستان، سندھ، ممالک متوسطہ، راجپوتانہ، کاٹھیاواڑ، میسور اور برما وغیرہ دور دراز حصص میں بھی مطابع، مطبوعات، رسائل و اخبارات کی تعداد روز افزوں ہے۔ یہاں کی انجمنیں، کتب خانے، دار المطالعے، کلب اور علم پرور، ادب دوست باشندے شمالی ہند کے اخبارات و رسائل اور مطبوعات، مطابع کی ترقی میں جو نمایاں حصہ لے رہے ہیں، وہ درحقیقت اردو کی تاریخ کا روشن ترین باب کہا جا سکتا ہے۔

آخر میں اُن دو قومی اداروں کا ذکر ناگزیر ہے جو اُردو کی خاموش خدمت گزاری میں ہمارے ہندوستان کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو جو ۱۹۰۳ء میں قائم ہوئی تھی، ۱۹۱۳ء سے مولوی عبد الحق صاحب کے انتظام میں ہے اور سال بہ سال قیمتی ادبی جواہر کی اشاعت میں مصروف رہتی ہے۔ اور دار المصنفین جو اُس سے عمر میں ۱۲ سال کم ہے، اسلامی، علمی، و ادبی مطبوعات کے ذریعہ ادب اُردو کو مالا مال کرنے میں نمایاں تر کامیابی حاصل کر رہا ہے۔

انقلاب و تغیر کے اس ماحول میں چاہیے تھا کہ الناظر کا یہ نمبر سابق کے پرچوں سے زیادہ شاندار صورت میں پیش کیا جاتا۔ مگر قدیم ناظرین الناظر کو معلوم ہے کہ سالہا سال تک مجلسی، تمدنی اور سیاسی کاموں میں انہماک کی وجہ سے میرے ادبی کاروبار، خانگی معاشرت اور جسمانی صحت کو کس قدر پیہم نقصانات برداشت کرنا پڑے۔ خدا کا شکر ہے کہ دو ڈھائی سال کی پُر سکون زندگی نے کسی قدر تندرستی کو سنبھال لیا اور خانگی الجھنوں سے نجات دی ہے۔ مگر اقتصادی ابتری کے اس دور میں، مالی نقصانات کی تلافی اتنی جلد نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے مناسب یہی معلوم ہوا کہ الناظر کا موجودہ دور اُسی منزل سے شروع کیا جائے، جہاں سے ۱۹۰۹ء میں اس کے پہلے سفر کی ابتدا ہوئی تھی، اور پھر تدریجاً اس کا حجم بڑھا دیا جائے۔ اسی لیے بالکل ابتدائی پرچوں کی طرح فی الحال ۴۸ صفحے کی ضخامت رکھی گئی ہے، اور قیمت بھی گھٹا کر عہد اول کی طرح عہ سالانہ کر دی گئی ہے۔ انشاء اللہ رفتہ رفتہ حجم ۸۰ صفحے کر دیا جائے گا۔ بلکہ ممکن ہوا تو پورے ۱۰۰ صفحے تک پہنچا دیا

جائے گا۔

فی الحال حجم کم رکھنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ احباب قدیم میں سے بعض اصحاب میری سیاسی سرگرمیوں یا ادبی کاموں سے مسلسل بے توجہی کے باعث اتنے بد دل ہوگئے ہیں کہ اُن کا منانا آسان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنکے مضامین سے یہ پرچہ محروم رہا۔ امید ہے کہ چند ہی روز میں یہ بادل چھٹ جائیں گے اور الناظر کے اوراق کی زینت افزائی کے لیے اُن تمام احباب کے مضامین وصول ہونے لگیں گے جنکی بدولت الناظر کو ملک کے ادبی حلقوں میں امتیاز خاص حاصل ہوا۔

اب چونکہ مجلسی کاموں میں حصہ لینے کے قابل نہیں رہا اس لیے انشاء اللہ تعالیٰ سارا وقت اسی ادبی کاروبار پر صرف ہوگا اور اس خیال سے کہ نئے دور میں الناظر کا پیام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچایا جائے، اس کا ایک ارزاں ایڈیشن بھی شایع کیا جا رہا ہے جو طلبا اور کم استطاعت لوگوں کو صرف ایک روپیہ سالانہ میں دیا جائے گا۔ الناظر کے معاونین و بہی خواہاں اُردو سے توقع ہے کہ وہ حتی المقدور اس کی کوشش فرمائیں گے کہ انکے مقام یا شناساؤں کے حلقہ میں جو اصحاب اردو علم ادب سے دلچسپی رکھتے اور زیادہ قیمت ادا نہیں کرسکتے وہ یہی ارزاں پرچہ منگالیں کم سے کم ایسے لوگوں کے پتے ارسال کیے جائیں تو دفتر الناظر براہِ راست اُن سے رسالہ کے مطالعہ کی تحریک کرے گا۔

گذشتہ تین چار سال کے اندر یوں تو ملک کی متعدد قابل قدر ہستیاں ہم سے جدا ہوگئی ہیں جنکی وفات پر اظہار غم و افسوس کرنا الناظر کا فرض ہوتا مگر اُردو دنیا کو جن دو بزرگوں کے انتقال سے ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہے ان کا ذکر کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا

لکھنؤ کو مرزا محمد ہادی رسوا بی اے کی ذات پر بجا طور سے فخر تھا مرحوم عربی، فارسی اور انگریزی کے فاضل، ہیئت، ریاضی اور فلسفہ کے ماہر، اُردو کے نغز گو شاعر اور ادیب کامل تھے۔ جانشینِ دبیر مرزا اوج کے شاگرد رشید ہونے کی وجہ سے ایک طرف صحت زبان اور فن شاعری کے قیود کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے۔ دوسری طرف کلام میں آمد و روانی سلاست و شگفتگی، نازک خیالی و مضمون آفرینی کے لحاظ سے میر و غالب کے ہمنوا معلوم ہوتے۔ شاعری کو مستقل پیشہ نہیں بنایا، غالباً اسی سبب سے دیوان کی تدوین و اشاعت نہ ہوئی۔ دو مثنویاں امید و بیم و نوبہار اور ایک منظوم ڈراما ابتداہی میں چھپ گئے

تھے۔ جن کو قعرِ گمنامی سے بچانے کے لیے الناظر پریس نے دوبارہ طبع کر دیا۔ نثر میں افشائے راز، امراؤ جان
ادا، ذات شریف اور شریف زادہ کے علاوہ نصف درجن دوسرے افسانے لکھے جو لکھنؤ کے مشہور
ناول فروش، منشی مہادیو پرشاد ورما کے اہتمام میں شائع ہوئے۔ یوں تو مرزا کی مذکورۂ بالا چاروں
تصانیف انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہیں مگر امراؤ جان ادا افسانہ کی حیثیت سے نہ صرف اردو علم ادب
میں اپنی آپ نظیر ہے بلکہ بہترین مغربی ناولوں کا ہم مرتبہ کہا جا سکتا ہے۔

علم ہیئت سے خاص شغف تھا۔ اسکے متعلق مطالعہ و تحقیقات میں مصروف رہنے کے علاوہ طرح
طرح کے آلات خود بنایا کرتے۔ الناظر میں اُن کا رسالہ رب مجیب مسلسل چھپا کرتا تھا، جو افسوس ہے کہ
ناتمام رہا۔

مرزا سوا کمال مجسم تھے۔ اکثر ارباب کمال کی طرح شہرت سے متنفر، نمود و نمائش سے بیزار۔
[illegible] تھے برسوں کالج میں پروفیسر رہے۔ عربی و فارسی کے معلم تھے مگر ریاضی، فلسفہ وغیرہ سب ہی کچھ
پڑھاتے۔ تنخواہ ناکافی نہ تھی لیکن آزادہ روی کے بدولت برابر قرضدار رہتے، بلکہ قرضخواہ کالج ہی
سے تنخواہ کا ایک معقول حصہ اڑا لیجاتے۔ سادگی و قناعت پسندی کے لحاظ سے بالکل فقیر منش تھے۔
گھر پر [illegible] بچھا ہوا، ایک پر کچھ کتابیں اور مسودات، کچھ ٹوٹے پھوٹے آلات اور کچھ متفرق اشیاء
بے ترتیبی سے رکھی ہوئی۔ مہمانوں کی نشست کے لیے میلی کچیلی کرسی، مونڈھا، بنچ یا کھری چارپائی
[illegible] مانگ رہی ہے اور حقہ نوش فرما رہے ہیں۔ تن پوشی کے لیے ایک ہلکی سی لنگی کافی ہوتی
عمر کا بہترین حصہ، مذہبی [illegible] میں گزرا۔ اور نظم و نثر میں مرزا کے جوہر نمایاں کرنے والی جتنی
چیزیں ہیں، سب اُسی زمانہ کی ہیں۔ منشی مہادیو پرشاد کا بیان تھا کہ نہایت قلیل معاوضہ میں اُن سے
[illegible] حاصل کیے گئے۔ اسکے بعد مذہبی رنگ چڑھا تو شعریت و ادبیت رخصت ہو گئی۔ کسی زمانہ میں
اشراق کے نام سے ایک فلسفیانہ رسالہ نکالا تھا۔ پھر الحکم کے نام سے ایک مذہبی اخبار نکالا۔ مگر
یہ کام مرزا کے بس کے نہ تھے۔ آخر عمر میں جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں ملازم ہو کر حیدرآباد چلے گئے
اور نسبتاً آرام سے زندگی بسر ہوئی۔ انتقال سے کچھ روز قبل رخصت لیکر وطن آئے اور یہیں کی مٹی
میں آرام فرما رہے ہیں۔

مولانا سید علی حیدر طباطبائی المتخلص بہ نظم، حیدر، لکھنؤ ہی کے متوطن تھے۔ نواب واجد علی شاہ
کے ساتھ برسوں مٹیا برج میں رہے۔ وہیں مولانا عبدالحلیم شرر کو انکی شاگردی کا افتخار حاصل ہوا تھا۔

حیدرآباد چلے گئے۔ نظام کالج میں سالہا سال تک عربی و فارسی کے پروفیسر رہے۔ آخر میں دارالترجمہ کے ناظر ادبی مقرر ہوئے اور حیدر یار جنگ کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔

مرحوم علوم مشرقی کے جید عالم اور شاعری میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ الناظر میں نظم کے علاوہ نثر کا ایک تاریخی مضمون بہت دنوں چھپتا رہا۔ اور ملک کے اکثر ممتاز رسائل میں انکے نظم و نثر مضامین برابر شایع ہوا کرتے۔ نظم و نثر کی بعض مختصر تصانیف کے علاوہ دیوان غالب کی شرح انکی بہترین ادبی یادگار ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے انکے غیر مطبوعہ دیوان کا ایک انتخاب بھی شایع کیا ہے۔

مرزا غالب کے شاعرانہ کمالات کے چنداں قائل نہ تھے، بلکہ فرماتے تھے کہ محض نواب عماد الملک (مولوی سید حسین بلگرامی) کے پاس خاطر سے اُن کی فرمایش پر یہ شرح لکھ دی گئی۔ چنانچہ شرح کے اندر بھی جابجا غالب پر اعتراضات کیے ہیں مگر حق یہ ہے کہ مولانا حالی کی یادگار غالب کے بعد حضرت نظم کی شرح دیوان غالب اگر شایع نہ ہوتی تو مرزا غالب کے کلام سے جو دلچسپی اہل ملک کو آج ہے شاید یہ بات نصیب نہ ہوتی۔ بہت سی شرحیں دیوان غالب کی موجود ہیں مگر غور سے دیکھو تو سب اسی کی خوشہ چیں ہیں۔

کئی سال ہوئے جب لکھنؤ تشریف لائے تھے اور وعدہ فرما گئے تھے کہ شرح پر نظر ثانی فرما کر ارسال فرمائیں گے۔ مگر برسوں یاددہانی کا موقع نہ ملا۔ اور جب یاددہانی کی گئی تو وہ اس مشقت کو برداشت کرنے کے قابل نہ رہے تھے، بلکہ اُسکے چند ہی روز بعد حیدرآباد سے انتقال کی خبر آئی۔
عمر خاصی طویل پائی اور انتقال کے کچھ دنوں پیشتر تک برابر علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔

الناظر کے قدردانوں کی خدمت میں رسالہ کے پھر جاری ہونے کی جو اطلاع بھیجی گئی تھی اُس میں ۱۵ رجولائی کو اس پرچہ کی اشاعت کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن چونکہ نیا ڈیکلریشن داخل ہونے اور پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر سے رجسٹری نمبر حاصل کرنے میں آٹھ دس روز سے کم نہ لگیں گے اس لیے اُمید نہیں کہ ۲۵ رجولائی سے قبل یہ رسالہ روانہ ہو سکے۔ انشاءاللہ آیندہ کوشش رہیگی کہ ٹھیک ۱۵ تاریخ پرچہ شایع ہو جایا کرے۔
جن اصحاب کو کسی ماہ کا پرچہ اُسی مہینہ کے اندر نہ پہنچے، وہ دوسرے مہینہ کے شروع میں تلف شدہ پرچہ کے بجاے دوسرا پرچہ طلب فرمالیں۔

ظفر الملک

اسرائیلیات

(جناب الحاج منشی امیر احمد صاحب علوی)

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

ارضِ کنعان کا ایک جوان صالح اپنے برگزیدہ باپ کے حکم سے عراق کی طرف راہی ہوا کہ اپنے ماموں سے جو شہر حران کا ایک دولتمند باشندہ تھا، اس کی بیٹی کی خواستگاری کرے۔ وطنِ مالوف (بیر شیبہ) سے حران تک سترہ دن کا راستہ تھا۔ بے آب و گیاہ کوہستان اور خطرناک وادیاں حائل تھیں۔ صحرائی جانوروں سے زیادہ اپنے توام بھائی کا خوف تھا جس سے قدیم دشمنی تھی۔ شفیق باپ نے زادِ سفر، تحائف و ہدایا کے لیے زرو جواہر کا انبار ساتھ کیا تھا اور اس کی حفاظت کی فکر سمندِ ناز پر تازیانہ تھی۔

بستی سے کچھ ہی دور نکلا تھا کہ بے رحم بھتیجے نے راستہ روکا، اور جس قدر مال و متاع ساتھ تھا، لوٹ لیا۔ نہ ہاتھ میں کوڑی رہی نہ تن پر کپڑا۔ آگے بڑھے تو مال نہیں، مال نہیں اور پیچھے پھرے تو والد ماجد کو منہ دکھانے کی مجال نہیں!!

بیکسوں کے مددگار سے فریاد کی اور چشمِ نم آسمان کی طرف رخ کیا۔ دیکھا کہ بارہ روشن ستارے فلکِ اخضر پر درخشاں ہیں۔ دن کے وقت سورج کی تیز روشنی میں ستاروں کا نور دیکھ کر حیرت و استعجاب کے بادل چھا گئے!! آنکھ نیچی کی تو پہچانا کہ وطن سے بہت دور موریہ کے کوہستان میں استادہ ہے اور دو دن کی مسافت چند لمحوں میں تمام ہو گئی ہے۔ اس طی الارض کی کھلی ہوئی کرامت نے حیران و مدہوش کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے آفتاب غروب ہو گیا۔ ہر طرف تاریکی چھا گئی اور اسی کوہستان کے ایک گوشہ میں رات بسر کرنا لازم ہوا۔

پہاڑ پر سنگریزوں کی افراط تھی۔ درندوں سے حفاظت کے لیے اپنے اردگرد بارہ پتھر لگانے اور ایک پتھر پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ آنکھ بند ہوتے ہی قدرتِ ایزدی کا تماشا نظر آیا۔ دیکھا کہ ایک عظیم الشان سیڑھی زمین سے فلکِ ہفتم تک لگی ہے اور عجیب الخلقت فرشتے اس راستے سے زمین پر اترتے اور پھر آسمان پر چڑھتے ہیں۔ بعض ملائک نے اس نووارد مسافر

الف نمبر

اسرائیلیات

ے تنزول اجلال کی ملاء اعلیٰ میں خبر پہونچائی ۔ بابل کا بادشاہ آیا اور اس سیڑھی کے ستر ڈنڈوں تک چڑھ کر
نیچے اترا ۔ تو ہمدان کا تاجدار آیا اور باون ڈنڈوں تک چڑھ کر لوٹا ۔ یونان کا شہزادہ آیا اور ایک سو تین
زینے طے کر کے نیچے گرا ۔ بعد ازاں ادوم کا حاکم آیا اور بڑبڑاتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا اس نے
بادلوں تک پہونچنے اور آسمان پر حکومت کرنے کا عزم کیا ۔
اسی لمحہ خداوند کے جلال نے اس تماشائی کو گھیر لیا ۔ آسمانوں کے دروازے کھل گئے زمین کے
طبق روشن ہوگئے اور بانگ جرس نے صدا دی "ادوم کے حاکم سے خوف نہ کر ۔ یہ مبارک زمین
جس پر تو استراحت کر رہا ہے تیرے فرزندوں کی میراث ہے ۔ اور تیری نسل ریت کے ذروں کی طرح
منتشر ہوگی ۔ یکایک فلسطین کی تمام زمین گویا لپیٹ کر سونے والے کے ہاتھ میں آگئی اور
بشارت دی گئی کہ اس کے فرزند اس خطۂ ارض پر تصرف کریں گے ۔
اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز جلوے نظر آنے لگے ۔ گویا کہ کوہ سینا تجلی حق سے منور ہے اور
ایک مقبول بندہ آسمانی آواز سے احکام و قوانین کی تعلیم پا رہا ہے ۔ دفعتہً سین بدل گیا ایک
عالی منزلت عبادت گاہ تعمیر ہو رہی ہے اور خدا کی بندگی کا حق ادا کرنے والے دودھ اور شہد کی نہروں میں
غسل کر رہے ہیں ۔ ایک لمحہ میں یہ تماشہ بھی غائب ہوا یروشلیم کا خوبصورت شہر جل رہا ہے اور عبادتگاہ
کا سارا مال و اسباب لوٹا جا رہا ہے ۔ یہ منظر بھی روپوش ہوا ۔ دنیا کے ہر گوشہ سے غلام آزاد ہو کر آئے
اور عبادت گاہ کی دوبارہ تعمیر ہونے لگی !!
گھبرا کر آنکھ کھول دی رات ختم ہو چکی تھی اور صبح کا سپیدہ پھیل گیا تھا ۔ عنایت و نوازش خداوندی
کا شکریہ ادا کیا اور نور قلبی سے دریافت کر لیا کہ وہ عالی منزلت عبادت خانہ جس کی شکل مثالی عالم رؤیا
میں دکھائی گئی تھی اسی مقدس زمین پر تعمیر ہونے والا ہے جہاں پر محیر العقول مناظر قدرت دکھائے گئے تھے
ارادہ کیا کہ اس متبرک مقام پر ایک نشان قائم کرے ۔ بارہ پتھر جو رات کو اپنے ارد گرد لگائے تھے حکم
خداوندی سے باہم وصل ہو کر ایک سنگِ گراں بن گئے ۔ اسی پتھر کو زمین میں گاڑا اور آنے والی نسلوں
کی عظمت و شان کا سنگ بنیاد ارض موعود پر نصب کیا ۔
یہ کرامات و بشارت سے سرفرازی پانے والے اسرائیلیوں کے جد اعلیٰ حضرت یعقوب بن اسحق
بن ابراہیم علیہ السلام تھے ۔ جنکی اولاد "بنی اسرائیل" کے نام سے دنیا میں مشہور ہوئی اور اس عجیب و غریب
خواب کی تعبیر سونے کے پتر پر خون کے حرفوں سے تاریخ یہود میں لکھی ہوئی ہے !!
اس قوم کے عروج و زوال کی داستان نہایت سبق آموز اور عبرت خیز ہے ۔ کبھی وہ عظمت و شوکت

تھی کہ ان کے عبادت خانہ کی تعمیر کے لیے اقصائے عالم سے گراں ترین اجناس کا خراج وصول کیا گیا۔ زمین نے لعل و یاقوت اگلے اور سمندر نے موتیوں کا مینہ برسایا۔ اور کبھی وہ ذلت و مسکنت تھی کہ گھر بار، مال متاع لٹا۔ آنکھوں کے سامنے مقدس معبد میں آگ لگائی گئی اور ایک عالم جابجا جلاوطنی کا فرمان صادر کیا۔

ایک دن وہ عزت افزائی تھی کہ طیور و وحوش، چرند و پرند ان کے لیے مسخر کیے گئے، دریائے نیل شق ہو کر بخیریت دشمنوں کے ہاتھ سے نکل جائیں، پتھر نے کلیجہ چاک کیا کہ ان کو رفع تشنگی کے لیے پانی میسر آئے آسمان سے من و سلویٰ اترا کہ ان کو بے زحمت غذا نصیب ہو اور ایک روز وہ فضیحت و رسوائی ہوئی کہ غیر نسل عورتوں کی لاشوں سے کنوئیں پٹ گئے۔ معصوم بچوں اور معذور بوڑھوں کے خون سے ندیاں بہیں۔ اور طیش جوان، جفا پیشہ دشمنوں کی غلامی میں گرفتار سب کچھ دیکھتے تھے مگر آہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔

نہ رہی کیا تھا حفاے باغباں کیا کیجے
آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں کیا کیجے

کبھی ان کے حال پر یہ مہربانی تھی کہ احسان کرنے والوں کا رب الارباب جو احسان کر کے احسان میں جتاتا، یاد دلاتا ہے کہ "یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم وانی فضلتکم علی العالمین" اور کبھی یہ عتاب تھا کہ ساری قوم کی پیشانی پر "ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ" کا داغ لگا دیا گیا۔ اس عزت، ذلت، شفقت و عتاب کی مبسوط و مستند تاریخ عہد نامہ عتیق ہے جس میں فی زمانا ۳۹ کتابیں شامل ہیں

ابتدائی پانچ کتابیں (۱) پیدائش (۲) خروج (۳) احبار (۴) شمار اور (۵) استثنا، توریت کہلاتی ہیں اور حضرت موسیٰ کی طرف منسوب ہیں۔ چھٹی کتاب حضرت موسیٰ کے خلیفہ یوشع بن نون کے فتوحات کی داستان ہے۔ ساتویں کتاب "قضاۃ" اور نویں دسویں "سموئیل (۱) اور سموئیل (۲)" بنی اسرائیل کے تسخیر ممالک اور اشاعت تہذیب و تمدن کا شاہنامہ ہیں۔ گیارہویں اور بارہویں میں "سلاطین" کا احوال ہے۔ اور تیرہویں چودھویں کا نام ہی "تواریخ" ہے۔ پندرہویں نمبر پر "عزرا" اور ستائیسویں پر دانیال کی تالیفات فرزندان یعقوب کے عہد مصیبت کی یادگار ہیں (۲۳) اشعیا (۲۴) ارمیا اور (۲۶) حزقیل یہودیوں کی بداعمالی کی تفصیلات سے لبریز ہیں۔ بقیہ کتابیں انبیاء بنی اسرائیل کے صحائف ہیں جن کو بائبل کے جمع کرنے والوں نے قابل استناد سمجھا اور کتاب مقدس میں شامل کیا۔

بیسویں صدی کے موشگاف مورخوں کی نظر میں اس مجموعہ کی جو وقعت ہے اسکی توضیح کا یہ موقع نہیں، لیکن پابند مذہب یہود و نصاریٰ مجبور ہیں کہ اس ذخیرہ کی ہر روایت کو معتبر سمجھیں اور مستند مانیں۔ ان مسلم الثبوت کتابوں کے علاوہ صحفِ انبیاء کا ایک بہت بڑا ذخیرہ علمائے یہود کے پاس تھا جس کے بعض اجزاء مثلاً صحیفۂ ابراہیم یا کتاب ادریس وغیرہ ہنوز یورپ میں رائج ہیں مگر مسیحی محققین انکو "الہامی" نہیں مانتے، اور صحفِ آسمانی میں شامل نہیں کرتے ہیں۔

عہد نامۂ عتیق سے دوسرے درجہ پر "تالمود" ہے۔ جس کی یہودیوں کی نظر میں وہی عزت ہے جو مسلمانوں کی نگاہ میں کتبِ احادیث کی۔ اس ضخیم تالیف میں علما اور احبار کے کاشفات اور انبیاء سابقین کے وہ قصص و حکایات ہیں جو متداولہ صحفِ مقدس میں پائے نہیں جاتے۔ یہ کتاب عبرانی زبان میں ۶ جلدوں اور ۱۲ حصوں پر منقسم ہے اور اس کا معتبر ایڈیشن سنہ ۱۵۲۰ء میں بمقام وینس (Venice) شایع ہوا تھا۔ اس کتاب میں علاوہ مسائل فقہ اور تعلیم شریعت کے توریت و زبور وغیرہ کتب آسمانی کے بعض آیات و اسفار کی تشریح و تفصیل بھی ہے اور یہی مجموعہ دراصل ماخذ ہے اُن بیشمار حکایتوں کا جو عرب کے مفسروں نے قرآن شریف کی تفسیر پر شامل کر کے ممالک اسلامی میں رائج کر دیں اور علماء تفسیر کی اصطلاح میں انکو اسرائیلیات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس مشہور "تالمود" کے علاوہ ایک مختصر کتاب "تالمود یروشلمی" کے نام سے بھی عبرانی زبان میں دستیاب ہوئی ہے اور سنہ [illegible]ء میں اُس کا ترجمہ پیرس میں شایع کیا گیا ہے۔

گمان کیا جاتا ہے کہ "تالمود" کے بہت سے اجزاء ہنوز غائب ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی "تالمود عربی" بھی ہو جو حجاز کے یہودیوں کے ساتھ فنا ہو گئی اور اب اس کا پردۂ عالم پر کہیں وجود نہیں ہے لیکن سیکڑوں گراں قدر تصنیفات و تالیفات علماء یہود کی عبرانی زبان میں موجود ہیں جن سے بنی اسرائیل کی قدیم معاشرت دریافت ہو سکتی ہے اور انکے ترقی و تنزل کے حالات و اسباب معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

فلیویس جوزیفس نام ایک یہودی جو سنہ ۳۷ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۹۵ء میں مرا، یروشلم کی آخری تباہی کے وقت میدان جنگ میں موجود تھا اور سنہ [illegible]ء کے خونی مناظر کی دردناک تصویر پیش کرنے کے لیے اُس نے یونانی زبان میں بنی اسرائیل کی ایک مبسوط تاریخ لکھی جس کا یورپ کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہوا اور آج تاریخ یہود کے طالب علم کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ان تمام بیش بہا ماخذوں سے مستفید ہو کر انجلو ریپوپورٹ نے ایک کتاب "مذہبی قصص و افسانہائے بنی اسرائیل" کے نام سے تالیف کی اور گریشم کمپنی لندن نے سنہ ۱۹[illegible]ء میں اس قاموس حکایات کو تین جلدوں میں

شایع کیا۔
جوزیفس کی کتاب تو تاریخ ہے اور یہ مجموعہ جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہے افسانہ ہے اگر ان دونوں کتابوں کو پیش نظر رکھ کر اسرائیلیوں کے عروج و زوال کی داستان بیان کی جائے تو وہ یقیناً بہت دلچسپ ہو سکتی ہے یروشلم کی تباہی اور فرزندان یعقوب کی غلامی کی تاریخ انشاء اللہ تفصیل سے بیان کی جائیگی لیکن فی الحال اُنکے عہد عروج کے چند افسانے یہ ذخیرہ ریوبوٹ کی کتاب سے اخذ کرکے اپنے ہم وطنوں کو سنانا منظور ہے۔ بادشاہ کا خواب ناظرین نے ملاحظہ کیا۔ تعبیر شروع ہونے کیلیے "الناظر" کے دوسرے پرچے کا انتظار کیجیے۔

غیر مطبوعہ رباعیاتِ امیر مینائی

(مرسلۂ جناب اسمٰعیل احمد صاحب تسلیم مینائی)

حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کے غیر مطبوعہ کلام و تصانیف کی اشاعت پر اب تک اُنکے اہل خاندان کو پوری توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا مگر اب اُنکے پوتے برادرم اسمٰعیل احمد صاحب تسلیم نے جو ایک روشن خیال نوجوان ہیں اس فریضہ کی ادائی کا تہیہ کیا ہے اور امید کرنا چاہیے کہ رفتہ رفتہ سب کتابیں شایع ہو کر ارباب ذوق کے کتبخانوں کی زینت افزائی کا موجب ہونگی سردست عزیز موصوف کی مرسلہ چند غیر مطبوعہ رباعیاں تبرکاً یہاں درج کی جاتی ہیں۔ — اڈیٹر

معدوم اگر یہ شکل امکاں ہو جائے — آئینۂ رو سے وصل ہجراں ہو جائے
دیکھا تو فقط ہے نفیِ عاشق معشوق — داخل ہو جو تا جاں میں تو جاناں ہو جائے

[illegible] محتسب کو سمجھائے کوئی — اتنا بھی نہ جامے سے نکل جائے کوئی
میں بادہ پیوں شیشہ و ساغر ٹوٹیں — تقصیر کسی کی ہو سزا پائے کوئی

یاں حالتِ دل ہجر میں کیا کیا نہ ہوئی — افسوس خبر یار کو اصلاً نہ ہوئی
اس شمع سے لو ہم نے لگائی ناحق — پروانہ ہوا دل اُسے پروا نہ ہوئی

(از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا)

آپ کا اصلی نام احمد حسین تھا مگر امیر اللہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ تسلیم تخلص کرتے تھے۔ مولوی عبدالصمد انصاری کے بیٹے تھے۔ نواحِ فیض آباد میں ایک گاؤں ہے جس کا نام منگلسی ہے۔ وہاں ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ والد لکھنؤ میں ملازم تھے اس لیے آپ کا نشوونما بھی وہیں ہوا۔ اپنے باپ اور مولوی عبداللطیف سے فارسی عربی کی کتابیں پڑھیں اور خطاطی میں کمال پیدا کیا۔

آپ کو شعر و سخن سے مناسبت خداداد تھی۔ جب مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی لکھنؤ چلے گئے تو آپ نے ان سے مشقِ سخن کرنے کے بعد اپنی راہ ہر ڈھنگ سے الگ نکالی۔

آپ کے والد محمد علی شاہ کے زمانہ میں اس عہدہ پر پلٹن میں ملازم تھے۔ وہ کبرسنی کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہے تو آپ اپنے باپ کی جگہ مقرر کیے گئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد تخفیف میں آ گئے۔ آپ نے واجد علی شاہ کو ایک منظوم عرضداشت دی جس پر بادشاہ نے حسبِ ذیل حکم تحریر لکھوایا

بشنو اے خوشنویس و اے خوشگو — ہر دو فن میں ملک و ہر دو نکو
اسم تو سند رج بہ دفتر شد — بیست [illegible] روپیہ مقرر شد

۱۸۵۶ء میں جب اودھ کی سلطنت کا الحاق برطانوی ہند کے ساتھ ہو گیا اور واجد علی شاہ کو معزول کر دیا گیا تو آپ رامپور چلے گئے۔ وہاں نواب کلب علی خاں کی بدولت چندے آرام سے گزری۔ آپ کو تیس روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ عید بقرعید کے موقع پر قصائد پیش کرنے کے صلے میں دو سو روپیہ ملتا تھا۔ اسکے علاوہ بھی نواب صاحب آپ کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرتے رہتے تھے۔

آپ نے چورانوے برس کی عمر میں ۱۳۲۹ ہجری میں وفات پائی۔

آپ نے غدر سے پہلے ایک دیوان مرتب کیا تھا لیکن وہ اس ہنگامہ میں ضائع ہو گیا۔ اسکے بعد آپ نے نظمِ ارجمند کے نام سے ایک دیوان شائع کیا جس میں چند قصیدے اور دو مثنویاں ہیں۔ رامپور میں آپ نے نظمِ دل افروز کے نام سے ایک اور دیوان چھاپا جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔ چوتھا دیوان دفترِ خیال کے نام سے شائع ہوا۔ پانچواں دیوان ترتیب نہیں پا سکا لیکن سنا ہے کہ آپ کے شاگردانِ رامپور کے پاس ہے۔

آپ کی مثنویات "نالۂ تسلیم، شام غریباں، صبح خنداں، دل و جاں، نغمۂ بلبل، شوکتِ شاہجہانی، گوہرِ انتخاب"، اور تاریخ بہار یعنی تاریخ رامپور جو وقتاً فوقتاً لکھی گئیں، کافی مشہور ہیں۔ سفرنامہ نواب رامپور جس میں چھبیس ہزار سے کم اشعار نہ ہونگے، رامپور کے سرکاری کتب خانہ میں قلمی موجود ہے۔

کلام پر تبصرہ

تسلیم کی غزلیں اپنے زمانہ کے لحاظ سے خوب ہیں۔ جس طرح آپکے ہمعصر شعراء غزل گوئی کے مرد میدان تھے آپ بھی اس فن میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ متوسطین نے جو خیالات اور مضامین غزل کے مقرر کر دیے تھے انھیں پر آپ کاربند رہے کسی قسم کی جدت نہیں پائی جاتی البتہ اہل لکھنؤ سے آپ کی راہ الگ ہے۔ چوٹی کنگھی کے مضامین اگرچہ آپ کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں لیکن خال خال ہیں۔ رعایت لفظی بھی ہے لیکن کم۔ تشبیہات و استعارات بھی ہیں مگر اعتدال کے ساتھ۔ مومن خاں اور انکے سلسلہ میں فارسی تراکیب کو برجستگی کے ساتھ ادا کرنے کی ایک صفت خاص ہے۔ چنانچہ آپ میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے اور آپ کی غزلوں میں فارسی تراکیب کی چاشنی خوب مزہ دیتی ہے۔

آپ کے کلام میں قصائد اور مثنویات بھی داخل ہیں۔ اول الذکر معمولی ہیں اور آخر الذکر قابل تعریف ہیں۔ مثنویات میں پختگی اور شستگی دونوں موجود ہیں۔ قطعات اور تاریخیں بھی دلچسپ ہیں۔ آپ کا دیوان جو نظم دل افروز کے نام سے موسوم ہے صرف غزل کے سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ مخمسات، قطعات، اور رباعیات علیحدہ ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے میر تقی میر سے کچھ کم شعر نہیں کہے۔ پرگوئی کے عیوب میں کلام کا رطب و یابس سے پر ہونا داخل ہے۔ چنانچہ آپ کے یہاں بھی بھرتی کے اشعار بکثرت ہیں۔ بہت کم اشعار خوب طبع کیے جا سکتے ہیں لیکن شستگی اور تراکیب کی برجستگی بھرتی کے اشعار کو زیادہ بدنما یا ناگوارِ طبع نہیں ہونے دیتی۔

غزل کے جو چند مضامین ہیں وہی آپ کی جولاں گاہ ہیں۔ الفاظ مختلف ہیں لیکن ہیر پھیر کر وہی بات کہتے چلے جاتے ہیں۔ چونکہ غزل میں خیالات اور مضامین ایک ہی قسم کے ہیں اسلیے صرف یہی نہیں کہ ایک مضمون کئی کئی مرتبہ خود اپنے یہاں بندھ جاتا ہے بلکہ دوسرے شعراء کے مضامین بھی نادانستہ طور پر بندھ جاتے ہیں۔ اسکو آپ توارد کہیں یا جو چاہے کہیں لیکن اس قسم کی مثالیں کلام تسلیم میں موجود ہیں۔

غالب کا شعر ہے:-

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

۱۹۔ دی ہیں جگہ دو گز بھی زمیں بہر مزار — ہیں ترا حوصلہ اسے وسعت صحرا دیکھا

۲۰۔ سننے سننے وہ حال دل بولے — یہ تو قصہ ہوا گلا نہ ہوا

۲۱۔ چپ دیکھ کے سب کہتے ہیں کچھ کہیے تو آخر — وہ کونسا غم ہے جو بیاں ہو نہیں سکتا

۲۲۔ گردش بخت کہاں ایسی میسر ان کو — ساتھ کیا دیں گے بگولے ترے آوارہ کا

۲۳۔ وہی ہے فرق رسم محبت میں دل لگی — چھیڑا صبا نے پیار سے غنچہ چٹک گیا

۲۴۔ اپنے بڑھ کے غیر کو پایا شریک درد — پھاہا ہمارے زخم جگر سے چپک گیا

۲۵۔ ایک گل میں بھی نہ پائی آج تک بوئے وفا — کچھ عجب عالم ہے اے دل گلشن ایجاد کا

۲۶۔ برابر صانع قدرت کو بہت نسبت عالم ہے — نہ تھا دہی کچھ بنانے کو نہ کوئی غم مٹانے کا

۲۷۔ کہ گئی کچھ تو حیا آ کے مری جانب سے — ورنہ یوں تجھ سے ترا آنکھ چرانا کیسا؟

۲۸۔ ہر شب اگر یہی ہے بیان جگر کی — اک روز ہجر ہی میں اپنا وصال ہوگا

۲۹۔ اس کے ناز مجھے روز اٹھانے پڑتے — شکر ہے زخم جگر قابل درماں نہ ہوا

۳۰۔ اب وہ ہیں بھر ساقی شراب اب میں کیا — ہجوم مستی غفلت ہے کم شباب میں کیا

۳۱۔ سمجھے تھے مر کے ہستی عدم سے ملی نجات — واعظ نے اور حشر کا جھگڑا لگا دیا

۳۲۔ اللہ ری انتہائے تمنائے وصل دوست — دشمن بھی آ گیا تو گلے سے لگا لیا

۳۳۔ ایک تیرے سوا مرا ظالم — نہ کوئی دوست تھا نہ دشمن تھا

۳۴۔ اپنے بیگانے ہو گئے شاید — دشمنی نام ہے محبت کا

۳۵۔ موت آتی جو ترپ وصل تو اچھا ہوتا — آج منہ روز جدائی کا نہ دیکھا ہوتا

۳۶۔ بھول کر بھی کبھی حال دل شیدا نہ سنا — تم سا بے رحم زمانے میں نہ دیکھا نہ سنا

۳۷۔ پستی و بلندی دہر کا کھٹکا کہاں گیا — غارت ہوئی زمیں نہ کہیں آسماں گیا

۳۸۔ آپ سے جاتا رہا بھر کر ہوا میں کیا حباب — ایک دم کی زندگی پر کس قدر پھولا حباب

۳۹۔ نیرنگ ہے جہاں رنگ بدلتا ہے شب و روز — دنیا میں کبھی چاندنی ہوتی ہے کبھی دھوپ

۴۰۔ نہ لوں گا بھول کے بھی نام روز محشر تک — کبھی تو مرنے کی دے گی نہ زندگی فرصت

۴۱۔ آنکھوں میں نیند ہے نہ ہے دل کو قرار آج — کیسی یہ رات ہے مرے پروردگار آج

۴۲۔ اب کیا مگر جنوں کے زمانہ سے پیشتر — ہم بھی تھے آدمی کبھی ناصح تری طرح

۴۳۔ تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے — اٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر

۶۹۔ گل ہوں تو جگر چاک ہوں، ہوں تو پریشاں ہر رنگ میں اک آفتِ غم دل سے لگی ہے

۷۰۔ قیامت ہے قفس میں کھل کر بازو کو دبانا بلا سے صبر آ جاتا اگر بے بال و پر ہوتے

۷۱۔ فضا آزاد، روشن کر دو، وہ دیتے ہیں فغونگی خدا معلوم کیا ہوتا جو نالے بے اثر ہوتے

۷۲۔ نہ شامیانہ، نہ شمع تربت، نہ موج سبزہ، نہ چادرِ گل
بلا نصیبوں میں بیکسی کے کیا کیا خراب مٹی ہے بیکسی کی

"آزادی"

دھانوں کے انبار کے قریب ایک مصیبت زدہ غلام لیٹا ہوا تھا۔ بیسیا اسکے ہاتھ میں، سینہ عریاں، گھونگھر والے بال ریت میں دبے ہوئے۔ ہنسی زمین کے منہ سے رہا تھا کہ عالم خواب میں اُسے وطن نظر آیا۔ دریائے نیل اسی آب و تاب سے کھجوروں کے سایہ میں سطح میدان پر بہہ رہا ہے اور وہ خود شاہی کر و فر سے ایک گھوڑے پر جا رہا ہے۔ پہاڑ سے اترتے ہوئے کاروان کی گھنٹیوں کی آواز اُسے سنائی دے رہی ہے۔ اسکی آہو چشم ملکہ اپنے جھونپڑے کے دربان کھڑی ہے اور بچے اس سے لپٹ رہے اور پیار کر رہے ہیں۔

ایک آنسو سونے والے کی آنکھ سے نکل کر
ریت پر گر پڑا اور خشک ہو گیا

پھر دیکھا اپنے گھوڑے کو دریائے نیل کے کنارے پوری تیزی سے بھگا رہا ہے۔ گھوڑے کی لگام کے بجائے ذہن سونے کی زنجیر ہے اور ہر قدم پر گھوڑے کے پٹھے پر پانی کا لگنا محسوس کر رہا ہے۔ اُسکے سینے پر سرخ جھنڈیاں کے مانند سرخ سرخ چڑیاں اڑ رہی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُنکا پیچھا کر رہا ہے۔ چلتے چلتے صبح سے شام ہو گئی یہاں تک کہ وہ فراعنہ کی جھونپڑیاں دکھائی دینے لگیں اور پھر سمندر کا کنارہ آ گیا۔ رات کے وقت اسے شیر کی گرج، بھیڑیے کی خوفناک آواز اور گورخر کے درختوں کے پاس سے گزرنے کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ جنگل کا ہر درخت

زوجِ عالی سے آزادی کا نعرہ لگانے لگا اور صحرا کی
وسعتیں بیدار کی اور زور سے حریت کا راگ گانے لگی کہ

سونے والا خواب سے بیدار ہو کر اس کی اس خوشی اور جوش پر مسکرایا اور پھر سو گیا .....

صبح کے وقت اُسکے جسم نے مالک کے چابک اور تیز دھوپ کو محسوس نہ کیا۔ کیونکہ موت نے عالم خواب کو روشن کر دیا تھا اور اُس کا بے جان جسد خاکی جس کو روح نے ایک ٹوٹی ہوئی بیڑی کی طرح دور پھینک دیا تھا۔ زمین پر اُسی طرح پڑا رہا۔

حبیب احمد صدیقی

"سمجھناک[1] بکری"

(از جناب اسمٰعیل احمد صاحب تسنیم بیانی)

(۱)

مس رضیہ فیضی اور نواب سعید الدین خاں کی پہلی ملاقات لندن کے ریگل (Regal) تھیٹر میں ہوئی۔ مس رضیہ اپنے چچا، چچی، اور لیڈی ہمایوں کی معیت میں یورپ کی سیر کر رہی تھیں۔ پیرس پہونچکر دفعتاً لیڈی فیضی کی طبیعت خراب ہو گئی اور سر فیضی انھیں لیکر ہندوستان واپس ہوئے۔ جاتا تو مس رضیہ کو بھی انھیں کے ہمراہ چاہیے تھا لیکن انھوں نے ابھی تک لندن نہیں دیکھا تھا اس لیے سر فیضی اُسے دو ہفتوں کے لیے اُنھیں لیڈی ہمایوں کی سپردگی میں چھوڑ گئے، جس روز یہ دونوں لندن پہنچیں ریگل میں برنارڈ شا کا ایک مشہور ڈرامہ اسٹیج پر ہو رہا تھا لیڈی ہمایوں نے بھی اپنے اور مس رضیہ کے لیے باکس ریزرو کرا لیا ——— نواب صاحب سے لیڈی ہمایوں پہلے ہی سے اچھی طرح واقف تھیں، کیونکہ سر ہمایوں اور نواب حمید الدین خاں مرحوم میں بہت گہرا دوستانہ تھا۔

" اسکی خوبصورتی اور مردانہ حسن میں تو کوئی کلام نہیں" مس رضیہ نے نواب صاحب کے باکس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" اور وہ تم سے متعارف ہونے کا خواہشمند بھی معلوم ہوتا ہے" لیڈی ہمایوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

" ذرا انکی ہسٹری تو مجھے بتائیے" مس رضیہ نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

" نواب حمید الدین خاں آف سلیم پور کا اکلوتا بیٹا، ماں اسکی افغانستان کی اعلیٰ نسب شہزادی، آکسفورڈ کا گریجویٹ، ٹینس اور کرکٹ کا ہیرو، تیرنے کا چیمپین، حسین، ذہین، مالدار، جوان، تعلیم یافتہ، اخلاق مآب مجسم، دنیا کے خوبصورت ترین مجموعۂ جواہر کا مالک، ان سب پر طرہ، بہادر، دلیر، سخت سے سخت مشکل میں نہ گھبرانے والا، بڑے سے بڑے خطرے میں حواس قائم رکھنے والا، ابھی پارسال شکار میں ایک شیر چھاپ کر بیٹھ گیا لیکن اسے ذرا ہراس نہ ہوا، رائفل خالی تھی، جیب سے گولی نکالی، رائفل کو بھرا، اور نہایت اطمینان سے شیر کے منہ میں اسکی نال رکھ کر شیر کا بھیجا اُڑا دیا"۔

" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صفات مجسم ہے، اس میں کوئی عیب نہیں، کسی قسم کی کمزوری نہیں"

" اگر کوئی عیب ہے تو یہ کہ وہ بے عیب ہے، البتہ ایک چیز ایسی ہے جسے اکثر احباب عیب سمجھتے ہیں گو میں تو اسے بھی خوبی قرار دیتی ہوں۔ جانوروں کا اسے بیحد شوق ہے۔ اسکے اصطبل میں ایک ایک اچھا گھوڑا موجود ہے۔ اسکے پرائیویٹ زو میں بہلا

[1] اس لفظ سے بھڑکنے کے بجائے سمجھدار لوگ مضمون کو آخر تک ملاحظہ فرمائیں گے۔ ایڈیٹر

انکے متعلق سُن چکے تھے اور وہ سب کا سب انکی
موافقت میں تھا۔ انھوں نے ہزار اپنے دماغ پر
زور دیا کہ کوئی پہلو اعتراض کا نکالیں لیکن ہار کر
نواب صاحب کی آمد والے دن انھوں نے لیڈی
صاحبہ سے اقرار کیا کہ "بجز جانوروں کے متعلق
اعتدال سے متجاوز شوق کے، انھوں نے تعریف
کے سوا نواب صاحب کی کوئی برائی نہیں سنی تھی"

"لیکن یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسکی بنا پر
اس رشتہ سے انکار کیا جائے" لیڈی نعیمی نے
ذرا جلدی سے کہا

"ہرگز نہیں، میں تمھارے خیال سے
بالکل متفق ہوں، ایسے رشتے کہیں روز روز
تھوڑی ہاتھ آتے ہیں" سر نعیمی نے جواب دیا

"علاوہ بریں رضیہ کو خود جانوروں سے
خاص دلچسپی ہے" لیڈی نعیمی نے دوبارہ کہا

"ہاں یہ بھی صحیح ہے، لیکن ایک بات تو
سنو، سنا ہے کہ نواب جب کہیں باہر نکلتے ہیں تو
انکے ہمراہ ایک نہ ایک جانور ضرور ہوتا ہے
علیٰ ہذا القیاس آج بھی وہ کسی نہ کسی چوپائے کو
اپنے ساتھ لائیں گے۔ اب مشکل یہ ہے کہ اگر اسکو
ڈرائنگ روم کے باہر روک دیا گیا تو ممکن ہے
کہ نواب کو ملال ہو، اور اگر اسکو ڈرائنگ روم
میں آنے دیا گیا تو وہ ڈرائنگ روم کو صاف کر دیگا"

"نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، اول تو
غالب گمان یہ ہے کہ انکے ہمراہ کُتا ہی ہوگا، اور
اگر ایسا نہ بھی ہوا اور کتے کے علاوہ کوئی اور جانور
ہوا، تو بھی یہ بہت برا ہوگا کہ اسکو باہر روک دیا جائے
اور نواب سے کہا جائے کہ وہ تنہا ڈرائنگ روم
میں جائیں۔ کمرہ خراب ہو جائے تو بلا سے، یہی
تو دیکھنا چاہیے کہ رشتہ کتنا عمدہ ہے اور اس پر
کتنی باتوں کا دارومدار
ہے" لیڈی نعیمی نے رُک رُک کر کہا

"ہاں ہاں، تمھارا یہ کہنا بالکل درست ہے
اور مجھے تم سے قطعاً اتفاق ہے، میرا بھی یہ مطلب
نہ تھا کہ انکے ہمراہ جو جانور آئیگا اُسے ڈرائنگ روم
میں داخل ہونے پر مجھے پس و پیش ہوگا۔ میں نے
تو صرف ایک بات کہی تھی، وہ اگر کتا نہیں، جنگلی
سور، یا لنگور لے آئیں، تو بھی مجھے کوئی اعتراض
نہ ہوگا" سر نعیمی نے جواب دیا

"کیا اُنکے زو میں لنگور اور سُور بھی ہیں؟" لیڈی
نعیمی نے پوچھا

"میں نے سنا تو یہی ہے کہ اُنکے پاس دُنیا
کے سب جانور ہیں"

"اگر وہ اپنے ہمراہ کوئی لنگور، یا بندر وغیرہ لائے
تو وہ واقعی کمرے کی تمام چیزیں توڑ ڈالیگا"

"اُنہ، کچھ پروا نہیں، وہ اگر چاہیں تو اپنے
ہمراہ دریائی گھوڑا لائیں، میں عبداللہ سے کہے دیتا
ہوں کہ نواب صاحب کے ساتھ قطب شمالی کا ریچھ
یا سیام کا ہاتھی بھی ہو تو بھی اُسے ڈرائنگ روم
میں آنے دے، وہ اپنا تمام زو لیکر یہاں آجائیں تو بھی

سے مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مطلق اعتراض نہیں"
اس گفتگو کے کچھ دیر بعد سرفیمنی نے عبداللہ کو بلا کر کہا

"دیکھو عبداللہ، آج سہ پہر کو نواب سعید الدین خان آف اسلم پور مجھ سے ملنے آنے والے ہیں"
"بہت خوب صاحب" عبداللہ نے متانت سے جواب دیا

"اگر اس وقت ہر چیز قرینے سے لگی ہوئی تو وہ کوئی اخبارات میں "ٹیلر اینڈ سنز" کا اشتہار ہوگا اور اگر اس مردود قاسم نے آج کہیں چائے کی کشتی پھینکی، تو میں اپنے ہاتھ سے اسکا گلا گھونٹ دوں گا سمجھے"

"میں ہر چیز کا خود انتظام کروں گا، حضور"
"ہاں۔ اور ایک بات اور مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ نواب صاحب جانوروں کے بڑے شوقین ہیں"

"جی" عبداللہ نے دل ہی دل میں تعجب کرتے ہوئے جواب دیا

"اور میں نے سنا ہے کہ جب وہ باہر نکلتے ہیں تو ہمیشہ ایک جانور کو اپنے ہمراہ لیکر نکلتے ہیں اس لیے اگر انکے ہمراہ بنگال کا شیر یا افریقہ کا گینڈا بھی ہو تو اسے ڈرائنگ روم میں آنے دینا"

"حضور، میں یہ کس طرح پہچانوں گا کہ وہ بنگال کا شیر ہے یا افریقہ کا گینڈا، یا کوئی اور جانور"

"اب، انکے سینگ دیکھکر پہچانیے لیکن شیر یا گینڈا کہنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ دنیا کا کوئی جانور جو انکے ساتھ ہو، ریچھ، بندر، ہرن، بکری، تیندوا۔ غرض کوئی جانور بھی ہو، سمجھ گئے تم، خوب کان کھول کر سن لو"

"جی حضور، اچھی طرح سمجھ گیا" عبداللہ نے جواب دیا، جو اب تک یہ بھی سوچ رہا تھا کہ نواب صاحب اگر گائے بھی لائیں تو اسے بھی ڈرائنگ روم میں جانے دیگا۔ "میں انکے سینگ دیکھ کر پہچانتا ہوں" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ بعض بعض وقت صاحب کو کوئی نہیں سمجھ سکتا شہر بھر میں ان سے زیادہ وحشی شاید ہی کوئی نکلے۔

(۳)

پونے چار کا وقت تھا جب نواب صاحب کی موٹر، جسے وہ خود چلا رہے تھے "دلا فیض" کے پورچ میں آکر ٹھہری۔ کبھی کبھی دنیا میں ایسے اتفاقات پیش آجاتے ہیں جنکی توجیہ و توضیح نہ منطقی کر سکتا ہے نہ فلسفی۔ نواب صاحب کی موٹر رکتے وقت بھی اسی قسم کا ایک اتفاق پیش آیا۔ ایک خوبصورت، ننھی سی بکری، جسے سرفینی کے ہمسایہ نے اسی روز خریدا تھا، رسی تڑا کر سرفینی کے باغ میں آگئی تھی، اور باغ کے خوبصورت پودوں اور پھولوں سے اپنا پیٹ بھر چکنے کے بعد اسکی متلاشی تھی کہ اب "پہنچنے کی جگہ" کو (جو اس جانور کی طبیعت کا جزو لاینفک ہوتی ہے) پھلانگے۔ گھر کی پلی ہوئی بکری تھی اور انسانوں سے مانوس،

ممکن ہے نواب صاحب کے "شوقِ حیوانات" کا علم بھی اُسے کسی طرح ہو گیا ہو۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ جونہی نواب صاحب موٹر روک کر اترے وہ ۔۔۔ ڈرائیور کے ہمراہ آگئی اور "میم صاحب" کرتی اُنکے ہمراہ "پورچ" کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی ٹھیک اسی موقعہ پر میاں عبداللہ نمودار ہوئے اور نواب صاحب مع بکری کے "داخل ڈرائنگ روم تھے۔ میاں عبداللہ کے قلب پر بھی ایک بار عظیم ہٹ گیا کہ نواب صاحب کے ہمراہ بجائے کسی خطرناک یا عجیب جانور کے جسکی شناخت کے لیے اُسے اُنکے سینگ دیکھنا پڑتے، محض ایک سیدھی سادی آقائے اُزرون بکری تھی، جو اُسی کے ہمراہ خود ڈرائنگ روم میں جا پہنچی ڈرائنگ روم میں سر فیضی اکیلے تھے جب "یہ عجیب جوڑا" اس طرح داخل ہوا کہ نواب صاحب کا ایک ہاتھ بکری کی گردن پر تھا۔ لیڈی فیضی نے یہ سوچ کر کہ کچھ دیر مردوں کا تنہا رہنا زیادہ مناسب ہے اپنی اور رضیہ کی نشست اندر کے ہال میں رکھی تھی۔

"مجھے آپ سے مل کر از حد خوشی ہوئی" سر فیضی نے تبسم کرتے ہوئے کہا۔ اور چونکہ میری بھتیجی اس وقت یہاں نہیں ہے اسلیے مجھے اجازت دیجیے کہ اپنا تعارف آپ کراؤں، میرا نام ہے فیضی، سر اختر فیضی"۔

سر فیضی سے ملاقات کرتے ہی نواب صاحب کو اسکا کامل اطمینان ہو گیا کہ اُن میں اور سر فیضی میں تعلقات بہت اچھے رہیں گے کیونکہ اپنے مہمان کو خوش کرنے کے لیے سر فیضی نے بکری کو تھپتھپانا شروع کر دیا تھا، اور گو وہ دل میں منتظر نواب صاحب کی پسند پر متعجب تھے لیکن اپنے حرکات سے اُنھوں نے اسکا ذرا بھی اظہار نہ ہونے دیا کہ اُنھیں کسی قسم کا استعجاب ہے اُدھر نواب صاحب پر سر فیضی کی "جانور پسند" طبیعت کا بہت اچھا اثر پڑا۔ چند منٹ کے بعد بکری نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینا شروع کیا اور میزبان و مہمان میں اسکے لاتعداد اور غیر محدود صفات پر مکالمہ ہونے لگا۔ بکری نے ایک بیش قیمت گلدستے کا کونا چبانے سے ابتدا کی اور گو دل میں سر فیضی بگڑنے والے تھے مگر اپنے مہمان کو دکھانے کے لیے وہ مسکرائے۔

"بہت اعلیٰ نسل اور شریف النفس بکری ہے"

نواب صاحب نے فرمایا

"جی ہاں، بہت خوب جانور ہے اور مجھے تو پھر بکریوں سے عشق ہے، خصوصاً اس بکری سے کیونکہ یہ بہت اعلیٰ ذات اور اچھی تربیت یافتہ ہے بہت اچھی تربیت یافتہ"۔

اس بہت اچھی تربیت یافتہ بکری نے اب ایک اور گلدستے کا مزہ نوش فرمایا۔ اور نواب صاحب سر فیضی کے بے مثل سکون کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے، کیونکہ تباذمیں تو سر فیضی بارودسے بھی زیادہ "بم نما" معلوم ہوتے تھے، اُنھیں تعجب اس پر تھا کہ رضیہ نے کیوں اُن سے اپنے چچا کے اس ذوق کا کبھی ذکر نہیں کیا

"میں نے سنا ہے کہ آپ کو جانور پالنے کا بہت شوق ہے" سر فیضی نے کہا

آنکھ، مجھے چیزوں کے ٹوٹنے پھوٹنے کی بھی تو
بھی پرواہ نہ ہوتی کیونکہ جانوروں کو اپنا دل
خوش کرتے دیکھ کر مجھے بھی مسرت ہوتی ہے اور اس
مسرت پر ہزاروں روپیہ کا فرنیچر قربان ہے جناب
نواب صاحب، میں اُن لوگوں میں نہیں جو حیوانات
کو محض ایک بے جان بے حس شے تصور کرتے
ہیں اس قسم کے آدمیوں سے میں بھی نفرت کرتا
ہوں اور گو میرے حلقۂ احباب میں چند ایسے
ضرور ہیں جو اس بکری کا گلا گھونٹ کر اسکی بریانی بنانا چاہیں
گے لیکن مجھے اُنکی اس ذہنیت کی وجہ سے اُن سے
کچھ زیادہ اُنس نہیں ہے یوں ہی اخلاقاً مل لیتا
ہوں" سر فیضی نے پیر ہلاتے ہوئے جواب دیا
"حقیقت تو یہ ہے سر فیضی کہ انسان بھی بڑی
ہی ظالم مخلوق ہے" ــــــ میں نے اتنی
خوبصورتی سے جست کرنیوالی بکری کم دیکھی ہے
ــــــ پردہ چبانے پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں"
"جی نہیں، مطلق نہیں، علاوہ بریں پردہ
بہت کہنہ اور بوسیدہ ہے، بکری چبا رہی ہے تو
چبانے دیجیے۔"
"آپ تو اس معاملہ میں مجھ سے بھی بازی
لے گئے" نواب صاحب نے ایک آنکھ بند کر کے
دوسری آنکھ سے بکری کو بہت نقادانہ طور پر دیکھتے
ہوئے جواب دیا "آپ کو شاید اسکا علم نہ ہو مگر
میں تو دوستی یا یگانگت کے تعلقات کے آغاز کے
وقت "حیوانات سے محبت" ہی کو معیارِ امتحان
قرار دیتا ہوں ــ ہاں تو یہ خاص بکری تو بھی
بہت عجیب و غریب ہے" "ہے تو سر فیضی، اس سلسلے
اچنبھے کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں"
"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے آپ ذرا اسے دیکھتے
رہیے، وہ اب کود کر اس دوسری میز پر جانے والی ہے"
"کیا اس سامنے والی میز پر؟ وہ تو بہت
چکنی معلوم ہوتی ہے، اس پر تو شاید اسکے قدم نہ جمیں"
بکری نے جست کی اور میز پر پہنچ گئی، وہاں
سے جو پھسلنا شروع ہوئی تو ٹھیک کنارہ پر آ کر سنبھلی۔
"توبہ، اُس نے میز کی صاف شفاف سطح پر
بہت سی خراشیں ڈال دیں یہ تو بہت ہی بُرا ہوا"
نواب صاحب نے فرمایا
"بُرا ہوا! بُرا کیوں ہوتا!" سر فیضی نے اپنی
مسرت پر جبر کر کے کہا "یہ میز میرے سکڑ دادا کے
زمانہ کی ہے، اور اب اتنی پرانی ہو چکی تھی کہ اسکے
خراب کر دینے کی ضرورت تھی۔"
"کیا لیڈی فیضی کو بھی بکریوں سے شغف ہے"
سر فیضی نے اپنے ہونٹ دانتوں سے دبا لیے
اور حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالیں
"جی ہاں شوق تو انھیں بھی ہے اور قریب
قریب اتنا ہی جتنا مجھکو ہے مگر وہ چونکہ عورت ہیں اور
اس لیے غیر مستقل مزاج اس بنا پر ممکن ہے کہ وہ
کسی خاص بکری کو پسند نہ کریں"
"کیا اسکا امکان ہے کہ وہ اس بکری کو پسند
نہ کریں" نواب صاحب نے دریافت کیا

زرد پڑ گیا اور وہ فوراً سنبھلے۔ وہ پہلے پکار رہے تھے
اُن کے جسم کا تمام خون کھنچ کر جیسے چہرے پہ جمع ہو گیا اور
چونکہ انہیں اس کا اچھی طرح احساس تھا کہ اُن کا
رنگ چقندر کی طرح سرخ ہو رہا ہے اس لیے انہوں
نے اپنی اور بکری دونوں کی بات چھپانے کے لیے
یہی مناسب سمجھا کہ کمرے سے تھوڑی دیر کے لیے
چلے جائیں۔

انہوں نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تاکہ
نواب صاحب اُن کے اضطراب کا اندازہ نہ کر سکیں
لیکن جب وہ نواب صاحب سے اجازت خواہ ہوئے
تو اُن کی آواز گلے میں پھنس پھنس کر نکل رہی تھی

"میں ابھی ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں،
ذرا دیکھ لوں کہ لیڈی نعیمی اور نعیمہ بیگم کیا
کر رہی ہیں"

"ضرور ضرور۔ جب تک آپ ... بکری
سے اپنا دل بہلا لوں گا"

سر نعیمی کمرے سے باہر آئے ہی تھے کہ بکری کو
کارنس پر کی کوئی چیز پسند آ گئی۔ یا تو سر نعیمی
کا بڑا فوٹو یا لیڈی نعیمی کا خوبصورت آئینہ ———
بہرحال چونکہ وہاں تک معمولی طور سے پہنچنا
دشوار تھا، اس لیے بکری نے چالاکی سے کام لیا۔
نواب صاحب کو اس کا یقین تھا کہ اس بکری کے
لیے کارنس پر چلنے کا یہ پہلا موقع نہیں ہے، پھر بھی
وہ اس کی کوششوں کو بہت غور سے دیکھتے رہے
اور جب بکری ایک صوفے اور میز و کرسی کی مدد سے
کارنس پر پہنچ کر نواب صاحب کو دیکھنے لگی تو
نواب صاحب نے کہا "شاباش شاباش" اور بکری
نے اس کے جواب میں ——— میں میں ——— کیا۔
اس سے کچھ پہلے شاید آواز گیلری تک سر نعیمی کے
حلق سے نکلی اور سیدھے چلنے لگے انہوں نے بے تحاشا
بھاگنا شروع کر دیا

"کہو نواب کچھ پسند آئے" لیڈی نعیمی نے
ہنس کر پوچھا

سر نعیمی نے اپنے حلق سے عجیب و غریب آوازیں
نکالیں

"کیسا جادو ہو گیا ہے" مسز نعیمی نے
ذرا پریشانی سے دریافت کیا

"ارے نواب ... بدمعاش نواب، وہ کمرے کو
تباہ کیے دے رہا ہے"

"اچھا۔ نعیمہ ذرا خود کو سنبھال کر بات کیجیے"
مسز نے تردد سے دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا
گویا نواب صاحب وہاں کھڑے سر نعیمی کی باتیں سن
ہی تو رہے تھے

"میں سنبھال سنبھلا ہوا ہوں۔ اتنا سنبھالا کہ اب
مزید سنبھلنا مجھے مار ڈالے گا حرامزادی، مردار، کمبخت
بکری کے بھیس میں شیطان ہے۔"

"اختر اختر، کون حرامزادی ہے، کس کی بکری"
یہ کیا باتیں کر رہے ہو، آخر مجھے بھی تو کچھ بتاؤ" لیڈی
نعیمی نے حیرت سے کہا

"اُسی کمبخت سعید الدین کی بکری، اُس کی پالتو

بکری کارنس پر خراماں خراماں ٹہل رہی تھی، ہر قدم پر
ایک تڑاقا ہوتا تھا اور ہر تڑاقے پر بکری کی مسرت
میں اضافہ ہو جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ نواب صاحب بھی بکری کی مسرت سے بہت خوش
تھے۔ ابھی تک انھیں لیڈیز کے آجانے کا علم
نہ تھا۔

"شاباش، شاباش" نواب صاحب فرما رہے
تھے اور بکری کہہ رہی تھی "باع، باع"۔

"اللہ کتنی شاندار بکری ہے، مجسم رعنائی،
سراپا شوخی و طنازی" نواب صاحب منہ ہی منہ
میں کہتے جاتے تھے۔ لیڈی فیضی نے بہت کوشش
اور جبر سے اپنے چہرے پر سنجیدگی پیدا کی، انھوں
نے سوچا کہ نقصان تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اسکی تلافی
تو ہو نہیں سکتی، لیکن نسبت کی تکمیل کا اب بھی امکان
ہے، اسے کیوں ہاتھ سے کھویا جائے۔ انھیں یہ
علم ضرور تھا کہ نواب صاحب کو رضیہ سے عشق ہے
لیکن انکو اسکی اطلاع بھی مل چکی تھی کہ نواب
صاحب آداب مجلس کے بڑے پابند ہیں، اور
وہ ان لوگوں سے بہت دور دور رہتے ہیں جنکے
آداب میں خامی ہوتی ہے، ساتھ ہی انھیں یہ خیال
پیدا ہوا کہ کہیں نواب صاحب اس طرح ان کا
اور ان کے شوہر کا امتحان نہ لے رہے ہوں۔
انھوں نے چپکے سے رضیہ کے کان میں یہ بات کہی
اتفاق سے اسوقت نواب صاحب پلٹے
تو ان کی نظر لیڈی فیضی اور رضیہ پر پڑی، انھوں نے
کمان کی طرح خم ہو کر دونوں کی تسلیم کی اور رضیہ و لیڈی
فیضی دونوں کے چہروں پر مکمل متانت اور سنجیدگی کا گہرا
ان پر بہت اثر پڑا۔

"سر فیضی تو مشغول ہیں، مجھے اپنا تعارف شاید خود
کرانا پڑے گا، یا پھر رضیہ میرا تعارف کرا دیں، رضیہ
سے تو آپ واقف ہیں نا" لیڈی صاحبہ نے کہا

"خوب اچھی طرح" نواب صاحب نے مسکرا کر جواب
دیا۔ "میں تو ان کی رگ رگ سے واقف ہوں"

تعارف کے بعد قدرتاً موضوع گفتگو بکریوں کی
طرف پھرا اور خصوصاً ڈرائنگ روم کی بکری کی طرف۔

"آج یہ بکری بے حد خوش و خرم ہے کیونکہ اسکو مکمل
آزادی حاصل ہے" لیڈی فیضی نے کوچ پر ایسی
جگہ بیٹھتے ہوئے کہا جہاں سے انھیں بکری اور کارنس
دونوں نظر آتے تھے۔

"مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ سب
لوگ جانوروں سے اس قدر مہربانی کا سلوک کرتے ہیں"
نواب صاحب نے فرمایا۔

"میں تو آپ سے پیشتر ہی کہہ چکی ہوں کہ میں
انھیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں" رضیہ
نے ترحم آمیز مسکراہٹ سے جواب دیا۔

"تو کیا آپ کو بھی بکریوں سے اسی قدر شغف ہے
جس قدر آپ کے چچا جی کو" نواب صاحب نے
ذرا جلدی سے پوچھا

"بلکہ ان دونوں سے کچھ زیادہ" رضیہ نے
پھر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اتنا مہنگا کہ دس ہزار بکروں کا ایک بکرا ہے'

"چچا جان وہ بات نہیں ہے بلکہ اصل میں انھیں جانوروں سے دلچسپی زیادہ ہے" "اور مجھ کو تو یہ خیال ہے کہ نواب صاحب ہمارا امتحان لے رہے ہیں"

"امتحان" سر فیضی نے چونک کر کہا "کس چیز کا"

"اس کا کہ ہم لوگ وحشی جانوروں سے محبت رکھتے ہیں یا نہیں"

"تو تم میری طرف سے اُس سے کہہ دو کہ میں اس کی عزت کرتا ہوں"

"چچا جان ذرا تو عقل سے کام لیجیے — نواب صاحب بہت سمجھدار آدمی ہیں، ذرا یہ تو دیکھیے کہ کہاں تمام چیلنج میں وہ کس سکون اور سنجیدگی سے بیٹھے ہوئے ہیں"

"ادھر دیکھو رضیہ میں تمہارا چچا ہوں، اور میری یہی خواہش ہے کہ نواب صاحب سے انسانیت کا رشتہ جوڑو، لیکن اگر تم نے پھر اس قسم کا کوئی احمقانہ جملہ منہ سے نکالا تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میرے دماغ کی رگ پھٹ جائے اور میں مر مرا جاؤں — — اس چیلنج میں سنجیدگی اور سکون، میرے باپ کے ہاتھ — میرا ونس کا آئینہ، میرے والد کی میز، میرا بچپن کا گلدان، میری اطالوی الماری اور وہ مردار بکری —— اگر میں اس نواب کے یہاں ایک بکری لیکر پہنچ جاؤں تو بھی کیا وہ اسی سکون اور سنجیدگی کو کام میں لائے گا"

"مگر چچا جان بکری ہے خوبصورت"

"تو کیا میں اس بکری کو لیکر جاؤں —— یقیناً رضیہ اب تو تم نے اس نواب سے شادی کا ارادہ ترک کر دیا ہوگا"

"اب تو اور بھی پختہ ہو گیا ہے"

"رضیہ خدا کے واسطے عقل کے ناخن لو، میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اس خبط سے باز آؤ، جو شخص ایک سجے سجائے کمرے میں اتنی شریر بکری لیکر داخل ہو سکتا ہے، اُس سے ایک شیر خوار بچے کے پالنے میں ناگ چھوڑ دینا کیا بعید ہے۔ تمہاری چچی کیا کر رہی ہیں"

"آپ کا انتظار، چچا جان خدا کے واسطے اپنے آپ کو سنبھالے رکھیے گا، ورنہ سب معاملہ بگڑ جائیگا اور اب جلدی چلیے ورنہ انھیں خیال ہوگا"

"خیر اچھا چلو" سر فیضی نے بےکسانہ انداز سے جواب دیا۔

جس وقت یہ چچا بھتیجی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے لیڈی فیضی نواب صاحب سے باتوں میں مشغول تھیں۔ بکری کتابوں کی ایک الماری کا معائنہ کر رہی تھی، پہلے تو اس نے الماری کے کچھ شیشے توڑے، پھر جونہی لیڈی فیضی نواب صاحب کو ایک تصویر دکھانے کے لیے کھڑی ہوئیں اُس نے دوڑ کر لیڈی فیضی کے کولوں میں ایک ٹکر ماری جس کے سبب سے وہ گر پڑیں۔

"رضیہ، کیا یہ مالیخولیا کی نشانی نہیں ہے"

سر نعیم نے آہستہ سے کہا
"میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے چوٹ نہیں آئی"
نواب صاحب نے لیڈی نعیم کو سہارا دیکر اٹھاتے
ہوئے کہا۔
"جی نہیں، مطلق نہیں۔ یہ تو بکری نے مذاق
کیا تھا"
"جی ہاں محض مذاق، صرف ایک خوش فعلی"
سر نعیم نے دانت بھینچ کر کہا
قبل اسکے کہ نواب صاحب کچھ جواب دے سکیں
بکری نے باغ کی جانب کھڑکی پر دھاوا بول دیا
"شاید بکری اب باغ میں جانا چاہتی ہے اور
مناسب بھی یہی معلوم ہوتا ہے" نواب صاحب نے
بانداز استغنا فرمایا
"مجھے تو اس میں کوئی پس و پیش نہیں، مگر بڑا ہی
خطرناک آدمی ہے اگر اس کے ہتھے یہ چڑھ گئی
تو اسکی خیر نہیں" سر نعیم نے جواب دیا
"تو اس سے آپ کا یہ مطلب ہے کہ بکری کمرے
ہی میں رہے"
"نہیں نہیں، اگر اُسے یہاں وحشت ہوتی ہے تو
میرا ہرگز یہ مقصد نہیں ہو سکتا کہ اسکی خوشی کے خلاف
اسے یہاں روکا جائے۔ آپ کی رائے میں اگر رضیہ
اسے اپنے ساتھ سارے مکان کی سیر کرلائیں تو کچھ ہرج
تو نہیں"
"آپ کی خوشی، جو چاہے کیجیے —— کیا آپ
عموماً بکریوں کو مکان بھر میں ہر جگہ جانے دیتے ہیں یا انکی
پہنچ صرف اسی کمرے تک ہے"
"میں تو انھیں دوسرے کمروں میں بھی نہیں گھسنے دیتا ہوں۔ ہاں
اگر کسی مہمان کے ساتھ کبھی کوئی جانور ہوا تو بیشک
وہ اس کمرے میں اپنے آقا کے ہمراہ آجاتا ہے"
"کسی معزز مہمان کے ہمراہ" لیڈی نعیم نے
جلدی سے لقمہ دیا۔
"اور وہ بھی شاذ و نادر —— کیا آپ بھی
بکریوں کو اپنی کوٹھی میں مکمل آزادی دیے رکھتے ہیں
کہ جہاں چاہیں آئیں جہاں چاہیں جائیں" رضیہ
نے کہا
"کیا فرمایا آپ نے؟ میں اپنی کوٹھی میں بکریوں
کو ہر جگہ آنے جانے کی اجازت دوں، یہ آپ سے
کس نے کہہ دیا، ہرگز نہیں، ہاں اوروں کے گھر میں
وہ جو چاہیں کریں، اس میں مجھے کوئی دخل نہیں مگر
میں اپنے یہاں بھی انھیں اس قسم کی آزادی دوں۔
کبھی نہیں"
سر نعیم صوفہ پر سے کود کر کھڑے ہوگئے۔
"چچا جان" رضیہ نے تیزی سے پکار کر کہا
"میں اب ضبط نہیں کر سکتا" سر نعیم نے اپنے
کالر ٹائی سے کشتی لڑتے ہوئے کہا "مجھے بولنے دو
"کیوں جناب نواب صاحب۔ کیا آپ کا مطلب
یہ ہے کہ آپ بکریوں کو اپنے مکان میں کبھی داخل
ہی نہیں ہونے دیتے؟ کیا آپ کے جواب سے
میں یہ سمجھوں کہ آپ بکریوں پر اتنا ترس بھی نہیں کھاتے
کہ انھیں ایک فرنیچر سے آراستہ اور خوبصورت

سازوسامان سے پیراستہ کمرے میں گھسنے اور وہاں کی قیمتی
کو توڑنے پھوڑنے دیں، قالین کو برباد کرنے دیں، آئینوں کو
چکنا چور کرنے دیں، گلدانوں کے ٹکڑے اڑنے دیں"

"بیٹی میں جانوروں کا دلدادہ ضرور ہوں لیکن
کتنی ہی اچھی بکری کیوں نہ ہو میں اُسے اپنے کسی کمرے
میں گھسنے نہ دوں گا۔ رہا یہ امر کہ جانور دوسروں کے
یہاں کس طرح رکھے جاتے ہیں تو یہ میرا فعل نہیں"
نواب صاحب نے ذرا زور زور سے سانس لیتے ہوئے
جواب دیا۔

"ٹھہرو ٹھہرو" سر نیفی نے ہانپتے ہوئے کہا،
"وہ میرا فعل نہیں ... میرے اللہ"
سر نیفی کا اضطرار و اضطراب اس قدر واضح اور
نمایاں تھا کہ نواب صاحب کو اس کا احساس نہ
ہوتا تو تعجب تھا

"کیا میرے منہ سے کوئی ایسا لفظ نکل گیا جو
ناگوار ہوا" انھوں نے طنزیہ لہجے میں دریافت کیا

"نہیں نہیں، کوئی بات نہیں — مگر میں اجازت
نہیں دے سکتا، اجازت نہیں دے سکتا، نہیں
دے سکتا۔ اب اس سے بہتر موت گوارا کروں گا"
سر نیفی نے بلند آواز سے کہا

"کاہے کی اجازت نہیں دے سکتے" رضیہ
نے دریافت کیا

سر نیفی نے ایک لمبی سانس لی "تم خوب جانتی
ہو کہ کس بات کی۔ کیا اب بھی تم اس ذلیل سفلے
سے شادی پر تلی ہوئی ہو، تم اب اس کی بیوی
نہیں ہو سکتیں، وہ بالکل پاگل ہے مطلق پاگل
سراسر پاگل"

لیڈی نیفی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ رضیہ نے
نواب صاحب کی طرف ایک قدم بڑھایا جو حیرت
و استعجاب کا مجسمہ ہو رہے تھے۔ انکے شان و گمان
میں بھی نہ تھا کہ ان کی بابت بھی پاگل پن کا قیاس
کیا جا سکتا ہے، وہ تو خود سر نیفی کو سنکی سمجھے
ہوئے تھے

"چچا جان"

"اختر"

"مجھے نہ چچا جان کہو نہ اختر، میں کبھی اجازت
نہیں دے سکتا۔ وہ بالکل دیوانہ ہے، بالکل دیوانہ"

نواب صاحب کو احساس ہوا کہ سر نیفی کی حالت
اس وقت بہت خطرناک ہے، انھیں خوب معلوم
تھا کہ دوران دیوانگی میں کسی دیوانہ کی تردید کرنا
بہت بڑی غلطی ہے، اس لیے انھوں نے سر نیفی
کو دھیما کرنے کی غرض سے کہا

"شاید میرے کسی جملے سے آنجناب کو یہ
خیال ہوا کہ میں جانوروں سے شوق نہیں رکھتا
ہوں۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہ تھا، میں آپ کو یقین
دلاتا ہوں کہ مجھے ان سے بے حد شوق ہے۔ مگر میں
انھیں اپنے سجے سجائے کمرے میں اس قسم کی
لغو حرکتیں کرنے دوں، یہ ناممکن ہے"

سر نیفی کا منہ پہلے سے زیادہ سرخ ہو گیا۔
"ادھر دیکھیے نواب صاحب" انھوں نے

بمشکل کہا اور پھر آواز یا ری نہ کر سکی اور وہ چپ ہو گئے

"جی فرمائیے"

"آپ اپنی اس بکری کو کمرے سے باہر لیجائیے ورنہ سنبھلے لویزال میں ایک بندوق لیکر آپ اور آپ کی بکری دونوں کو ہلاک کردوں گا"

"کیا فرمایا آپ نے؟ اپنی بکری کو" نواب صاحب نے اچھل کر پوچھا

"آپ کی بکری، آپ کی بکری، جی ہاں نواب صاحب آپ کی" سرنفیس نے نواب صاحب کی ٹھوڑی کے نیچے مٹھی ہلاتے ہوئے کہا

پہلی بار نواب صاحب کا سکون اور سنجیدگی سب رخصت ہو گئے۔ وہ دھم سے کرسی پر گر پڑے اور انکا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بکری خراماں خراماں آکر انکے قریب کھڑی ہو گئی۔ نواب صاحب نے اُسے گھور کر دیکھا۔

"مے . . . میر . . . میری بکری" انھوں نے کمزور اور نحیف آواز میں کہا

"جی ہاں، آپ کی بکری" اسے لے جائیے قبل اسکے کہ میں اس کو اور آپ کو دونوں کو نقصان پہونچاؤں"

نواب صاحب بمشکل کوشش کرکے کھڑے ہوئے تھے، پھر دھم سے کرسی پر گر پڑے۔

"مگر یہ بکری تو میری نہیں ہے، میں نے اس سے پیشتر اسے دیکھا بھی نہ تھا"

"اس سے پیشتر کبھی دیکھا بھی نہ تھا" سرنفیس نے بصد دشواری کہا

"کبھی نہیں۔ میں تو یہ سمجھا کہ یہ آپ کی ہے"

اب سرنفیس کا نمبر تھا کہ وہ دھم سے گر پڑیں۔ دو تین بار اُنھوں نے حلق چلایا مگر آواز نہ نکلی بڑی کوشش کے بعد اُنھوں نے کہا

"آپ نے سمجھے کہ میری ہے کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ نے مجھے اتنا عقل سے خالی کیوں سمجھا تھا جتنا جیتا جاگتا میں خرگوش"؟

"مجھے خیال تک نہیں پیدا ہوا کہ یہ آپکی نہیں ہے، اس پر مجھے تعجب ضرور تھا کہ آپ جانوروں کے کیسے شوقین ہیں کہ تمام کمرہ اُسے برباد کرنے دے رہے ہیں۔ لیکن یہ میرا منصب نہ تھا کہ میں اس پر اعتراض کرتا" نواب صاحب نے متانت سے جواب دیا۔

"لیکن بکری آپ کے ساتھ کمرے میں آئی تھی میں نے اُسے خود آتے دیکھا" سرنفیس نے کمزور آواز میں کہا

"ویسے تو آپ کا ٹیلر بھی میرے ہمراہ کمرے کے اندر آیا تھا تو اس سے کچھ وہ میرا ٹیلر نہیں ہو گیا"،

"پھر یہ بکری آخر کس کی ہے، اگر عبداللہ نے اس کا کوئی معقول جواب نہ دیا تو میں اس کا سر توڑ دوں گا"

رضیہ جو اتنی دیر تک غم وغصہ تعجب و حیرت سے بُت بنی کھڑی تھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"چچا جان، کیا آپ نے عبداللہ سے نہیں کہا تھا کہ نواب سعید الدین خاں جانوروں کے بہت شوقین ہیں، اور اگر اُن کے ہمراہ کوئی جانور ہو تو اُسے بھی

ڈرائنگ روم میں آنے دیا جائے"
"مسٹر تم نے سنا تھا میں نے خود تمھیں کہتے
سنا تھا" لیڈی فیضی نے کہا
"ہاں میں نے کہا تھا، لیکن مجھے یہ خیال
تھا کہ بکری، تم نے کی کمبخت کو دیکھو اب اپنی
دائیں کھائے جا رہی ہے، کھانے دو مردار کو اب
یہی ایسے جوتے، دکھا جائے"
"نواب صاحب میں معافی چاہتا ہوں اور
شرمندہ ہوں کہ" سر فیضی نے شروع کیا
"شرمندگی یا معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں
سب کچھ غلط فہمی کی بنا پر ہوا۔ مجھے بھی آپ کے
روبرو ایک اقبال کرنا ہے"
سر فیضی "اقبال" کا لفظ سن کر اچھل پڑے۔
"حضرت، کہیں آپ یہ کہنے والے تو نہیں
کہ بکری اصل میں آپ ہی کی ہے۔ میں ابھی
بتائے دیتا ہوں کہ میں اس کی تاب نہ لا سکوں گا"
"نہیں نہیں سر فیضی —— بلکہ آپ کو خوش کر دینے
ہی سے میری آمد کی وجہ معلوم ہے لہذا میں اس کا
اقبال کرتا ہوں کہ مجھے رضیہ سے عشق ہے اور میں
اسکا خواستگار ہوں کہ آپ میری اور ان کی شادی
کی اجازت عطا فرمائیں"
سر فیضی خاموش رہے —— "بولو، بولو،
آخر بولو" لیڈی فیضی نے پنکھا ہلاتے ہوئے کہا۔
سر فیضی پھر بھی نہیں بولے، بلکہ ادھر ادھر دیکھا اور
رضیہ کی خوشی سے روشن آنکھیں دیکھ کر اس کا ہاتھ
اپنے ہاتھ میں لے کر وہ آگے بڑھے کہ نواب صاحب کے
ہاتھ میں رضیہ کا ہاتھ دے دیں۔ اتنے میں بکری نے
پیچھے سے سر فیضی کے ٹکر ماری، وہ تو دھم سے گر پڑے
اور رضیہ جھٹکے کے زور سے نواب صاحب کے
آغوش میں تھیں۔

سروش بیداری

(از جناب محمود اسرائیلی)

کدورت ہے نصیب اس کا جب تک دل مکدر ہے — بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ سب شیر و شکر ہونگے
قدم اپنے اٹھا غافل! ہے منزل تیرے قدموں میں — جو اب تک سو رہے ہیں وہ بھی تیرے ہمسفر ہونگے
تو اس جذبہ میں پھونک بھی دے صور بیداری — بدل جائے گا عالم منقلب یہ بحر و بر ہونگے
نشیمن تیرا ایمن تو پھونک برق آہ سے بلبل — بجائے گل یہی ہو گا کہ مٹھی بھر شرر ہونگے
غلامی سے رہائی کیا ہو جب گھلتے نہیں تیرے — جو نالے دل سے نکلیں گے کہاں تک بے اثر ہونگے
تری ہستی سے ناکارہ تو اچھا ہے کہ مٹ جائے — تری مٹی سے پیدا تجھ سے بہتر کچھ بشر ہونگے

تاریخ اودھ کے بعض قابل قدر مآخذ

(از مسٹر محمود تقی احمد علوی)

ہندوستان کے تاریخی ذخیرہ میں اودھ کی تاریخ پر مفصل اور مستند کتابیں نہایت کمیاب ہیں اسی لیے
قوم سلطنت اودھ اور علی الخصوص شاہان اودھ کے متعلق ایسے افسانے مشہور ہو گئے ہیں جن کو واقعیت
سے ذرا بھی واسطہ نہیں اور ان میں سے جو صحیح بھی ہیں وہ ایسے ہیں جن کی ذمہ داری خود شاہان اودھ پر
نہیں آتی، مگر افسوس ہے کہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ادھر توجہ نہیں کرتے، ورنہ تلاش کیا
جائے تو بہت سا قیمتی مسالہ موجود ہے اور ایسے قلمی نسخے ابھی بالکل نایاب نہیں جن سے اس تاریخی
دور پر کافی روشنی پڑ سکے۔ مثال کے طور پر مورخ فیض بخش مرحوم کی نادر الوجود تصانیف چشمۂ فیض،
مثنوی باغ و بہار اور نیز اُن کی بیاض مثل پیش کی جا سکتی ہیں جن کے قلمی نسخے اسوقت کاکوری کے کتب
خانہ میں محفوظ ہیں اگر یہ بیش بہا تاریخی نسخے بے توجہی سے پڑے رہتے تو یقیناً کچھ دنوں میں تلف
ہو جاتے اور ان سے جن واقعات کا انکشاف ہو سکتا ہے وہ اسی طرح لاعلمی کے پردہ میں مستور رہ جاتے

قبل اسکے کہ مندرجۂ بالا کتب پر کوئی تبصرہ کیا جائے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ منشی فیض بخش مرحوم
کون تھے اور انکو سلطنت اودھ سے کیا تعلق تھا۔

صاحب تذکرۂ مشاہیر کاکوری منشی فیض بخش مرحوم کاکوروی کے حالات میں لکھتے ہیں:-

"بہت ہی قابل اور ذہین اور اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے خط بھی نہایت پاکیزہ تھا اپنے
ہم سنوں میں خوشنویسی میں ممتاز تھے سیکڑوں کتابیں نقل کر ڈالیں خود لکھتے ہیں
کہ میں نے پچاس سال کی عمر تک ایک سو کتاب تصنیف کی"

علاوہ اس کے منشی فیض بخش بحیثیت مورخ کے بہت ہی بلند پایہ رکھتے ہیں۔ اُنکی مشہور تاریخ
فرح بخش کا ترجمہ انگریزی زبان میں ۱۸۸۹ء میں ہوا تھا۔ اس سے قبل ایلیٹ کی مشہور و معروف تاریخ
ہندوستان" کی آٹھویں جلد میں بھی اس کے ایک حصہ کا ترجمہ شائع ہوا تھا گو غلطی سے
اُس کا نام تاریخ فیض بخش اور مصنف کا نام شیو پرشاد قرار دیدیا گیا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں مورخ
نے خود اپنے مختصر حالات قلم بند کیے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکو علم تاریخ سے فطری مناسبت تھی
جس وقت وہ صرف تیرہ برس کے تھے، اپنے محلہ کے بزرگوں سے شاہان دہلی کے قصے سنا کرتے تھے

اور اس میں اتنا انہاک تھا کہ پڑھنے لکھنے کے شوقین ہونے کے باوجود اسی دھن میں سبق پڑھنا بھول جاتے۔
آگے بڑھ کر اس ذوق نے اتنی ترقی کی کہ ان کا دماغ تاریخی معلومات کا ذخیرہ بن گیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ
شعلہء میں بزمانۂ ملازمت فیض آباد مورخ سید غلام علی مصنف تاریخ عماد السعادت سے ملاقات ہوئی جو
بعض بیلی صاحب کلکٹر گورکھپور کے ساتھ فیض آباد آئے ہوئے تھے۔ جب بیلی صاحب گلاب باڑی دیکھنے
گئے تو انھوں نے سید غلام علی سے شجاع الدولہ کے انتقال کی تاریخ دریافت کی باوجود تاریخی واقفیت
کے سید صاحب نہ بتا سکے۔ تو انھوں نے اسی وقت منشی فیض بخش سے دریافت کرایا اور منشی صاحب نے
فوراً تاریخ بتا دی، جسکی اطلاع بیلی صاحب کو دی گئی۔ اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ چند احباب اور نیز داراب
علی خاں نے جنکے یہاں اس زمانہ میں منشی فیض بخش ملازم تھے اصرار کیا کہ فیض آباد و اودھ کی مفصل
تاریخ لکھی جائے۔ چنانچہ منشی فیض بخش نے یہ کام انجام دیا اور اس کتاب کا نام تاریخ فرح بخش رکھا۔

مورخ نے شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کا زمانہ پایا اور تیس سال سے زائد
فیض آباد میں مختلف خدمتوں پر مامور رہے۔ زیادہ عرصہ تک جواہر علی خاں ناظر ڈیوڑھی بہو بیگم صاحبہ
کے یہاں ملازم رہے۔ کچھ دنوں فوج کی تنخواہوں کی تقسیم انکے ہاتھ میں رہی اسکے علاوہ اور خدمات
بھی ان سے متعلق تھیں۔ جواہر علی خاں اصحاب علم کی صحبت کے بڑے دلدادہ تھے اور خود بھی علمی ذوق
رکھتے تھے۔ تاریخ، سیر اور تصوف کی مشہور کتابیں مثلاً روضۃ الصفا، حبیب السیر، اکبرنامہ، شاہجہاں نامہ،
معارج النبوۃ، مثنوی مولانا روم وغیرہ انکو روزانہ پڑھ کر سنائی جاتی تھیں۔ اور یہ خدمت بھی منشی فیض بخش
انجام دیتے تھے۔ جواہر علی خاں کے انتقال کے بعد ان کی متعلقہ خدمتیں داراب علی خاں کے سپرد ہوئیں۔
اور منشی فیض بخش بھی ان کے یہاں ملازم ہو گئے۔ چونکہ ان کی انشا پردازی کا بہت شہرہ تھا لہذا بہو بیگم
صاحبہ کے خطوط لکھنے کا کام انکے سپرد ہو گیا۔ ایسی اہم خدمت کے متعلق ہونے کی وجہ سے انکی سیاسی معاملات
سے واقفیت اور بھی زائد ہو گئی بہت سے معاملات جن کی بڑے بڑے لوگوں کو بھی خبر نہیں ہوتی تھی،
انکے قلم سے دور سے انجام پاتے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ نواب آصف الدولہ اور بہو بیگم صاحبہ کے درمیان
ناچاقی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اسکے اسباب کے متعلق جسقدر صحیح رائے قائم کرنے کا موقع انکو تھا،
کم کسی کو نصیب ہو سکتا تھا۔ انھیں کے قلم کے اکثر خطوط ہوتے تھے جو ماں کی طرف سے بیٹے کو لکھے جاتے
تاریخی ذوق تو تھا ہی اس پر ایسے مواقع ہاتھ آنے اور ان دونوں اسباب نے انکی تاریخی تصانیف
کو نہایت بیش قیمت بنا دیا۔ چنانچہ تاریخ فرح بخش کے انگریزی مترجم ہوئی صاحب کی یہ رائے ہے کہ اس
تاریخ سے مشرقی بادشاہوں کی زندگی کے ایسے پہلو پر روشنی پڑتی ہے جس سے یورپین مورخ بالکل ناآشنا

ہوتے ہیں اور اسی واسطے اودھ کی صحیح اور مکمل تاریخ لکھنے کے لیے اس کتاب کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔
اب ہم منشی فیض بخش کی مذکورہ بالا تینوں تصانیف پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں:—

۱۔ **چشمۂ فیض**۔ یہ فارسی زبان میں ایک خاندانی نسب نامہ ہے۔ اصل کتاب کا حجم قریب ۴۰۰ صفحے کے ہے۔ علاوہ نسبی حالات کے مصنف نے اپنے چشم دید تاریخی واقعات بھی درج کیے ہیں۔ تقریباً ۱۵۰ صفحے محض اودھ کے تاریخی حالات پر ہیں۔ نواب آصف الدولہ سے نواب بیگم اور بہو بیگم صاحبہ کی خفگی، ناچاقی کے اسباب، ریذیڈنٹ کی مصالحت کے لیے کوششیں، فیض آباد کی شاہی فوج کی برخاستگی، تنخواہ کی ادائی میں سخت تاخیر، لکھنؤ کا دارالسلطنتِ اودھ بنایا جانا، اور اس کی روز بروز ترقی، یہ تمام واقعات اس بیش قیمت تاریخی نسخہ میں نہایت عمدہ طور پر درج ہیں۔ دراصل نسب نامہ کا یہ حصہ مصنف کی تاریخ فرح بخش کی دوسری جلد کا جس میں محض اودھ کے واقعات ہیں ایک نہایت مکمل خلاصہ ہے بلکہ اس زمانے کی معاشرتی حالت پر بعض جگہوں میں تاریخ فرح بخش سے زیادہ تر روشنی پڑتی ہے۔ چند واقعات ایسے بھی درج ہیں جنکا ذکر فرح بخش میں نہیں آسکتا تھا۔ عبارت نہایت سلیس اور شستہ ہے غیر ضروری استعارات و تشبیہات بالکل نہیں ہیں جن سے تاریخی کتابیں کبھی کبھی بے مطلب ہو جاتی ہیں اور واقعات کچھ کے کچھ سمجھ لیے جاتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند سطور درج ذیل ہیں:—

(شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں کی مشہور جنگ)

"در عالم خواب بودیم که یک ناگاه از طرف حریف آواز توپ ها رسید، از صدای توپ تمام لشکر که به آرام می خوابید بیدار شده و مسلح گشته هر یک بجای خود با خبردار و هوشیار گشتند۔ القصه تمام شب در بیداری گزشت ... معلوم شد که فوج انگریزی ... از دو طرف غنیم را محاصره کرده اند نقشه جنگ مفصل .... این ست که حافظ رحمت خاں با تمامی فوج در جائے قلب که گرداگرد جنگل بانس بوده دیره داشت۔ نواب وزیر می خواستند که وضع باید کرد که از آں مکان بیرون آید حافظ مضطربانه از خیمه بیرون آمد۔ همیں که بر پشت زین قائم شد، گولهٔ توپ مانند ملک الموت رسیده ... از صدمهٔ آں راست شده بعقب افتاد، افتادن همان بود و پریدن روح از جسم همان"

(نواب شجاع الدولہ کی آصف الدولہ کو مرتے وقت وصیت)

نواب آصف الدولہ را ہو فرمودند .... مخاطب شده فرمودند که بابا یک وصیت هست با شما

بسر وقت عظیم آباد جا کرد — سواد پٹنہ را دولت سہا کرد
شد از بسیاری لشکر زمین تنگ — تزلزل گشت در سر کوہسار سنگ

. . . .

کہ تا گرد و بر و شد فوج انگریز — نمودند از دو جانب عزم خوں ریز

. . . .

گسست از تیر واز بندوق واز بان — ہم آویختند آں ہر دو میداں
کہ شد خستہ تن مردان کاری — روان شد خوں ز اطراف جاری

یہ مثنوی نامکمل رہ گئی جسکی وجہ یہ ہوئی کہ حضرت شاہ محمد کاظم رحمۃ اللہ علیہ نے بخیال کتمان حال تصنیف سے منع فرما دیا۔ چنانچہ ایک خط میں اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-

"یکدام احوال نوشتن قصد کردہ اند کہ مثنوی منظوم می شود احوال عیب و ہنر خود چہ نویسیم ہنر ہا اندک بلکہ ہیچ — ازیں کار درگذرند و ہر چہ نوشتہ باشند پارہ پارہ نمایند"

(معادضات مولانا حضرت شاہ محمد صاحب سید قلندر رحمۃ اللہ الباقی)

۴ - **بیاض** (منشی فیض بخش) اس بیاض میں ان مکاتیب کی نقل ہے جو احباب و دیگر اصحاب معاملہ نے منشی فیض بخش کے نام لکھے۔ ان میں سے وہ مکاتیب جو حضرت شاہ محمد کاظم قلندر کے ہیں مفاوضات یعنی مجموعہ مکاتیب حضرت شاہ محمد کاظم و حضرت شاہ تراب علی قلندر قدس اللہ سرہما میں شائع ہو چکے ہیں۔ بقیہ غیر مطبوعہ ہیں۔ ان مکاتیب میں جا بجا تاریخی واقعات کا بھی ذکر ہے۔ علاوہ اسکے کہ یہ اُس زمانہ کی انشا پردازی کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ان سے اُس عہد کے معاشرتی حالات پر بھی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ بعض ایسی چیزیں بھی ان میں موجود ہیں جن کو اکثر مورخین نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اس لیے کہ سیاسیات سے ان کے قریبی تعلق کا صحیح اندازہ اُس وقت نہیں ہو پاتا۔ ان مکاتیب سے مورخ کے احباب اور انکے تعلقات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے اس میں سے کچھ ٹکڑے نقل کیے جاتے ہیں :-

"از اوپ شہر می نویسد ... بفضل خدا ابد فتح قلعہ اوپ شہر خط جنابی نوشتہ خواہد شد فرصت نبود کہ مکمل نوشتہ شدہ"

"خدا شاہد حال باگیر حکیم صاحب می نویسد — بسبب فساد زمینداران این جا کرد اندوستند آتش زدگی بود زیر کار فرصت نداشت مثل اقامہ ملزم ..... و حال پرسد حی پہ جاست"

"کہ بعد شکست بہادر بیگی پنجہزاری سہ قلی کلاں منصب پنجہزار و دو ہزار سوار ..... و بعد متوفی ہمگی بخشیدند"

ایک اور خط کی سرخی یہ ہے :-

"بد لکھنؤ بعد حبس وزیر علی و آمدن سعادت علی خاں و شتی بہ ازمین نیابت ڈیکیٹ رائے و گلشن رائے و ازدو ڈیکیٹ معلی رو بروے غلام قادر خاں دیوان لسٹن صاحب و گورنمنٹ صاحب مذکور

بعہدہ عامل بودن دہ سالی کہ بعلہ خرچ نقرا مقرر بود"

اس مختصر تبصرہ کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ اودھ کے متعلق تحقیقات کرنے والوں میں اس قسم کی قیمتی اور نایاب کتابوں کی تلاش و جستجو کا شوق پیدا ہو اور ایسی بیش بہا تصنیفات کی بنیادوں پر ہمارے صوبہ کی مستند تاریخ مدون کی جائے۔

غزل

(از جناب منشی محمد احمد صاحب قمر مینائی مرحوم خلف اکبر جناب امیر مینائی مرحوم)

سراپا سوز ہوں آتش بجاں ہوں — شرارِ طور ہوں برقِ طپاں ہوں

کچھ ایسا قیدِ ہستی کا ہوں پابند — کہ اپنے پاؤں کی خود بیڑیاں ہوں

گہے گلزار ہوں اور گاہ صحرا — نسیمِ صبح ہوں بادِ خزاں ہوں

تمہارے دل میں جو میری داستاں ہے — اڑا دوں نیند میں وہ قصہ خواں ہوں

سبک تیری نگاہوں میں ہوں آنا — مگر غیروں کی خاطر پر گراں ہوں

زبانِ حال کہتی ہے مرا حال — میں القصہ سراپا داستاں ہوں

مدد اے خضر رحم اے پائے خستہ — کہ رہ گم کردہ دور از کارواں ہوں

ہر اک محفل میں وہ کہتے ہیں جاکر — کہ میں ہی رونقِ بزمِ جہاں ہوں

مرا نالہ نہیں کچھ صور سے کم — قیامت ہو جو سرگرمِ فغاں ہوں

سنو میری صدائیں کان رکھ کر — گلوں میں عندلیبِ خوش بیاں ہوں

قمر یہ ایک اپنے یوسف کی طلب میں
خریدارِ متاعِ جہاں ہوں

مرسلہ اسمٰعیل احمد تسنیم

خدا کا مذہب

(از جناب سید مقبول احمد صاحب احمد پوری)

یوں تو خیر کوئی نہیں جانتا کہ دراصل خدا کا مذہب کیا ہے، تاہم جہاں تک انسان کی عقل کو رسائی حاصل ہوئی اس بات کا پتہ ضرور چل گیا کہ خدا کا بھی ایک طریقۂ ذکر و اذکار رہا ہے، اور اس کے مذہب کے ساتھ تھوڑا بہت دخل سیاست کو بھی ہے۔ چنانچہ یہ آخری مسئلہ یعنی مذہب میں سیاست کا داخل ہونا ایک اہم بات ہے، اس لیے مزید تشریح ضروری ہے۔

"مذہب" نام ہے مختلف عقائد میں سے کسی ایک عقیدے کو پابندی کے ساتھ برتنے کا۔ اور اجتماعی و انفرادی زندگی سے متعلق ہر قسم کی قیل و قال کا نام سیاست ہے۔ اس اعتبار سے ایک "مولوی" یا "شدھیہ پنڈت" مذہب کا پیرو ہے، اور ایک عملی قوم سیاست کا علمبردار۔ شاعر، مغنی، رقاص، ایکٹر وغیرہ وغیرہ سب کچھ ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ مختصر یہ کہ خدا کے بندے ہیں اور آیۂ پاک "تسبح له السموات السبع والارض ومن فیھن" کا مصداق ہیں۔ لیکن یہاں بحث تو خدا کے مذہب سے ہے اور اس مذہب میں جو سیاست پنہاں ہے اس سے۔ الغرض جیسا کہ اوپر لکھا گیا، خدا کا مذہب کسی کو معلوم نہیں، البتہ قرآن شریف میں یہ ضرور آیا ہے کہ "خدا اور اس کے فرشتے نبی پر درود و سلام بھیجا کرتے ہیں، اس لیے اے ایمان والو (یہ ضروری نہیں کہ ایمان والا ہر مسلمان ہی ہو) تم بھی ان پر سلام اور تسلیم بھیجو۔"

خدا کا نبی کون ہے؟ یہ بڑی اہم بات ہے۔ قرآن شریف میں تو یہ لکھا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی نبی نہ پیدا کیا گیا ہو، حتیٰ کہ وحوش و طیور بھی کسی نہ کسی نبی کی امت مانے گئے ہیں۔

بہرحال خدا کے مذہب کا اتنا کچھ تو پتہ چل گیا، یعنی یہ کہ اس کا مذہب نیکی ہے جو الیف توحید ہے محاسنِ علوی کی۔ جس میں سچائی، خلوص، ایثار، قربانی، سخاوت، شجاعت، اور علیٰ ہذا القیاس اور بہت کچھ شامل ہے۔ نیکی کو خدا کا مذہب اس لیے کہا گیا کہ ہر نبی کی تعلیم کا ماخذ یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نبی پر درود و سلام بھیجتا ہے تاکہ اس کے بندوں میں نیکی کا رواج زیادہ ہو۔ یہ تو ہوا مسئلہ کا خالص مذہبی پہلو۔

سیاست خدا کے مذہب میں کیوں شامل ہے؟ اس کا جواب بھی قرآن شریف میں مل جائے گا۔
مثلاً یہ آیۂ پاک جس کا ترجمہ ہے کہ "دین میں زبردستی نہیں"۔ یا یہ فقرہ کہ "ہمارا دین ہمیں سلامت
اور تمہارا دین تمہیں مبارک"۔ وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خدا چاہتا تو تمام دنیا میں ایک ہی مذہب
ہوتا، لیکن نہیں، یہ بات نہیں۔ بلکہ مذاہب میں تنوع ہے، اور مذہب کے ساتھ سیاست نے مل کر
ہر بڑی نوعیت کو منقسم کر دیا ہے۔ مثلاً ایک لفظ "مسلمان" ہی کو لیجیے، جو مذہب کا مفہوم لیے ہوئے
ہے، اب اسی لفظ میں سیاست نے داخل ہو کر اس کو (شیعہ اور سنی) دو حصوصیتوں کا حامل کر دیا۔
اسی طرح لفظ "ہندو" آریہ، سناتن دھرم وغیرہ وغیرہ کا مفہوم لیے ہوئے ہے۔ چنانچہ دنیا کا ہر بڑا
مذہب معاشرت اور سیاست سے ٹکر کھا کے بہ تقاضائے فطرت ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مذہب وغیرہ کے علاوہ
کائنات بھی اس تنوع کی شاہد ہے۔ رات کو دیکھو کتنے ستارے نظر آتے ہیں۔ کیا کبھی یہ سب ایک
بڑا ستارہ نہ ہوں گے۔ ہنود کے قدیم فلسفہ میں تو ہمارے اس قول کی تصدیق موجود ہے۔ اور
آج کل کے مادہ پرستوں نے اس کو ثابت کر دیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ تغیر و تنوع ہی سے کائنات کا حسن
ہے اس کا مقصد کیا ہے اس کی واقعی ہم کو خبر نہیں۔

اب تو خدا اپنے نبی پر درود و سلام بھیجتا ہے۔ اور بندے کیا کرتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں
صرف اتنا کہنا بہت کچھ نفل ہے۔ بعض بندے اپنی جان تک اُن پر نثار کر دیتے ہیں وہ خدا کے پیارے
بندے ہیں۔ لیکن بعض بندے اُنکے سر پر آرے چلاتے ہیں، انکو صلیب پر لٹکاتے ہیں، اُن کو
پتھر مار کر لہولہان کرتے اور بُرا بھلا کہتے ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جاتا
ہے یہ نسبتِ باطنی بھی اسی تیزی سے کمتر ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ نہایت ہی بزدل، چور اور انسانیت
سے خارج عورت کی طرح چھپ چھپ کر زہر اُگلتے ہیں جیسے بم چلانا، چلتی ریل کی راہ میں بم
بچھانا، پستول وغیرہ سے حاکموں اور مصلحانِ قوم کو نشانہ بنانا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنکو خدا اپنے جہنم
میں بھی جگہ نہ دیگا بلکہ اُنکے لیے اس سے بدتر کوئی جگہ ہوگی۔
چونکہ دنیا میں یہ ہوتا آیا ہے اس لیے اس بات کا اندازہ غلط نہیں کہ جہنم سے بھی بدتر کوئی جگہ
ہے ضرور۔
مگر ایک اہم سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تغیر و تنوع پر معاشرت کا دارومدار ہے تو کسی رہبر
یا مصلح قوم کو پیدا ہونے کی کیا ضرورت؟ اس کا جواب صرف اس استعارہ سے ماخوذ کیا جا سکتا
ہے کہ جس طرح انسان خود تنوع کا حامل ہے یعنی بولتا ہے، کھاتا ہے، ہنستا ہے، سوتا ہے، جاگتا ہے

سلہ لا اکراہ فی الدین ؎ لکم دینکم ولی دین

سنتا ہے سونگھتا ہے اور نہیں معلوم کیا کیا کرتا ہے بشرطیکہ فطرت وصداقت اصول سے ہم آہنگ ہو اور
جس طرح بہرے ہو جانے، گونگے ہو جانے، یا اندھے، لنگڑے لولے ہو جانے سے ڈاکٹر یا حکیم کی فکر ضرور
ہوتی ہے اور دماغی تنوع کو آراستہ و پیراستہ کرنے کے لیے معلم اور استاذ کی تلاش ہوتی ہے اسی طرح
مذاہب و معاشیات میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں اور اُن کی اصلاح ضروری ہے - جب کسی مذہب معاشرت
یا سیاست میں بدعت، پستی یا گندگی کا دخل ہو جاتا ہے تو خدا کو خود اسکے ازالہ کی فکر ہوتی ہے اسلئے
وہ پیغمبروں اور مصلحان قوم کو پیدا کرتا ہے اور اس بات کا خواہاں رہتا ہے کہ وہ سلامت رہیں اور
اُنکو اپنے کام یعنی خدا کی رضامندی سے متعلق پیام پہونچانے میں ایک حد تک کامیابی حاصل ہو
ایسی کامیابی جو خدا کے بندوں کو کم از کم اُس پستی سے بلند کر دے جس سے اُنکا ارتقاء ہوتا ہے - یعنی اگر
وہ بندے انسان ہوتے ہیں تو وہ پھر تندرست ہو جائیں، بلکہ خدا کی طرف مائل ہوں اور صرف
اُسی کے ہو رہیں اور وہی ہو جائیں - یہی خدا کا مذہب ہے اور یہی اس مذہب کا مقصد -

---

غزل

(از جناب مولوی سید رضی احمد صاحب رضیؔ پھلواروی)

ہے زندگی اجل کی صعوبت لیے ہوئے　　مُردہ ہوں اور حیات کی تہمت لیے ہوئے
ہر پیرہن سے آتی ہے بوئے قبائے دوست　　ہے ہر مجاز ایک حقیقت لیے ہوئے
صدقے فریبِ شوق کے بیٹھا ہوں رات دن　　پہلو میں ایک چاند سی صورت لیے ہوئے
ہیں مخمصے میں کافر و دیندار مبتلا　　کچھ بحثِ مجاز و حقیقت لیے ہوئے
صد ہا مذاقِ حسن سے بیگانے رہ گئے　　یہ انتہائے حسن و صورت لیے ہوئے
ہر پیکرِ وجود میں فطرت کا راز ہے　　ہر ذرہ ہے پیامِ حقیقت لیے ہوئے
اٹھو حجابِ ناز سے - ہیں محو انتظار　　پیشانیاں سجودِ عقیدت لیے ہوئے
اب رسمِ قیدِ چشم تماشا اُٹھی تو کیا　　جب اہلِ دید اُٹھ گئے حسرت لیے ہوئے

اب میں ہوں اور ماتمِ صد آرزو رضیؔ
ہر سانس ہے جنازۂ حسرت لیے ہوئے

فغانِ آرزو

(از حضرت آرزو لکھنوی)

ادائے شاد سے تو وارا تھے نثار ہوں میں
جو اپنی آنکھ سے اوجھل ہے وہ بہار ہوں میں

مآلِ عشرتِ فانی پہ شرمسار ہوں میں
خود اپنے تیر کا مارا ہوا شکار ہوں میں

سرورِ شب کا نہیں صبح کا خمار ہوں میں
نکل چکی ہے جو گلشن سے وہ بہار ہوں میں

وجود اب بھی ہوا کا ہے خاک سے باقی
جو بیٹھنے نہیں پاتا ہے وہ غبار ہوں میں

مٹی ہوئی سی ہوں تصویر اپنی حسرت کی
گیا ہوا ترے وعدے کا اعتبار ہوں میں

قتیلِ ناز کا قاتل ہی خونبہا تو نہ ہو
وہ آ بنی ہے کہ دشمن کا دوستدار ہوں میں

شکایت کی ہے یہاں آکے ابتدائے کلام
مآلِ زیست کا پہلے سے سوگوار ہوں میں

گلہ نہ ایسی ملیگی نہ ہم کے مینھیوں گا
بہت رہا جو ترے دل میں وہ غبار ہوں میں

جو بار پیکرِ خاکی سنبھل سکے تا چند
فقط شمارِ نفس اک ہوا کا تار ہوں میں

مثالِ قبلہ نما آشیاں سے محوِ چمن
سکوں حصول ہے اور پھر بھی بیقرار ہوں میں

کرم پہ تیرے نظر کی تو ڈھہ گیا وہ غرور
بڑا اٹھا تا ناز کہ حد کا گناہگار ہوں میں

مٹا سکے بھی نہ قبولا شباب خانہ خراب
چمن اجاڑ دیا جس نے وہ بہار ہوں میں

نئی ادائیں نہ دیں دعوتِ طرب پیہم
ابھی تو مردہ امیدوں کا سوگوار ہوں میں

نبھا رہے ہیں جو وہ بھی فیض پاتے ہیں
زمیں کا بوجھ نہیں نخل باردار ہوں میں

دلِ گداختہ میرا ہے آتشِ سیال
جہاں میں آگ لگ اٹھے جو اشکبار ہوں میں

حیات و موت نے کھینچے ہیں یہ دو نقشے
کبھی ہوں خاک کا ڈھیر اور کبھی غبار ہوں میں

جفا اٹھانے میں دکھ ہے تو آپ سے کیا کام
نہ خاک ہے تو اپنا گناہگار ہوں میں

فریبِ زیست پہ مردہ دلی میں کیوں لے سانس
جو خاک سے ہے محروم وہ مزار ہوں میں

دکھا سکے ساغرِ خالی جا ہی کتنی ہے
جو گزرے کیف میں اُس رات کا خمار ہوں میں

نہ پوچھ یہ سوا مجبور سے آدر کی حالت
کہ مثلِ آئنہ ہر اک کا رازدار ہوں میں

فنا ہے عین بقا آرزو محبت میں
خزاں بہار دونوں سما رہا ہوں میں

بیانِ شرف

(از مولانا شاہ ابو الشرف صاحب مجددی)

ہے [illegible] آنکھوں میں وہ جلوا لیے ہوئے
خود محو ہو رہا ہے کہ ہوں کیا لیے ہوئے

داغِ فراق اشکِ تمنا لیے ہوئے
نکلا ہوں اُسکے کوچے سے کیا کیا لیے ہوئے

آنکھ اپنی ہے وہ اشک کا قطرا لیے ہوئے
جو بہ رہا ہے سیکڑوں دریا لیے ہوئے

فردوس پہ ناز دامنِ صحرا کو کیوں نہ ہو
دامن میں ذرہ ذرہ ہے صحرا لیے ہوئے

تیری نگاہ میرا تماشا کیے ہوئے
میری نگاہ تیرا تماشا لیے ہوئے

اے خوشخرام ادھر بھی نظر ہم بھی بیٹھے ہیں
آنکھوں میں تیرے نقشِ کفِ پا لیے ہوئے

جو خاک ہو گیا وہ حسرت دل میں جم گیا
ہے ایک صفحہ کتنوں کا خاکا لیے ہوئے

کس کے قدم سے ہو گئی پُر نور یہ زمیں
عیسےٰ بھی اُٹھ گئے یدِ بیضا لیے ہوئے

رکھی ہے قیمت اپنی عجب جنسِ حسن نے
آتے ہیں گاہک اپنا نصیبا لیے ہوئے

الفت کا نام جرم ہے پہلے سنو تو بات
تیوری چڑھا کے آ گئے پرچا لیے ہوئے

ہے کس شہیدِ ست کی آہ کہ خلد میں
حوریں کھڑی ہیں ساغر و مینا لیے ہوئے

تنہائی میں بھی آ کے ستاتی ہے اُس کی یاد
اِک مجمعِ خیال کی دُنیا لیے ہوئے

کس بارگاہِ ناز کی جانب چلا ہے دل
امید و آرزو و تمنا لیے ہوئے

عجب ہے لگی ہے عشق کی لَو دل کا ہے یہ حال
جیسے ہو کوئی آگ کا شعلا لیے ہوئے

اہلِ نظر کھٹکتے ہیں دنیا کے باغ سے
جس گل کو دیکھیے وہ ہے کانٹا لیے ہوئے

انداز ناز غمزہ کرشمہ ادا حیا
رہتے ہیں اپنے ساتھ وہ دُنیا لیے ہوئے

یہ کون میکدہ سے چلا دیکھنا ذرا
تسبیح خواں عصا و مصلّا لیے ہوئے

پھر رہی ہیں دہر کو آنکھوں کی پتلیاں
ہستی و نیستی کا تماشا لیے ہوئے

[illegible] نے کام مرا کر دیا تمام
دنیا سے جا رہا ہوں تمنا لیے ہوئے

[illegible] دل کی تمنا کا کیا کیا
چلتے بنے وہ دل کی تمنا [illegible]

میری پیاری بہنو تم کیوں ہو!
کہ تمہارا چہرہ چھائیوں اور سیاہی سے بدشکل ہو گیا ہے

پری جمال صابن (رجسٹرڈ)

استعمال کریں جو حسن کا کان اور خوبصورتی کا مخزن ہے۔ چہرے کی تمام سیاہی اور چھائیاں بہاسے دور کر کے چہرے کو شکل محبوب کی پیتی کی مانند سرخ و سپید اور ریشم کی طرح ملائم کر دیتا ہے۔ طبی اصول سے تیار ہوتا ہے۔ مرد اس کے عاشق، لڑکے اس کے متوالے اور لڑکیاں اس کی فدائی ہیں فی بکس تین ٹکیہ ایک صابن دانی ایک روپیہ عہ

زنانہ سنگھار بکس (رجسٹرڈ)

یہ بکس عورتوں کی زینت بڑھانے اور بناؤ سنگھار کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس دھل کے خوشنما بکس میں آئینہ بھی لگا ہے۔ اس میں پانچ چیزیں اور انعام ہے (۱) پری جمال صابن ایک ٹکیہ (۲) بہار آکل شیشی ۴ تولہ (۳) پان کی بہار ایک ڈبیہ (۴) خوشبودار مسی ایک تولہ (۵) بال صفا صابن ایک ڈبیہ اور ۲ عدد سرمہ نور نظر مفت۔ فی بکس ایک روپیہ

پیرس پوڈر

سے کتنا مفید کریم کالوں کی سرخی یہ تینوں چیزیں عورتوں کی خوبصورتی اور حسن کو قائم اور خوب نکھار کر مثل حور کے بنا دیتی ہیں صبح کو لگا کر چہرہ ملائم ہوگا، پیرس پوڈر پھول سے چہرے پر لگانے سے چہرہ چاند سا ہو جائے گا اور گالوں کی سرخی گالوں پر ایسی بہار دیتی ہے کہ مزہ آجاتا ہے۔ فی سٹ ایک روپیہ چہ

حکیم محمد یعقوب خاں مالک دوا خانہ نور تن مرلی نغر اشتہار

دماغی ہیرآئل

یہ خوشبودار روغن یونانی دواؤں سے تیار کیا ہوا بالوں کو بڑھاتا ہے۔ جو آپ اگر کمزور ہو گئی ہوں اور بال گرتے ہوں یا سفید ہونے شروع ہو گئے ہوں آنکھوں کی روشنی میں کمی ہو سر میں درد رہتا ہو تو اس کا استعمال کیجیے۔ دماغی کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ فی شیشی ۱۲ عہ فی سیر چھ روپیہ

خضاب مازو

خضاب مازو بہت مشہور و معروف ہے مگر ہم نے اس کو ایسی ترکیب دی ہے کہ ممکن نہیں ایک مرتبہ لگائیے اور دو بار دھوکے بھی وہ اپنا گرویدہ نہ بنالے قیمت فی سیر پانچ روپیہ عہ

ترکیب استعمال: یہ ہے کہ ذرا خضاب بھگو دیجیے اگر جلدی ہو تو جوش دیکر ایک پانی میں گاڑھا گاڑھا لگائیے حاجت استرہ وغیرہ کی نہیں ہے کسی قسم کا پتہ رکھ کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک بندش رہے بعد خشک ہونے کے کھول ڈالیے۔ کھلی خواہ بیسن سے دھو کر کسی قدر خوشبودار روغن لگا دیجیے بال ملائم مثل ریشم اصلی رنگ کے ہو جائیں گے کوئی داغ دھبہ یا سیاہی جلد پر نہ آئیگی۔

حسن افزا

نہایت اعلیٰ درجہ کا منجن ہے جس کی خوبی صرف ایک ہفتہ لگانے سے معلوم ہو جائے گی۔ رنگ کو صاف کرتا ہے، حسن کو نکھارتا ہے مہاسوں کا دشمن ہے۔ صابن یا بیسن کے بجائے اس سے منہ دھونا چاہیے۔ قیمت فی سیر عہ چھ

منیجر کارخانہ کاظم علی نمبر ۵۳ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

مناقب غوثیہ

ہندوستان کے مشہور و معروف بزرگ حضرت سید شاہ محمد غوث گوالیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں مولانا شاہ فضل اللہ شطاری کی کتاب کا اردو ترجمہ۔ قیمت ۸ر

حیات حافظ رحمت خاں

روہیلکھنڈ کے مشہور حکمراں حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی یہ مفصل سوانحعمری سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) نے بڑی محنت سے مرتب کی اور اہتمام سے چھپوائی ہے مع پیش نام از آنریبل مسٹر سیتارام پریسیڈنٹ یو پی کونسل ہمقدمہ از مولوی نظام الدین حسن نظامی بدایونی ایڈیٹر ذوالقرنین۔ ۸ عکسی اور ایک رنگین تصویر۔ خوشنما جلد نے کتاب کا حسن دوبالا کر دیا ہے ہے

حقیقت جاپان

شیخ محمد بدر الاسلام صاحب فضلی بی اے بی ٹی (علیگ) نے جاپان کی سیاحت کے بعد یہ کتاب مرتب کی ہے جسکے حصہ اول میں سفرنامہ ہے اور حصہ دوم میں جاپان کی تاریخ جغرافیہ، اہل جاپان کی معاشرت، اُنکے مذہبی عقائد، اُنکی حکومت و سیاست، اُنکی صنعت و حرفت و تجارت، اُنکی زبان، ادبیات اور تعلیمی حالات پر تبصرہ۔ پندرہ عکسی تصویریں ہیں اور مملکت جاپان کا ایک خوشنما نقشہ۔ حجم ۴۰۰ صفحے قیمت ہے

تاریخ امریکہ

پُرانی دنیا کی تو اُردو میں متعدد تاریخیں موجود ہیں مگر نئی دُنیا کی کوئی چھوٹی یا بڑی تاریخ اُردو میں رائج نہ تھی۔ اس لیے مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے ایل ایل بی مولف سیر المصنفین و تاریخ مغربی یورپ نے انگریزی کتابوں کی مدد سے یہ تاریخ مرتب کی جو ۲۹-۱۹۲۸ء میں الناظر کے ساتھ شائع ہوتی رہی اور اب کتابی صورت میں باضافہ فہرست مضامین دیباچہ و نقشہ امریکہ پیش کی جاتی ہے۔

قیمت ۱۲ر

اسلامی کتبخانے

عہد خلفائے بنو عباس کے کتبخانوں کے متعلق اطالوی خاتون ڈاکٹر اولگا پنٹو کا قابل قدر مضمون جسے قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے باضافہ حواشی اُردو میں منتقل کیا۔ یہ مضمون الناظر میں بااقساط چھپ چکا ہے اور اب کتابی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ قیمت ۴ر

سیرت طیبہ و دیگر مضامین

مولوی قاضی الدین احمد صاحب بی اے۔ ایچ سی ایس نے جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک ہونہار فرزند ہیں حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پر چند مضامین لکھے تھے جنکا یہ مجموعہ الناظر پریس میں چھپا ہے۔ قیمت ۱۰ر

سفر سعادت۔ ادیب شہیر منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے کا روزنامچہ سفر حجاز مع تعلیقات از مولانا عبد الماجد [illegible]

تذکرہ مخزن الشعرا۔ گجرات کے مشہور شعرا کا تذکرہ مرزا غالب کے ایک معاصر کے قلم سے۔ مع مقدمہ از مولوی عبد الحق صاحب۔ قیمت عہ

تذکرہ گردیزی۔ مصنفہ شیخ علی حسین گردیزی۔ ۱۱۶۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور اس میں ابتدائی دور کے اساتذہ اردو کے حالات فارسی میں اور ان کے کلام کے نمونے ہیں۔ مع مقدمہ از مولوی عبد الحق صاحب۔ قیمت عہ

تذکرہ ہندی یعنی استاد مصحفی کا تذکرہ شعرائے اردو تصنیف ۱۲۰۹ھ جو پہلی بار شائع ہوا ہے۔ مع مقدمہ از مولوی عبد الحق صاحب قیمت ع

تاریخ ادبیات ایران حصہ اول پروفیسر براؤن کی مشہور کتاب فارسی ادب کی تاریخ میں۔ مترجمہ سید سجاد حسین ایم اے بعلم اردو جامعہ عثمانیہ۔ قیمت للعہ

اردوئے قدیم (یا) تاریخ زبانِ اردو جس میں زبان اردو اور اس کی نظم و نثر کی مفصل تاریخ، اور عہد بہ عہد کی ترقیوں کا تذکرہ ابتدائی زمانے سے عالمگیر کے عہد آخر تک شعرا و مصنفین کے صحیح حالات ہیں از مولانا حکیم شمس اللہ قادری۔ قیمت عہ

بہارِ گلشنِ کشمیر

(۲ جلد)

ضخیم تذکرے کے ۱۰۰۰ سے زائد صفحات میں ۴۰۰ کے قریب کشمیری الاصل ادبا و شعرا کے حالات اور منتخب کلام ہے۔ سو سو تصاویر دینے کے علاوہ ساری کتاب دو رنگ میں چھپی ہے۔ کتابت، طباعت، جلد سب دلکش۔ قیمت صرف عہ

باغ و بہار۔ میر امن دہلوی کی کتاب کو مولوی عبد الحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے اپنے محققانہ مقدمہ اور فرہنگ الفاظ و محاورات کے ساتھ شائع کیا ہے۔ قیمت عہ

نوادر۔ مرزا محمد عسکری بی اے مترجم تاریخ ادب اردو نے اس کتاب میں ہر طبقہ کے اکابر رجال کے لطائف و ظرائف جمع کیے ہیں شروع میں شیخ ممتاز حسین عثمانی ایڈیٹر اردو مہینہ کی کیفیت اور مرتب کا مقدمہ

مادو پروین۔ میر ولی اسد بی اے ایل ایل بی شائع دیوان حافظ و خیام کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ۱۲ر

طوفانِ تبسم۔ مشہور مزاحیہ نگار شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت عہ

بہترین انشا پرداز۔ رسالہ ناظر کی طرف سے انعامی مقابلہ اس موضوع پر کرایا گیا تھا کہ آزاد و نذیر احمد، حالی و شبلی میں بہترین انشا پرداز کون تھا اور کس نے اردو کی سب سے زیادہ خدمت کی؟ اس موضوع پر جن اہل قلم نے طبع آزمائی کی ان سب کے مضامین کا یہ لائق دید مجموعہ ہے۔ قیمت عہ

مولانا شبلی۔ مجموعہ ان کا جو مضمون پر انعام دیا گیا ۱ر

ریاست۔ حکیم افلاطون کی مشہور عالم تصنیف "ری پبلک" جو اُس کے سارے فلسفہ اور عمر بھر کے تجربہ کا نچوڑ ہے اُس کا قابل دید ترجمہ۔ از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں پرنسپل جامعہ ملیہ قیمت للعہ

رموز حکمت۔ حکمت و فلسفہ کا تفصیلی بیان قدیم فلاسفہ کے پہلو بہ پہلو علوم جدیدہ کے انکشافات از مولوی حکیم محمد شریف مصطفیٰ آبادی قیمت سے،

مشاہدات سائنس۔ سائنس کے مختلف شعبوں پر بڑے مفید و دلچسپ مضامین۔ از مسٹر عمر حسنی قیمت ہ

دختر فرعون
مشہور جرمن ماہر علوم مصریات جارج ایبرز کی قابل دید کتاب کا ترجمہ از ڈاکٹر لطافت حسین خاں آئی ایم ایس جس کے مطالعہ سے مصر و ایران کا تمدن بطرز معاشرت اور وہاں کے باشندوں کی تہذیب، شائستگی کا حال معلوم ہوگا۔ قیمت للعہ،

موازنہ ہلال و صلیب۔ از عبد السمیع خاں نکہت آبی شاہ جہاں پوری جس میں یورپین مصنفین کے بیانات کی رو سے عہد اسلامی کے تمدنی و تعلیمی کارناموں کا عہد مسیحی کے تمدن و تعلیم سے موازنہ کرکے مسلمانوں کی فوقیت دکھائی گئی ہے۔ قیمت ہ

ارتقا۔ مسئلہ ارتقا پر سائنس اور فلسفہ دونوں اعتبارات سے عالمانہ بحث۔ از مولوی مشتاق احمد زاہدی عمہ

تاریخ فلسفہ اسلام۔ ہالینڈ کے مشہور مستشرق ڈی بوئر کی کتاب کا ترجمہ از ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے جس میں اُن تمام تحقیقات کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے جو یورپ کے مستشرقین اب تک مسلمان فلاسفہ کی موشگافیوں اور فلسفیانہ سنجیوں کے بارے میں کر سکے ہیں۔ عہ،

نفسیات ترغیب۔ (از پروفیسر تاج الدین احمد) عمل ترغیب کی ماہیت نفسی کیا ہے؟ اور اس کو کیونکر کسی نفس کی ترغیب ہوتی ہے؟ یا دوسروں کو وہ کیسے ترغیب دیتا ہے؟ مبادیات و موانع ترغیب اور ترغیب کے صحیح مواقع استعمال، غلط رجحانات اور باطل ترغیبات سے بچنے کی تدابیر وغیرہ کے متعلق فلسفۂ جدیدہ کی تعلیمات قیمت عہ،

ریڈیو
پروفیسر تاج الدین ایم ایس سی نے نظریۂ اضافیت کے بعد اب بے تار کی پیام رسانی کے علم پر یہ قابل قدر کتاب لکھ کر زبان اردو کو مالا مال کیا ہے۔
قیمت سے ہ

طالب العلم کی زندگی (از آغا محمد صفدر بی اے وکیل) طالب علموں کو اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھیلنے کودنے، کھانے پینے، لکھنے پڑھنے، سونے جاگنے، نہانے دھونے، ملنے جلنے غرضکہ ہر کام اور ہر موقع کے لیے مفید ہدایات کی ہیں۔ قیمت ۱۲ار

مقدمہ ابن خلدون (۳ جلد) فلسفہ تاریخ پر بہترین کتاب عمہ،

کلام الملوک - پروفیسر سید ضیاء خاں نے تیموری شاہزادوں کے اردو کلام کا یہ انتخاب مرتب کیا ہے۔ قیمت ۱۰ر

صہبائے سبیل - منشی سکھ دیو پرشاد بسمل الہ آبادی کا کلام قدیم و جدید رنگ میں۔ مع مقدمہ از مولانا ابو سعادہ و مجنوں نے تصویر اور خوشنما جلد نے اس کی طباعت کا حسن دوبالا کر دیا ہے۔ قیمت للعہ

مطلع انوار - منشی مہاراج بہادر برق دہلوی بی اے کی نظموں کا دلآویز مجموعہ۔ مع مقدمہ از حکیم موہن لال رواں و دیباچہ از آسی گونڈوی قیمت عہ ر

دنیائے راز - ابو الفاضل آزاد جالندھری کی قدیم و جدید طرز کی مختصر نظموں کا منتخب مجموعہ۔ ۱۰ر

زنگاری بیگم - فرانسیسی زبان کے مشہور ڈرامہ آسیڈی ازیور" کا یہ منظوم ترجمہ انگریزی خلاصہ کے توسط سے مشہور شاعر و مضمون نگار مرزا جعفر علی خاں اثر بی اے لکھنوی نے کیا ہے۔ کتاب خوشنما اور مجلد ہے قیمت ۱۲ر

تابش خیال - افسر صدیقی امروہوی کا مجموعہ غزلیات مع مقدمہ از اسرار احمد کروئی و تصویر مصنف قیمت عہ ر

تاج سخن - نواب فصاحت جنگ جلیل کا دیوان معظم۔ قیمت للعہ

معراج سخن - نواب فصاحت جنگ جلیل کا نعتیہ کلام - قیمت ۱۲ر

کلام جلیل - نواب فصاحت جنگ جلیل کے اعلیٰ کلام کا انتخاب - قیمت ۸ر

فیضان شوق - منشی احمد علی شوق قدوائی کا دیوان جس میں غزلیات، قطعات و رباعیات ہیں۔ مع مقدمہ از مسٹر معین الدین بیرسٹر۔ قیمت ۱۲ر

دیوان اثر - خواجہ میر درد کے بھائی سید محمد میر اثر کا کلام۔ جو پہلی بار چھپا ہے مع مقدمہ از مولوی تقی الدین احمد و تعارف از پروفیسر آغا حیدر حسین دہلوی قیمت عہ ر

لمعات اختر - قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی دلچسپ نظموں کا مجموعہ - قیمت ۸ر

نغمہ زار - پنجاب کے نامور اور مشہور شاعر ابو الاثر حفیظ جالندھری کا مجموعہ کلام - قیمت ۱ عہ

پیام روح - مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی بی اے کی ۱۰ دلآویز نظموں کا مجموعہ - قیمت ۔ ے ر

صحیفۂ ولا - عزیز لکھنوی کا دیوان مناقب و قصائد بڑے اہتمام سے چھپا ہے۔ قیمت ۔ ے ر

مرأة الشعر

شعر کی حقیقت و ماہیت اُسکے اجزائے ترکیبی اُسکے علوم معانی و بیان وغیرہ اور اسکے محاسن و معائب پر اُردو میں اپنی قسم کی پہلی اور قابل قدر کتاب ہے

از پروفیسر عبد الرحمٰن قیمت ۔ عہ ر

مہاتمایان ہند - ہندوستانی پیغمبروں سری کرشن جی، گوتم بدھ کے سوانح حیات اور ان کی تعلیمات - نیز شنکر آچاریہ، وبلبھ، رامانند اور کبیر داس کے حالات - عہد

امرائے ہنود - عہد اکبری کے نامور ہندو امراء کے قابل دید حالات از مولوی سید احمد مارہروی - قیمت ۱۲/

سیر الصحابہ جلد ششم - مرتبہ مولوی حاجی معین الدین ندوی جس میں امام حسن و حسین علیہما السلام اور حضرت امیر معاویہ و حضرت عبد اللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہم کے سوانح، اخلاق و عقائد اور ان کے مذہبی، علمی، سیاسی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، اور تمام پیچیدہ مذہبی و سیاسی مباحث کو تاریخ کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے - قیمت ۲/

سیر الصحابہ جلد ہفتم جس میں ایک سو پچاس صحابہ کے حالات ہیں جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا یا اس سے پہلے مشرف باسلام ہوئے لیکن ہجرت نہ کر سکے یا عہد رسالت میں صغیر السن تھے - مرتبہ مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت ۲/

ترجمہ تاریخ فرشتہ - ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں، حکومتوں اور مشائخ کے مستند حالات ۲ جلد عمہ/

حیات احمد بن حنبل - امام حنبل کے حالات زندگی، معتقدات، انکی عظیم الشان دینی خدمات اور خلق قرآن کے مسئلہ میں حکومت کے جبر و استبداد کے مقابلہ میں ان کی عجیب و غریب استقامت - یہ سب مولانا عزالدین پھلواروی معلم دار العلوم ندوۃ العلماء کے اس رسالہ میں درج ہے - قیمت ۲/

سیرۃ الغازی - مصطفےٰ کمال پاشا کے سوانح اور تحریک آزادی اناطولیہ کی مکمل و مستند تاریخ، مولفہ امین محمد سعید و کریم خلیل ثابت مصری کا ترجمہ - از مولوی غلام ربانی لودی - قیمت عہ/

سیرت محمد علی

مولانا محمد علی مرحوم کے سوانح اور کارنامے قومی و ملکی خدمات کا بیان - مرتبہ مولوی رئیس احمد جعفری - حجم ۶۰۰ صفحے مع تصاویر - قیمت ۲/

افغان بادشاہ غازی امان اللہ خاں سابق تاجدار افغانستان کے چشم دید حالات اور اُن کے عظیم الشان کارنامہ حکومت - محمد حسین خاں صاحب بی اے سابق ڈائرکٹر تعلیمات افغانستان کے قلم سے جو ۱۲ سال تک افغانستان میں مقیم رہے تھے

قیمت عہ/

سیرۃ رسول اللہ

نامور فاضل اور مشہور ادیب جناب سید نواب علی رضوی ایم اے پرنسپل بہاء الدین کالج جونا گڑھ مصنف تذکرۃ المصطفےٰ ومعارج الدین وغیرہ نے احادیث، سیر قدیم، مغازی کی مدد سے حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پاک میں یہ قابل قدر کتاب لکھی ہے - کتابت و طباعت نہایت دیدہ زیب - حجم ۴۰۰ صفحے

قیمت ۲/

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

کلیات خواجہ عزیز لکھنوی ۔ خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی آخری دور کے فارسی شعرا میں امتیازِ خاص رکھتے تھے۔ انکا کلیات انکے صاحبزادے خواجہ وصی الدین صاحب نظیر ڈپٹی کلکٹر نے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ قیمت صہ

دیوان گرامی ۔ حضرت گرامی دربار آصفیہ کے نامور فارسی شاعر تھے۔ انکا دیوان قابل دید ہے۔ قیمت ۲/

رباعیات گرامی ۔ حضرت گرامی کی قابل قدر رباعیات کا مجموعہ۔ قیمت ۴/

سب رس ۔ ملا وجہی دکنی کی ۱۰۴۵ھ کی لکھی ہوئی بے مثل داستان کتاب مع مولوی عبد الحق صاحب کے مبسوط محققانہ مقدمہ اور متروک الفاظ کی فرہنگ کے۔ قیمت للعہ

جنگنامہ عالم علیخاں ۔ ایک دکنی شاعر کی نایاب کتاب ۔ جو پہلی بار چھپی ہے۔ قیمت ۶/

داستان عجم ۔ (حصہ اول) شاہنامہ فردوسی کے ایک دو بہترین قصوں کو اردو لباس پہنایا گیا ہے۔ ۲/

شعرستان ۔ سید محمود اعظم فہمی مترجم تاریخ ملل قدیمہ کی نظموں کا مجموعہ۔ قیمت عہ

مرأۃ المثنوی

مولانا جلال الدین رومی قدس اللہ سرہ العزیز کی مثنوی معنوی کے قصص و حکایات کی تلخیص علم و معارف کی تفسیر اور اشعار مشتمل بر آیات قرآن و متون احادیث نبوی کی ترتیب ۔ از قاضی تلمذ حسین ایم اے (علیگ) رکن دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی مع سرنامہ از مسٹر نکلسن ۔ قاضی صاحب نے سالہا سال کی عرق ریزی و دماغ سوزی کے بعد مثنوی مولانا روم کا مطالعہ آسان بنا دیا ہے ۔ حجم ۱۱ صفحے ۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت عہ

اردو گلستاں ۔ شیخ سعدی کی گلستاں کا اردو ترجمہ قابل دید ہے۔ کیونکہ بقول مولوی عبد الماجد بی اے ایڈیٹر سچ "فاضل مترجم نے یہ کوشش کی ہے کہ حتی الامکان شیخ کا صرف مفہوم ہی اردو میں نہ آنے، بلکہ اُن کی طرز ادا، نشست الفاظ، شستگی و سلاست بیان ہو بہو اردو میں منتقل ہو جائے ....

مترجم کی یہ کوششیں بڑی حد تک، بلکہ کہنا چاہیے کہ قابل رشک حد تک کامیاب ہیں"۔ حجم ۴۹۶ صفحے قیمت عہ

ترکوں کی اسلامی خدمات اور انکی زبان وادبیات ۔ ڈاکٹر جوزف جرمانس پروفیسر بوڈاپسٹ یونیورسٹی نے جامعہ عثمانیہ میں تین لکچر دیے تھے۔ انکا ترجمہ پروفیسر سید وہاج الدین صاحب نے کیا ہے۔ قیمت عہ

معین الآثار ۔ مولفہ مولوی معین الدین احمد اکبرآبادی جس میں آگرہ کی مشہور و معروف عمارت روضۂ تاج محل کی مبسوط تاریخ اور شاہجہاں کی چہیتی بیگم ممتاز محل ارجمند بانو بیگم کی سوانحعمری کے علاوہ دیگر عمارات ملحقہ کے حالات ہیں۔ کتاب متعدد عکسی تصاویر اور نقشہ جات سے مزین ہے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بنام جہاں دار جاں آفریں

نمبر ۲ جلد ۳۸ اگست سنہ ۱۹۳۴ء

بنی اسرائیل کا دورِ شباب

(از جناب الحاج منشی امیر احمد صاحب علوی)

جب بنی اسرائیل مصر کی غلامی اور صحرا و ریگستان کی سرگردانی سے نجات پاکر بحیرۂ روم کے شرقی ساحل تک پہونچے اور دشمنوں سے لڑ بھڑ کر یروشلم کے قریب ایک مختصر خطۂ ارض پر قابض ہو گئے۔ ان کے مردان نبرد آزما کی تعداد دو لاکھ سے متجاوز تھی۔ مگر وہ چاروں طرف صف شکن حریفوں سے گھرے ہوئے تھے۔ جو موقع پاکر دلیرانہ حملے کرتے اور ان کا مال و متاع لوٹ لے جاتے تھے۔

اپنی آزادی اور خودمختاری کی حفاظت کے لیے انھوں نے ایک فہیم اور جسیم جوان ساؤل کو جسے عرب کے تذکرہ نویس طالوت کے نام سے یاد کرتے ہیں اپنا حاکم قرار دیا۔ اور اس طرح بنی اسرائیل میں حکومت اور سلطنت کا آغاز ہوا۔

اسی بادشاہ ساؤل کے عہد حکومت میں ایک دولتمند یہودی مرد کی نوجوان عورت پر عامل شہر فریفتہ ہو گیا اور اسکو اپنے دام تزویر میں گرفتار کرنے کی تدبیریں کرنے لگا۔ نیک سرشت عورت نے جب کوئی صورت مخلصی کی نہ دیکھی تو اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے اس شہر سے فرار ہونے کی نیت کی۔ تب تمام زر و جواہر جو اس کے پاس تھا، گھڑوں میں بھرا اور ان ظروف کے بالائی حصوں کو شہد سے ڈھانک کر اپنے شوہر کے ایک دوست کے پاس لے گئی۔ معتبر گواہوں کے سامنے وہ شہد سے بھرے ہوئے گھڑے دوست کے پاس امانت رکھوا کر وطن کو الوداع کہی اور کسی دوسری بستی میں مصیبت کے دن کاٹنے لگی۔

کچھ دنوں کے بعد دوست کو کسی تقریب کے موقع پر شہد کی ضرورت ہوئی اور اس نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ وہ بقدرِ ضرورت شہد فراہم شدہ عورت کے ظروفِ امانت سے نکال لے۔ ملازم شہد نکالنے گیا، تو دیکھا کہ گھڑوں میں سونا بھرا ہے، اوپر شہد کی ایک ہلکی تہہ ہے اور نیچے سب سونا ہی سونا ہے۔ متعجب ہو کر مالک کو خبر دی۔ عورت کی آواز اور سونے کی جھنکار سے ایمان بچانا دشوار ہے، دوست کی نیت میں فتور آیا، اس نے گھڑوں سے سونا نکال لیا اور بازار سے شہد خرید کر کے وہ ظروف بھروا دیے تاکہ کسی وقت امانت طلب کی جائے تو ظروف فی الفور حاضر کر دیے جائیں۔

ایک مدت کے بعد مالک بہ اقتضائے الٰہی فوت ہو گیا اور جب عورت اپنے دیس کو واپس آئی دوست کے پاس امانت کی جب لینے آئی تو دیکھا کہ سونا اڑ گیا صرف شہد گھڑوں میں بھرا ہے۔ بدحواس ہو کر گمشدہ مال کا مطالبہ کیا۔ دوست نے لاعلمی ظاہر کی۔ ادھر اصرار تھا ادھر انکار۔ بات کو مثلِ زلف طول ہوا۔ معاملہ عدالت تک پہنچا۔ قاضی نے ثبوت مانگا۔ عورت کے گواہوں نے بیان کیا کہ ہمارے سامنے شہد کے گھڑے سپرد کیے گئے تھے اور سونے کا کچھ ذکر نہ تھا۔ نالش خارج ہو گئی۔ عورت آزردہ ہو کر بادشاہ کے پاس فریاد لے گئی لیکن سائل اور اس کے مصاحبین کچھ امداد نہ کر سکے کیونکہ مدعا علیہ حوصلے سے انکار کرتا تھا۔ اور عورت کے پاس کوئی شہادت نہ تھی۔ مایوس ہو کر محل شاہی سے واپس آئی۔ راستہ میں چند لڑکے کھیل رہے تھے۔ ان میں سے ایک کو اس مظلومہ کی آزردگی پر رحم آیا۔ حال پوچھا۔ بیان میں صداقت کی بو محسوس ہوئی تو اس معاملہ کی تفتیش کرنے اور مال کا سراغ لگانے کا وعدہ کیا بشرطیکہ بادشاہ سے اس رضاکارانہ خدمت کی اجازت ملے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے عورت اتنی آس پا کر دوبارہ محل شاہی میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ ایک غریب لڑکا میرے مال کا پتہ چلانے کا وعدہ کرتا ہے بشرطیکہ فرمانِ سلطانی سے وہ تحقیقات کرنے کا مجاز و ماذون ہو۔ بادشاہ کو حیرت ہوئی مگر عورت کی آزردگی اور دل شکستگی پر ترس کھا کر اجازۂ مطلوبہ عطا کر دی۔

اس دانشمند لڑکے نے بادشاہ کی اجازت سے متنازعہ گھڑے دربارِ عدالت میں منگوائے اور فریقین کے مواجہہ میں انکو خالی کرا کے توڑ ڈالا۔ جب وہ ظروف شکست ہوئے تو انکے پیندوں میں سونے کے ٹکڑے شہد سے آلودہ پائے گئے۔ حرص و طمع کے ہیجان سے دوست کی آنکھوں میں چربی چھا گئی تھی۔ سونا نکالنے کی عجلت تھی اور عیب چھپانے کے لیے گھڑوں کو شہد سے پُر کرنے کی جلدی۔ اس وقت یہ خیال نہیں آیا کہ ظروف کے زیریں سطح میں شاید کچھ زر و جواہر چپک کر رہ گیا ہو۔ یہ فروگذاشت

تین ہزار برس جب سموایل جیسے قدسی صفات بزرگوں نے اسیرانِ جنگ کو فدیہ لیکر چھوڑ دیا تھا تو باوجود رحمۃ للعالمین کے نائبِ عاطفت کے معتوب ہوئے " لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ"۔ ساول نے بھی "فرمانِ ربی کو پسِ پشت کر کے وہ کام کر گزرا جو خدا کی نظر میں برا تھا" اور عمالقہ کو نیست و نابود نہیں کیا کیونکہ بغاوت ہو سکتی تھی؟ "خداوند سوختنی قربانیوں اور ذبیحوں سے اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا اس بات سے کہ اس کا حکم مانا جائے کیونکہ فرماں برداری قربانی سے اور اطاعت مینڈھوں کی چربی سے بہتر ہے کیونکہ بغاوت اور جادوگری برابر ہیں اور سرکشی ایسی ہی سخت خطا ہے جیسی کہ مورتوں اور بتوں کی پرستش ۔

ساول بارگاہِ ایزدی سے مردود ہوا اور خداوند کی طرف سے ایک بری روح اسے ستانے لگی" مصاحبوں نے بادشاہ کا خفقان دور کرنے کے لیے ایک ایسے مطرب کی تلاش شروع کی جو بربط بجانے میں استاد ہو اور اختلاجِ قلب کے وقت بادشاہ کا دل گا بجا کر بہلایا کرے ۔

جستجو سے معلوم ہوا کہ "یسّی بیت لحمی کا بیٹا بجانے میں استاد ہے ۔ قاصد روانہ کیے گئے کہ اس مغنیِ بے بدل کو دربار میں لائیں ۔ یسّی نے بیٹے کو روانہ کرنے کے لیے ایک گدھا جس پر روٹیاں لدی تھیں، شراب کا ایک مشکیزہ اور بکری کا ایک بچہ دے کر شاہی محل میں بھیج دیا ۔ بادشاہ کو حقانی مطرب کا گانا بجانا بہت پسند آیا ۔ اس کی خوبصورت وضع اور زیرکی پہلے ہی سے دل پر نقش تھی، اب موسیقی میں کمال دیکھ کر سب باتیں نقش بدیوار بن گئے اور وہ بکریاں چرانے والا سلطان کا منظورِ نظر ہو گیا ۔ روزانہ بادشاہ کے حضور میں تھوڑی دیر گا بجا کر دل کو مسرور کرتا، وہ بعد ازاں اپنے گلہ کی نگہداشت کے لیے جنگل کی طرف چلا جاتا تھا ۔

بنی اسرائیل کا بادشاہ غضبِ خداوندی سے ملولِ دل میں مبتلا ہوا ۔ حکومت کے بازو سست ہوئے ۔ عمالقہ گھات میں تھے ۔ اپنی پراگندہ شدہ شیرازہ درست کر کے اسرائیلیوں پر حملہ آور ہو گئے ۔ ایک پہلوان "جالوت" نام اس کا سپہ سالار تھا ۔ اس کا قد چھ ہاتھ اور ایک بالشت تھا ۔ اس کے سر پر پیتل کا خود تھا اور وہ پیتل ہی کی زرہ پہنتا تھا جو وزن میں پانچ ہزار مثقال کی تھی ۔ اس کی ٹانگوں پر پیتل کے ساق پوش تھے ۔ شانوں پر پیتل کی برچھی تھی ۔ بھالے کی چھڑ ایسی تھی جیسے شہتیر ۔ نیزے کا پھل چھ سو مثقال لوہے کا تھا ۔ اس نے اعلان کیا کہ اگر کوئی اسرائیلی اس سے لڑے اور اس کو قتل کر ڈالے تو سب عمالقہ اس کے خادم ہو جائیں گے اور اگر وہ اسرائیلی قتل ہو جائے تو سب بنی اسرائیل عمالقہ

کی غلامی قبول کریں۔ ساؤل کے لشکر نے پہلوان کا رجز سنا تو ہراساں ہوئے اور کسی جوان مرد کو ہمت نہ ہوئی کہ اُس کو پکڑ کا مقابلہ کرے

بادشاہ نے اپنے محکوموں کی ہمت افزائی کے لیے اشتہار دیا کہ جو اسرائیلی اس پہلوان کو قتل کرے وہ بادشاہ کا داماد بنایا جائے گا۔ لیکن کسی سورما نے شاہزادی کو اپنی جان پر فوقیت نہ دی اور یہ سودا بھی پسند نہ ہوا۔ ہر طرف سے بنی اسرائیل پر لعن طعن کی بوچھاڑ تھی۔ عمالقہ بڑھ بڑھ کر گالیاں دیتے تھے۔ اسرائیلی گردن جھکائے کھڑے تھے اور آنکھ اٹھانے کی مجال نہ تھی۔

پیغمبر وقت حضرت شموئیل کو بارگاہ قدس سے حکم ملا کہ وہ "اشیا" کے ایک لڑکے کو حکومت بنی اسرائیل کے لیے منتخب کریں۔ اشیا کے بروایتے سات اور بروایتے بارہ لڑکے تھے۔ وہ سب درگاہِ نبوت میں ملاحظہ کے لیے طلب کیے گئے تا کہ جو علامات بتائی گئی تھیں وہ ان میں سے کسی میں نظر آ جائیں۔ پیغمبر کے پاس ایک پیالہ مقدس روغن سے بھرا ہوا تھا اُس میں جوش نہ آیا۔ اُن کے ہاتھ میں ایک خلعت تھا وہ کسی کے قد پر راست نہ ہوا۔

وحی خداوندی میں خطا کا امکان نہ تھا۔ پیغمبر کو یقین ہوا کہ غالباً "اشیا" کے سب لڑکے ہنوز حاضر نہیں ہوئے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک لڑکا اور بھی ہے مگر وہ بھیڑ بکریاں چراتا ہے اور شرفا و امرا کی مجلس میں بیٹھنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ پیغمبر نے ارشاد کیا کہ "اُسے بلا بھیج۔ کیونکہ جب تک وہ یہاں نہ آئے ہم بیٹھیں گے نہیں"۔ وہ بیٹا بھی طلب کیا گیا۔ وہ سرخ رنگ، خوبصورت اور حسین تھا۔ اُس کے آتے ہی روغن مقدس میں جوش آیا اور خلعت سرفرازی اُس کے قامت پر درست ہوا۔

باپ کو کنیز زادہ کی اس بے حد عزت افزائی پر تعجب ہوا مگر "اشیا" کی محبوب بی بی "نازبت" یہ مسرت انگیز بشارت سن کر باغ باغ ہو گئی اور اٹھائیس برس کے بعد اپنا راز فاش کیا کہ اُس کے شوہر نے جوانی کی مستی میں ایک حسین خواص پر تصرف کرنا چاہا تھا مگر بی بی کی غیرت نے یہ بات گوارا نہ کی۔ اُس نے کنیز کا بھیس بنا کر شوہر کو دھوکا دیا اور حاملہ ہو گئی۔ جب لڑکا پیدا ہوا تو اُسی خواص کو پرورش کے لیے دیا گیا اور اُسی کا فرزند مشہور ہوا۔ باپ اُس کو پرستار زادہ سمجھتا رہا۔ اور لڑکے کی تعلیم و تربیت کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ مگر آج معلوم ہوا کہ وہ انجب نہیں، نجیب الطرفین تھا۔ اسی کی طرف زبور (باب ۵۱ آیت ۵) میں اشارہ ہے کہ "میں نے بدی میں صورت پکڑی، اور میں گناہ کی حالت میں ماں کے پیٹ میں پڑا"۔

"ایلاہ" کی وادی میں ساؤل کا لشکر خیمہ زن ہے اور اسکے مقابل افسدمیم کے میدان میں فلسطینوں کے ڈیرے ہیں۔ ایک طرف پہاڑ پر "فلستی" اور دوسری طرف بنی اسرائیل استادہ ہیں۔ جالوت دیوانہ نعرے بل من مبارز کے لگاتا ہے اور اسرائیلیوں پر فضیحت و ذلت کے بادل برساتا ہے لیکن کسی شیر دل کو اسکی گرج اور تڑپ کا جواب دینے کی مجال نہیں ہوتی۔ اسی خوف و رجا کی مصیبت بھری ساعتوں میں چالیس دن گزر چکے ہیں فلسطیوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا ہے۔ جالوت عنقریب جنگ مغلوبہ کا حکم دے کر بنی اسرائیل کا خیمہ و خرگاہ تاراج کرانے والا ہے کہ مژدے از غیب بروں آید و کارے کند "اشیا" کا مقبولِ خداوند صاحبزادہ اپنے باپ کے گھر سے بھائیوں کی خیریت دریافت کرنے کے لیے جنگ گاہ میں پہنچتا ہے جالوت کا اعلان، طالوت کا وعدۂ انعام، اور دینی اقوام کی کم ہمتی و بزدلی دیکھ سن کر غضبناک ہوتا ہے اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر جدال و قتال کی اجازت طلب کرتا ہے۔

ساؤل گوسفند کو گرگ اور مور ضعیف کو پیل دماں کے مقابلہ سے منع کرتا ہے مگر جسکے سر پر ستارۂ بلندی چمکتا ہو وہ موت سے کیا ڈرے۔ اسی شجاعت و دلاوری کے پکے عزم نے آخر بادشاہ کو حرب و ضرب کی اجازت عطا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

ساؤل نے اپنی فولادی زرہ عنایت فرمائی تو باوجود بادشاہ کی مشہور جسامت کے اس صاحب اقبال کے تن پر قدرتِ خداوندی سے درست ہوئی۔ اور اس خرقِ عادت نے ساؤل کو یقین دلایا کہ جالوت کا قاتل دستیاب ہو گیا مگر اُسی کے ساتھ دل کو سب منزل میں حسد کا رنج ہوگا - مؤیدِ من اللہ نے نورِ فراست سے بھانپ لیا دست بستہ عرض کی کہ ہمیشہ فلاخن سے ہتھیار لڑا ہے اور تیروں کو قوتِ بازو سے زیر کیا ہے لہذا بادشاہ کے دشمن سے بھی تنِ تنہا مقابلہ کرے گا

زرہ سلطانی اُتار کر رکھ دی اور رزم گاہ کی طرف قدم بڑھایا۔ راہ میں پانچ سنگریزے پڑے تھے۔ اُنکو اٹھا کر اپنے توبڑے میں رکھا اور نیم عریانی کی وردی پہنے، ملک و ملت کے آلاتِ حرب لگائے، جالوت کے سامنے پہنچا تو اُس کوہ پیکر کے بدن پر تھرتھری پیدا ہو گئی۔

جالوت بدحواس ہو کر کہنے لگا کہ "میں تیرا گوشت کھیت کے مویشیوں کو کھلاؤں گا" اور یہ سُدھ نہ رہی کہ کھیت کے مویشی گوشت نہیں کھاتے ہیں حریف کا رجز سن کر جالوت کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ اور اسکے دست و بازو میں قوت نہ رہی کہ حملہ پر وار کرے۔ مجاہد نے تیر فلاخن میں رکھ کر دشمن کی پیشانی کو نشانہ بنایا۔ جالوت زمین پر مُنہ کے بل گرا فاتح کے پاس تلوار بھی نہ تھی۔ دشمن کی شمشیر اُسی کے میان سے کھینچی اور بچھو کے ڈنک سے بچھو کا سر کاٹ لیا۔

[illegible] نے دیکھا کہ اُنکا پہلوان ایسی ذلت سے مارا گیا تو خوف زدہ ہو کر بھاگے۔ اسرائیلیوں نے تعاقب کیا اور اُنکا مال و متاع لوٹ لیا۔

جب بنی اسرائیل دشمن کو بھگا کر شہر کے قریب پہونچے تو اسرائیلی عورتیں گاتی اور ناچتی ہوئی، دفوں، خوشی کے نعروں اور باجوں کے ساتھ "بادشاہ کے استقبال کو نکلیں اور آپس میں کہتی تھیں کہ "ساؤل نے ہزاروں کو مارا اگر اس جوانمرد نے لاکھوں کو مارا" بادشاہ کو یہ بات بُری لگی اور کہنے لگا کہ ان عورتوں نے میرے لیے "ہزاروں" اور اس حقیر شخص کے لیے "لاکھوں" کا لفظ استعمال کیا" اب سوا بادشاہی کے اسے کیا ملنا باقی ہے؟ حسد کا یوں پہلے ہی آگ بھڑکا تھا اُس میں پھول پھل آنے لگے!!

حاسد بادشاہ اُس سرفروش جاں نثار کو "حقیر" سمجھا لیکن شہنشاہِ قضا و قدر کی سرکار سے اُس کو بہت ہی بڑی عزت و توقیر ہوئی۔ تاریخ یہود کا زریں ورق اُسکے تراشۂ فتوحات سے جگمگا رہا ہے۔ یہ تارا اس ملت موسوی کا نگلہ بان سلطان کی مدح و ستائش سے الواح زبرجد پر مینا کاری کر رہے ہیں! مہ بیت المقدس کے عجاز عیسوی "صاحب زبور" کی حکمت و دانشمندی، معرفت و حق شناسی پر نیازمندی کے نقش و نگار بنا رہے ہیں!! اور حلقہ گوشان آستانۂ محمدی "حضرت داؤد" کی بارگاہ رسالت میں صلوٰۃ و سلام کے ہار پھول نذر کیا کرتے ہیں!!!

یہ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تِل میں ہے دکھائی دیتا

وعدہ آسان ہے وعدہ کی وفا مشکل ہے۔ نحوست و ہلاکت کے گِدھ جس وقت طالوت کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ ننگ و غیرت نے دنیا نظروں میں تیرہ و تار کر دی تھی اور خدام و مصاحبین کی کثیر جماعت میں کوئی اپنا مددگار نہیں ملتا تھا تو اُس نے جالوت کے قاتل کو انعام و اکرام سے مالامال کرنے اور بیاہ کر داماد بنانے کا وعدہ کیا مگر جب مصیبت کی گھڑی ٹل گئی۔ جالوت قتل ہوا اور فلسطینیوں کا شر دفع ہو گیا تو بادشاہ کی نیت بگڑی۔ حسد کے شعلے اُسکے سینے میں مشتعل ہوئے اور قاتلِ دشمن کو داماد بنانے میں لڑکوں کے وراثتِ آبائی سے محروم ہو جانے اور خاندان سے سلطنت نکل جانے کا خطرہ نظر آنے لگا۔ دوسرے ہی دن اپنے جاں نثار کو قتل کرنے کی تدبیر کی اور اُس کو بھالے سے زخمی کرنا چاہا۔ مگر وار خالی گیا۔ طعنِ خلائق سے ڈر کر اپنی بیٹی "میرب" سے نکاح ٹھیرایا، مگر جب شادی کی ساعت آئی تو لڑکی دوسرے شخص کو بیاہ دی۔ احسان اشراف نے اس غلط وعدہ کو کمال

معیوب سمجھا۔ رعایا کی چھینی سے ہراساں ہو کر اپنی چھوٹی بیٹی "میکل" سے شادی کرنے کا اقرار کیا بشرطیکہ وہ ایک سو فلستیوں کو قتل کرے اور اُن کی "کھلڑیاں" لا کر شہزادی کا مہر ادا کرے۔ موئدمِن اللہ نے یہ شرط بھی پوری کی اور فلستیوں کی "دو سو کھلڑیاں" لایا۔ قوم کے جوش و خروش سے مجبور ہو کر بادشاہ نے "میکل" کا نکاح حسبِ وعدہ کیا مگر چند بدمعاش متعین کر دیئے کہ وہ تاک میں رہیں اور موقع پا کر داؤد کو مار ڈالیں۔ لیکن سب تدبیریں اُلٹی ہوئیں۔ کبھی میکل نے اور کبھی اُسکے بھائی "یوناتن" نے بار ہا خطرے سے بچا لیا اور وہ برگزیدہ و محسود محلِ شاہی سے فرار ہو کر حضرت شموئیل کے پاس پہونچا اور اُن سے علم و حکمت کا درس لینے لگا۔

تمام بنی اسرائیل حضرت شموئیل پر پروانہ وار تصدق اور اُنکے عظمت و جلال کے بندہ بے درم تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے اُنکے دامنِ عافیت میں پناہ ملی۔ مگر تھوڑی ہی مدت میں اُنکی وفات ہو گئی اور بادشاہ نے اپنے داماد کے قتل کی تدبیر تیزی سے شروع کر دی۔ حضرت داؤد دیس دیس جنگل جنگل پھرتے تھے مگر کہیں امن نہ ملتا تھا۔ بادشاہ اور اُسکے سپاہی ہر جگہ تعاقب کے لیے موجود تھے۔ جس قبیلہ نے پناہ دی "ساؤل" اُس کا دشمن ہو گیا جس بدنصیب نے حمایت کی آواز بلند کی اُسکا سر کٹوا لیا جس خاندان نے نصرت و اعانت کا ارادہ کیا اُس کو بے نشان کر دیا۔ چند کاہنوں نے ازراہِ حمیت مہمانِ مصیبت زدہ کی خاطر کی تو اپنی سلطنت کے تمام کاہنوں اور افسوں گروں کو قتل کرا دیا۔ سرگرداں ہو کر دشتِ "زیف" کے کوہستان میں خانہ بدوشانہ سکونت کی لیکن وہاں بھی اطمینان نصیب نہ ہوا۔ ساؤل اور اُس کے خادم ہر جگہ جان لینے کو موجود تھے، مگر ناموسِ بن کے آپ حفاظت کیا کرے وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے۔ دشمن کو کبھی وار کا موقع نہ ملا۔ البتہ چند بار خود ساؤل اپنے ہی دام میں گرفتار رہا۔ ایک غار میں وہ بہ آرام سو رہا تھا اور کوئی محافظ نزدیک نہ تھا حضرت داؤد اُسکے سر پر پہونچے اور اُسکے جُبہ کا دامن کاٹ لیا مگر رگِ جاں پر حملہ نہ کیا۔ کیونکہ مالک پر وار کرنا وفا شعاری کی شریعت میں حرام تھا۔

ایک دن ساؤل اور اُسکے لشکر کا سپہ سالار گاڑیوں کی جگہ کے بیچ سو رہے تھے اور لوگ اُسکے گرداگرد ڈیرے ڈالے ہوئے تھے سب پر گہری نیند آئی ہوئی تھی۔ حضرت داؤد اچانک وہاں پہونچے اور اُس کے سرہانے سے نیزہ اور پانی کی صراحی اُٹھائی مگر بادشاہ پر چوٹ نہیں کی۔ کیونکہ حاکمِ وقت پر ہاتھ اُٹھانا اطاعت گزاری کے مذہب میں گناہِ کبیرہ تھا۔

آخر کار ہجومِ مصائب سے عاجز آ کر ہجرت کا عزم بالجزم کیا اور بنی اسرائیل کے علاقہ سے نکل کر

اسباط
تمکنیہ کے ملک میں چلے گئے اور اُس سرزمین پر ایک برس اور چار مہینے تک سرگشتگی کے ایام گزارتے رہے۔

عمالقہ کے طول قامت، اژدر شگاف درندوں نے پچھلی شکستوں کا خونبہا بیباق کرنے کے لیے بنی اسرائیل کے سطوت و پریشان حملے پر چھاپا مارا۔ ساؤل میں مقابلہ و مجادلہ کا دم نہ تھا۔ "جلبوعہ" کے کوہستان میں خیمہ زن ہوا لیکن دشمنوں کی قوت اور جمعیت سے بہت تھا۔ خدا سے نصرت و اعانت کی دعائیں مانگیں۔ فرزندانِ یعقوب کی امداد کے پرانے وعدے یاد دلائے لیکن بابِ اجابت مفتوح نہ ہوا اور کوئی صورت کشود کار کی نظر نہ آئی۔ علما و اشراف گروہ گروہ قتل ہو چکے تھے، ورنہ آج اُن کی دعاؤں سے دفع بلیات کی آس ہوتی۔ حضرت شموئیل وفات پا چکے تھے ورنہ اُنکے مقدس دامن کے سایہ میں پناہ ملنے کی امید ہوتی۔ کاہن اور افسونگر موت کے گھاٹ اتارے جا چکے تھے ورنہ اس وقت اُنہیں کی غیب دانی یا شعبدہ پردازی کا سہارا ہوتا۔ کوئی برگزیدہ ہستی ملک و قوم میں نہ تھی جو بگڑی تقدیر بنا سکے۔ میدان جنگ کا نقشہ ہر دم بدتر ہونے لگا اور فوج میں سخت بد دلی پھیلی۔ عاجز ہو کر بادشاہ نے ہر طرف کاہنوں کی تلاش شروع کی تاکہ اُنکی مدد سے دشمن کے دفع کرنے کی تدبیر دریافت کی جائے۔

کہتے ہیں کہ اگلے وقتوں میں ایک بادشاہ تھا۔ اپنی مملکت کا دورہ کر رہا تھا کہ ایک شہر تک پہنچا جسکے بابِ اندرونی میں قدم رکھتے ہی مرغ کی آواز مسموع ہوئی۔ اس صدائے بے ہنگام کو فالِ بد تصور کر کے اُس نے بستی بھر کے مرغ ذبح کرا ڈالے۔ شب کو بستر استراحت پر دراز ہوا تو خادموں کو حکم دیا کہ نور کے تڑکے جب مرغ بانگ دے تو مجھے بیدار کر دینا۔ خادم نے دست بستہ عرض کی کہ جہاں پناہ اب مرغ کہاں باقی ہیں جو صبح کی اذان دیں۔ کسے نماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی۔
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی۔

یہی کیفیت ساؤل کے حالِ زار پر چسپاں ہوئی۔ پہلے خود اُس نے اکابر کے کاہنوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرایا اور اب مصیبت کے وقت اُن سے استفادہ کے لیے کاہنوں کی جستجو کرنے لگا۔ تفحص اور تحقیق سے پتہ چلا کہ صرف ایک کاہنہ زندہ باقی ہے جو "اندور" میں اپنی ہستی چھپائے ہوئے موجود ہے۔ بادشاہ بھیس بدل کر اُس کی خدمت میں پہونچا۔ اپنے افعال و حرکات پر ندامت ظاہر کی اور آل کار دریافت کیا۔ ضعیفہ نے ترس کھا کر اپنے علم کے زور سے ارواحِ علویہ کی حاضرات کی۔ ایک مقدس روح جو خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت شموئیلؑ کی تھی جماعت کے ساتھ نظر افروز

ہوئی اور بادشاہ سے مخاطب ہو کر ارشاد کرنے لگی کہ تو نے خداوند کی بات نہیں مانی، اس وجہ سے مالک نے تیرے ساتھ یہ برتاؤ کیا۔ کل تو اور تیرے بیٹے میرے ساتھ ہوں گے اور خداوند اسرائیل لشکر کو بھی فلسطینیوں کے ہاتھ میں دے گا'

مثنا تد وجیوں نے ترانہ سنایا کہ صاحب کو بہت عزیز دعوت میں بلایا ... تو اپنے لڑکوں کو نظر لگنے کے خوف سے گھر پر چھوڑ جانا ... اپنے بیٹوں کو ہمراہ لیکر میدان جنگ میں جائے گا اور کل وہ سب شموئیل کے پاس اُن کی سرائے میں جا کر ... ہوں گے"

بادشاہ نے عتاب و خطاب سُن کر فرمانِ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم و عبودیت خم کیا، قضائے الٰہی پر راضی ہوا، فرزندوں کو ساتھ لیکر مقتل میں آیا اور دشمنوں سے لڑ کر جامِ "کل من علیہا فان" نوش کر لیا۔

حضرت داؤد وطن مالوف سے ہجرت کیے ہوئے "صقلاج" کے مقام پر تھے کہ ایک فلسطی پیراہن چاک کیے اور سر پر خاک ڈالے ہوئے حضور میں آیا اور عرض کرنے لگا کہ اسرائیلی کچھ بھاگ گئے اور کچھ قتل ہوئے مگر ساؤل اور اسکے تین بیٹے مارے گئے "میں کوہ جلبوعہ پر اتفاقاً وارد ہوا۔ دیکھا کہ ساؤل زخم خوردہ اپنے نیزے پر جھکا ہوا ہے اور رتھ سوار اُس کا پیچھا کیے آ رہے ہیں۔ اُس نے مجھ کو پکارا اور کہا کہ مجھے قتل کر ڈال کیونکہ میں بڑے عذاب میں ہوں اور اب تک دم باقی ہے۔ میں نے اُس کو قتل کیا۔ اسکے سر کا تاج اور بازو کا کنگن لایا ہوں"

غم کی نشانی دیکھ کر (مؤلف صحیفۂ شموئیل کے قول کے مطابق) داؤد نے اپنے کپڑوں کو چاک کیا اور یہ دردناک مرثیہ پڑھا۔

"اے اسرائیل! تیرے ہی اونچے مقاموں پر تیرا فخر مارا گیا

"جات" میں نہ بتانا
"اسقلون" کے کوچوں میں اسکی خبر نہ کرنا
نہ ہو کہ فلسطیوں کی بیٹیاں خوش ہوں
نہ ہو کہ نامختونوں کی بیٹیاں فخر کریں
اے جلبوعہ کے پہاڑو!
تم پر نہ اوس پڑے اور نہ بارش ہو اور نہ کھیت ہوں
کیونکہ وہاں زبردستوں کی سپر بُری طرح سے پھینک دی گئی
ساؤل اور یونتن اپنے جیتے جی عزیز اور دلپسند تھے

لغزشِ رندانہ

(از مسٹر حامد حسن بلگرامی بی۔اے آنرس ایم۔اے الٰہ آباد)

"پلا مجھ کو ساقی شرابِ وصال — کہ اب ہجر سے تنگ ہے میرا حال
تڑپتا ادھر تھا جو وہ بے نظیر — ہوئی شام بارے تو چھوٹا اسیر

. . . .

. . . .

وہ بیٹھا جو خلوت میں آ بے نظیر — اور ادھر سے آیا جو بدرِ منیر
اُسے دیکھ اس نے تو پھر غش کیا — لباس اور زیور سے غش غش کیا
زبس حوصلے سے جو نکلی سی کی — حیا عشق نے ناز جھجکی سی کی
پکڑ ہاتھ مسند پہ کھینچا اسے — محبت کے رشتے سے اینچا اسے

. . . .

غرض آخرش بعد راز و نیاز — وہ مسند پہ بیٹھی بصد امتیاز
ہوا پھر تو صہبائے گلگوں کا دور — ہوئے اور ہی کچھ جو تھے واں کے طور
ہوئے جب کہ بدمست وہ ماہ رو — لگی اُن میں ہونے عجب گفتگو
کہ دستے جو نرگس کے واں تھے ہرا — لگے ڈھانپنے آنکھ بے اختیار
خواصیں جو تھیں روبرو ہٹ گئیں — بہانے سے ہر کام کے ہٹ گئیں
غرض رفتہ رفتہ وہ مدہوش ہو — چھپر کھٹ پہ بیٹھے ہم آغوش ہو
لیا کھینچ انھوں نے جو پردہ شتاب — چھپے ایک جا دو مہ و آفتاب

. . . .

اُٹھے پی کے باہم شرابِ امید — اُڑی، مرغ روا ور کوئی در سپید

. . . .

عرق میں ادھر غرق وہ مہ جبیں — لگے آنکھ نیچی اُدھر نازنیں"

یہ ہیں مثنوی میر حسن کے وہ اشعار جنھیں پڑھ کر اکثر ادب اُردو کے بہی خواہوں نے آنکھیں بند کر لی

ہے۔ اور اُن کے دلوں میں اس شاہکار زمانہ کے خلاف انحراف پیدا ہو گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بعض حضرات نے اس مثنوی کی انتہائی تعریف کرنے کے بعد بھی یہی کہا کہ کاش میر حسن نے اپنی اس تراج فائقہ کو ایک اخلاقی جرم سے پاک رکھا ہوتا۔ کاش یہ اشعار نہ ہوتے، اور اگر ہوتے بھی تو شادی کے بعد۔ اخلاق پسند طبیعتیں بھی اس قسم کی تنقید کو بلا تردد قبول کر لیتی ہیں، کچھ تو تنقید کی ظاہری صداقت کے باعث اور کچھ تکمیل ایمان کی غرض سے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر سحر البیان کے اس باب کو خارج کر دیا جاتا تو اس مثنوی کی اہمیت بہت کچھ کم ہو جاتی اور اس کا اصل منشا ہی فوت ہو جاتا۔ ممکن ہے سحر البیان کا دلکش انداز بیان دلوں کو تسخیر کر لیتا، مانا کہ شاعری کی دیگر خوبیاں، شعر پسند طبیعتوں کو رو بہ کر لیتیں، منظر نگاری کی تصویریں نظر کو فریب خوردہ محبت رکھتیں۔ مگر اس کی وہ خوبی جو آنے والی قوموں سے بھی خراج تحسین لیتی رہے گی اُس میں موجود نہ ہوتی۔ لیکن یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے۔

کسی مثنوی کو غیر فانی بنانے کے لیے منظر نگاری، مصورانہ قدرت اور دلکش انداز بیان کے علاوہ بھی ایک قسم کی واقعیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ خواہ یہ اصلیت اصل قصے میں موجود ہو یا اُس کے کسی جزو میں لیکن اس کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ مثالیہ طور پر مثنوی کو اپنے زمانے کا آئینہ بنایا جاوے۔ میر حسن اس نکتے سے واقف تھے اُنھوں نے اپنی مثنوی کو اپنے زمانے کے رسوم و توہمات کا آئینہ بنا دیا لیکن اُس زمانے کی اصل اسپرٹ ہی کو نظر انداز کر دینا ناقابل عفو غلطی ہوتی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عیش و طرب کی اُمنگیں گرم خون کی طرح ہر فرد کی رگوں میں دوڑتی پھرتی تھیں، سوسائٹی نے اپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے "کوٹھوں" کو ہر قسم کی درسگاہ بنا رکھا تھا، اور تہذیب و تمدن اُنھیں "ماوی آشیاں" سے نظریں ملا کے بیٹھا تھا۔

کیا ایسی حقیقت و صداقت سے پہلو تہی کی جا سکتی تھی جو لکھنؤ کی تباہی کی علت اولیٰ ہوئی ہو میر حسن اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن وہ بحیثیت ایک آرٹسٹ کے ان چیزوں کا اخراج کچھ ایسا طریق کار چاہتے تھے کہ آرٹ کا اصل مفہوم "حسن" کبھی نہ فوت ہونے پائے اور اس فرض سے بھی سبکدوشی حاصل ہو جائے آرٹ ہیچ میں ہوتا اور نہ تبلیغ اُس کا پیشہ وہ صداقت کا اظہار کرتا ہے اور نتائج کو ایک سیدھے ذوق پر چھوڑتا ہے جو بے خوشی بھی ہو اور ذاتی بھی۔ جسکو بلا محنت اور بلا سعی کے انداز بیان خود اختیار کر لے لیکن اس میں قدرت وہ ہو کہ انسان کے عمیق ترین جذبات کو برانگیختہ کر دے اُس کے اعلیٰ اور لطیف خیال میں تحریک پیدا کر دے یعنی ایک طرف قوت متخیلہ کو جگا دے تو دوسری طرف جذبات ہمت و قوت انعکاس کو بیدار کرے۔ تعقل اور استدلال کو چونکا دے۔ آرٹسٹ کبھی صداقت کو "حسن" پر

ترجیح نہیں دیتا لیکن وہ صداقت کو اس خوبصورت پیرایہ سے بیان کرتا ہے کہ صداقت خود حسن ہو جاتا ہے
اگر وہ کسی برائی کا اظہار کرتا ہے تو اس برائی کو اس قدر "مثالیہ" (Idealistic) بنا دیتا
ہے کہ آرٹ سے وہ گندگی اور انقباض دور ہو جاتا ہے اور صداقت نقابوں سے جھلکتی نظر آتی ہے۔
چنانچہ فن مصوری کی عریاں تصویریں اکثر طبیعتوں پر گراں گزرتی ہیں لیکن اس کی کلاسیکی مثالیں موجود
ہیں جہاں عریانی کے انقباض کو ذہنی متانت اور موقع کی سنجیدگی سے دور کیا گیا ہے مثال کے طور پر اطالین
اسکول کی وہ تصویریں جو "گیلری آف وئینا" میں موجود ہیں، سچی حقیقتوں کو ظاہر کر رہی ہیں چنانچہ
Augustine Carcce کی تصویر جس کو The Communion of St Jeroma
اور Domenichind دونوں نے الگ الگ بنایا ہے، فرشتوں کو چھوٹے بچوں
کی صورت میں عریاں دکھاتے ہیں۔ آج کل اس مصوری کی مثالیں ہر سال کی Phologramms
of the Year میں مل سکتی ہیں لیکن وہاں مفہوم دوسرا ہے۔
سنگتراشی میں اس قسم کی کافی مثالیں موجود ہیں جہاں اظہار صداقت کے لیے عریاں مصوری کے نقشے
پیش کیے گئے ہیں مثلاً The Lion in Love یا Full of Man کے مجسمے اگرچہ عریاں
ہیں لیکن قابلِ قدر۔

غرض آرٹ کا مفہوم حسن اور انبساط ہے۔ آرٹسٹ اچھائیوں کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ لوگوں کے
دلوں میں اُن کا احترام پیدا ہو جائے اور برائیوں کو اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ محض جذبات نہ آنے
پائیں لیکن صداقت اور حسن روشن ہو جائے۔
میر حسن بھی جب مثنوی کے اس ٹکڑے پر پہونچے ہونگے تو اُس وقت کے دل کو اس لغزش رندانہ نے تڑپا دیا
ہوگا۔ لیکن وہ ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے بخوبی واقف تھے لہٰذا [illegible] پوشاک اور
رسوم کے خاکے بنا کے چھوڑ دیے جائیں تو وہ تصویر اصلی آئینہ نہ ہوگا۔ لکھنؤ کی اس سرشاری کو بلا اس لغزش کے
بیان ہی نہ کیا جا سکتا تھا دکھانا یہ تھا کہ سوسائٹی ایسی معاشرت کو جزوِ زندگی سمجھنے لگی تھی۔
میر حسن نے وہی طریقہ اختیار کیا جو ہمیشہ آرٹسٹ کرتے ہیں اُنھوں نے بھی اس صداقت
کو مثالیہ بنا دیا۔

بے نظیر کے کردار کو لیجیے۔ وہ ایک عقیل و ذہین انسان ہے، معنی و منطق سے واقف، منقول و معقول
سے کما حقہٗ آگاہ، حکمت پر حاوی، ہیئت و ہندسہ پر قادر، عالموں کی صحبت میں بیٹھنے والا،
رذیلوں سے نفرت کرنے والا۔ لیکن جب چاندنی رات میں وہ بدر منیر کے باغ میں پہونچتا ہے تو

لگا جھانکنے اُس مکاں کے تئیں	کہ دیکھوں تو یاں ہے کوئی نازنیں

وہ مکان کے اندر گھستا ہے لیکن اُس کا ضمیر اُس کو ملامت نہیں کرتا، کوئی اخلاقی آواز مانع نہیں ہوتی۔ اگر کچھ ڈر ہے تو اور باتوں کا نتائج کا

کہا جی سے اب جو کچھ ہو سو ہو

کیا میرحسن کا یہ کمال نہیں کہ انھوں نے صرف ایک مذمت ملامت سے یہ ظاہر کر دیا کہ عیش پرستی اس حد تک شہزادوں کی زندگی میں راسخ تھی کہ ایک عالی دماغ شخص کو بھی احساسِ جرم تک نہیں ہوتا۔

لیکن اگر میرحسن یہیں پر چھوڑ دیتے تو بے نظیر کا کردار بہت گر جاتا، اور وہ ایک مثنوی کا ہیرو نہ ہو سکتا۔ مگر میرحسن اپنی اس تصنیف کو شاہکارِ زمانہ بنانا چاہتے تھے۔ صرف تاریخی اہمیت پر اسکی بنیاد رکھنا آرٹ کا خون کرنا تھا۔ بے نظیر کے کردار کو بلند کرنے کے لیے وہ اُس کی استقامت اور استحکامِ محبت دکھاتے ہیں۔ یہی نہیں، اُس کو ایسے ماحول میں رکھتے ہیں جہاں اس قسم کی لغزش فطرت کا تقاضا معلوم ہونے لگتی ہے۔

شہزادہ بے نظیر کا حسن اس منزل پر پہونچ گیا ہے جہاں پریاں اُس کے رُخ پر رخسار رکھنے لگتی ہیں اُس کو اڑا لے جاتی ہیں۔ اس طرح وہ پرستان میں تو پہونچ جاتا ہے لیکن انسان کی ملاقات کو ترستا ہے۔ آخر پری اُسے ایک کل کا گھوڑا دیتی ہے۔ ایک دن وہ سیر کرتے ہوئے ایک باغ سے ہو کر گزرتا ہے جس کو چاندنی کی روشنی نے بقعۂ نور بنا دیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ موسم سرما کی خنک ہوائیں فضا میں پھیلی ہوئی تھیں، چاندنی کی روشنی میں ایک پُرکیف سکوت طاری تھا۔ کون مردہ دل ایسے وقت پر باغ کی سیر کا متمنی نہ ہوتا، خصوصاً شاہزادہ، جس کی نظر میں حقیقی مناظر اور دلچسپ نظاروں کے لیے ترس رہی ہوں، ایسے سماں کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا۔ اُس کی نگاہیں ایک عرصہ سے طلسمات میں پھنسی ہوئی تھیں۔ پرستان میں جس حُسن کا مطالعہ کیا تھا وہ حُسن غیر جنس تھا جو ایک انسان کی بیٹی کا دل نہ ہو سکتا تھا۔ اُس کا تاب ایک ایسے سہج کو ڈھونڈھتا تھا جو اُسکے دل کے نفیس تاروں کو چھیڑ دے یا اُس کی فطرت کے لیے باعث سرور ہو۔ میرحسن کا کمال یہ کہ جس شعر سے انھوں نے زمانہ کی عیش پسندی کا مرقع کھینچا تھا اُسی شعر سے فطرت کے اس راز کو بھی ظاہر کر دیا۔

لگا جھانکنے اُس مکاں کے تئیں	کہ دیکھوں تو یاں ہے کوئی نازنیں

یہی وہ تاک جھانک ہے جو خلافِ اخلاقیات معلوم ہوتی ہے لیکن ماحول کے اثرات سے فطرت کا تقاضا بن جاتی ہے۔ یہی وہ فضا ہے جسے دیکھ کر ہم بے نظیر کو قابلِ عفو خیال کرنے لگتے ہیں۔ ہمارا

داغ متعدد سوالوں کی طرف رجوع ہو جاتا ہے اور ہم کچھ اس طرح سمجھنے لگتے ہیں :-

" عشق ان تمام زنجیروں سے آزاد ہے جو سوسائٹی نے اخلاقیات کی بنا پر اپنے اوپر عائد کرلی ہیں۔ شادی یا نکاح کا مفہوم جو کچھ بھی زمانۂ جاہلیت سے اب تک کیوں نہ ہو، لیکن نکاح نام ہے دو دلوں کی محبت کا۔ ایک دوسرے کا ہمدم اور ہم نفس ہونے کا۔ کتنے نکاح ہیں کہ قاضیوں نے پڑھے، گواہوں نے شہادت دی، لیکن اُن کے دلوں کے درمیان مفارقت کا سمندر موجیں مارتا رہا۔ وہ ایک جگہ تھے۔ ظاہر بین نظریں انکو پاس پاس دیکھتی تھیں، لیکن حقیقت میں وہ کوسوں دور تھے۔ ایسی شادیاں صرف اسی لیے تو قابل مذمت نہیں کہ وہ بھی اپنے فرائض کو انجام دے رہی ہیں اس سے زیادہ انکی کچھ اور وقعت نہیں لیکن اس عالم میں کچھ ایسے بھی دل ہیں جنکو ایک نظر محبت نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ناقابل بیان زنجیر میں باندھ دیا۔ دنیا اسکو مانے یا نہ مانے لیکن یہ ایک ایسا ایجاب وقبول تھا جس میں جدائی کا شائبہ تک موجود نہیں۔ بے نظیر و بدر منیر کو ملانے والی بھی ایک ایسی ہی نظر محبت تھی جس نے دونوں کو مدہوش کر دیا۔ یہیں بے نظیر سے وہ لغزش سرزد ہوتی ہے جو ہاتف کے معصوم دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ ایک معمولی انسان اُن جذبات پر قابو نہ پا سکا۔ شراب وکباب کے دور چلے، بند حجاب ٹوٹ گئے، وہی ہوا جو نہ ہونا تھا، وہی کیا جو نہ کرنا تھا۔ . . . پھر یہ زمانہ بھی تو وہ تھا، جب عیش وطرب بادشاہوں کی خو تھی۔ شراب کے دور اُن کا دماغ سلب کر لیتے۔ خوبصورت خواصیں خدمت کے لیے حاضر رہتیں، ہر تاجدار کے حرم میں پچاسوں شادی شدہ اور غیر منکوحہ مہ جبینیں موجود رہتیں۔ . . اگر ایسے زمانہ میں ایک ہیرو صرف ایک عورت سے محبت کرتا ہے جس کو وہ اپنی زندگی کا ہمراز بھی بنانا چاہتا ہے تو کیا اُس کی یہ لغزش قابلِ عفو نہیں۔ اگر وہ دنیاوی شادی کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی شادی خود کر لیتا ہے۔ الفت بھری نظروں سے کیفیاتِ قلبی کا اظہار کرتا ہے، اور محبت کی معصوم اداؤں سے اقرارِ محبت لے لیتا ہے تو پھر نکاح کی کیا ضرورت آپ کہیں گے کہ اسکے مضر اثرات سوسائٹی پر پڑتے ہیں۔ بیشک درست۔ اور اسی لیے تو اس قسم کی شادی کے لیے کوئی کلیہ نہیں بنایا جا سکتا۔ پوری مثنوی پڑھ جائیے ، نہ بے نظیر کی محبت میں کمی آتی ہے نہ بدر منیر کی وفا پرستیاں کم ہوتی ہیں، دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ ہیں، دونوں کے کردار دل پر کیا ہیں اور لغزش نہیں ہوتی، اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب مضر اثرات نمایاں نہ ہوئے بلکہ مفید نتائج برآمد ہوئے، تو یہ لوگ ہرگز کسی حقیقی تعزیرات کی دفعہ میں نہیں لائے جا سکتے۔ لفظی قانون دوسری چیز ہے اور روحی تعلق کچھ اور شے۔"

۔ خیالات غلط سہی، لیکن ۔۔۔ کا انتہائی کمال ہے کہ اُنھوں نے اپنے [illegible] کے ۔۔ کو اس

عیب کو جس کا بیان کرنا ناگزیر تھا، اس طرح اور اس ماحول میں بیان کیا کہ کردار کی بلندی بھی قائم رہی اور حقیقت بھی حسن بن کر سامنے آگئی۔

یہ ہے آرٹ کی وہ خوبی جس نے معائب کو مثالیہ بنا کر پیش کیا ہے۔ میر حسن کی یہی "لغزش رندانہ" والیان کی کامیابی کا اہم اور عجیب راز ہے۔　　واللہ اعلم

خیر مقدم الناظر

(از جناب منشی افتخار علی صاحب نگر صدیقی۔ بسوانی)

نگر صاحب الناظر کے پرانے قلمی معاونوں میں ہیں، ایڈیٹر کے شفیق بزرگ ہیں۔ اس لیے اشعار ذیل میں اپنی شفقت و محبت کا اظہار فرمایا ہے۔
ایڈیٹر

گلشن میں جام لے کر گل شرمسار آیا　　وہ مستِ حسن آیا اور پُر خمار آیا
گیسوئے دراز ایسے کچھ ایڈیوں سے کم ہیں　　محشر خرامیوں میں اٹھکھیلیاں ستم ہیں
ہائے کاش دل میں کافر قرار بن کر　　آیا ہے جو چمن میں رنگِ بہار بن کر
وہ نسیم ہر سو جا کر پکار آئی　　گلشن میں ہو گیا غل آئی بہار آئی
سنبل کا وہ نکھرنا سبزے کا لہلہانا　　کیا لطف دے رہا ہے کلیوں کا مسکرانا
گلشن میں آج لطفِ گلگشت آ رہے ہیں　　ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دل گدگدا رہے ہیں
آئی بہار ہم نے دیدار گل کا دیکھا　　نرگس کی آنکھ دیکھی رخسار گل کا دیکھا
الفت کا رنگ دیکھو خوبی کی شان دیکھو　　بلبل فدا ہے گل پر دل دیکھو جان دیکھو
آیا ہے موسم گل زینت ہوئی زیادہ　　رنگیں ہوئے گل تر نکہت ہوئی زیادہ
ہر اک نہال جس کا مشتاق سحر فن ہے　　جو سامنے ہے اپنے یہ کونسا چمن ہے
ہر وقت ہے شگفتہ دورِ خزاں نہیں ہے　　ایسا چمن ہے جس میں دورِ خزاں نہیں ہے
الناظر اب ہے نکلا پھر ہو گئی تجلی　　یہ علم کا چمن ہے کیا بات اس چمن کی
گلشن میں رنگ اسکے آنکھوں میں ہیں سمانے　　گلہائے علم اس نے دنیا میں پھر کھلائے
الناظر اپنا باغ علم و ہنر رہے گا　　علم ادب کا سہرا اسکے ہی سر رہے گا

اندرانی

(از جناب مولوی محمد نثار حسن صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل)

چندی چرن کا گھرانا نہ صرف غیر موزوں نام رکھنے کے لیے مشہور تھا۔ یوں تو تمیس روپیہ کا کلرک تھا مگر بیٹے کا نام رکھا تھا کُبیر (دولت کا دیوتا) شاید وہ سمجھتا تھا کہ ایسی باتوں سے تقدیریں پلٹ جاتی ہیں۔ لیکن کُبیر اس نام کے باوجود بھی باپ ہی کی طرح مفلس رہا۔ اُسے اس بات کا کوئی ملال نہ تھا اُسکے نزدیک نام بہرحال صرف نام تھا اور کافی تھا کہ وہ اس نام سے موسوم رہے لیکن بڑے بڑے نام رکھنے کا شوق اس سے بھی چھٹا چنانچہ جب کئی لڑکوں پر لڑکی پیدا ہوئی تو اس کا نام اندرانی (ملکۂ فردوس) رکھا۔ پڑوسیوں نے اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ ایک نے کہا "بڑا سندر نام ہے شاید اس کے بھاگ بھی ایسے ہی ہوں" دوسری بولی "بھاگ تو ایشور کے ہاتھ ہیں لیکن لڑکی ہے بہت پیاری صورت کی اندرانی بالکل ٹھیک نام ہے غریب بنگالی کی بیٹی نہیں معلوم ہوتی، بالکل میم کی بچی لگتی ہے۔"

بچی واقعی بہت حسین تھی۔ جب پیدا ہوئی تو گھر والوں نے یہ کہکر دل کو تسکین دے لی "آخر لڑکی ہے تو کیا ہوا۔ ایسی شکل و صورت کی لڑکی کا بیاہ ہونا کچھ مشکل نہیں۔ کبھی کبھی بیٹی بھی باپ کے لیے بھاگوان ہوتی ہے۔"

رفتہ رفتہ اندرانی سیانی ہوگئی۔ افلاس کی وجہ سے اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کچھ اچھا نہ ہوسکا ماں کی ممتا بھی اُسے پوری طرح نہ ملی۔ بیچاری ماں دن بھر کام دھندے میں لگی رہتی۔ ترکاری پکاتی، کھانا کھلاتی، برتن دھوتی، جھاڑو دیتی، سارے کام اکیلی کرتی۔ ہر وقت کام کی ماری رہتی، آرام کا کوئی وقت نہ تھا۔ پھر بچی کی دیکھ بھال کیونکر ہوتی۔ اندرانی چھوٹی سی تھی تو ماں اسے رسوئی میں لکڑی کے تختے پر لٹا دیا کرتی۔ وہیں پڑی پڑی روتی اور کھیلتی رہتی۔ نیند آتی تو سو جاتی۔ ماں کو سر اُٹھانے کی بھی مہلت نہ تھی دودھ بھی پیٹ بھر کر نہ تھا اس لیے ساگودانہ اور آش جو پر بسر تھی۔

جب اندرانی ذرا سیانی ہوئی تو بڑے بھائیوں میں سے ایک کے سپرد کر دی گئی، جو اُسے دن بھر گود میں لیے پھرتا تھا۔ اندرانی کی ماں کے اوپر تلے پانچ بیٹے ہوئے تھے جن میں سے اب صرف دو زندہ تھے۔ بڑا لڑکا اسکول میں پڑھتا تھا، اس لیے اندرانی کو کھلانے کے لیے اُسے تو وقت نہ ملتا تھا۔ چھوٹا لڑکا سنیل صرف پانچ برس کا تھا، وہ ابھی اسکول جانے کے قابل نہ تھا، اس لیے آتا کا کام

اُس سے لیا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے فرائض پورے طور
پر ادا نہ کر سکتا تھا اور اکثر بچی کو گرا دیا کرتا تھا لیکن پھر بھی
کام کاج میں پھنسی ہوئی اس کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹا ہی لیتا
تھا سنیل کی بدولت اب وہ اطمینان سے کھانا کھا
سکتی تھی۔ دن بھر تو اُسے فرصت نہ ملتی تھی رات کو
کبھی کبھی وہ سوتی ہوئی بچی کا منہ تکا کرتی۔ اس کے
دماغ میں خیالات کا ہجوم ہوتا۔ بچی کنول کی کلی کی طرح
خوبصورت تھی وہ سوچتی ایک دو برس کے بعد یہ گھر کا کام
کرنے کے قابل ہو جائے گی۔

بچی اور سیانی ہوئی۔ من کی ذرا دبلی پتلی تھی مگر ایسی
خوبصورت کہ بالکل سونے کی مورت معلوم ہوتی تھی۔ اپنی
عمر کے لحاظ سے بڑی ہوشیار تھی۔ ماں کو اس پر بڑا ناز تھا۔
وہ سوچتی ہم غریب ہیں تو کیا ہوا ایسی بیٹی تو کسی راجہ کے
بھی نہ ہوگی۔ گلی کے پرلے سرے پر دت کا مکان ہے،
بچے یہاں کھیلنے آتے ہیں۔ لیکن توبہ ہے کیسے بدصورت بچے
ہیں۔ لڑکی تو بالکل بھینڈ کی معلوم ہوتی ہے مگر کیسی بنی
ٹھنی رہتی ہے۔ ساٹن، مخمل اور ریشم کے سوا تو کچھ
پہنتی ہی نہیں۔ مارے گھمنڈ کے زمین پر پاؤں نہیں رکھتی
گاڑی میں جاتی ہے۔ ساتھ چلنے کو دربان اور ملازم ہیں
جیسے تو اپنی بچی کے لیے ایک جوڑا جوتا یا ایک نیا
فراک بھی نہیں جڑتا۔ پھر بھی سینکڑوں میں اسی پر نظر
پڑتی ہے۔

اندرانی بڑی چلبلی لڑکی تھی۔ کبھی نچلی نہ بیٹھتی،
اس لیے اکثر ماں کا بُرا بھلا سننا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ
چانٹا بھی لگ جاتا تھا۔ شریفوں کے بچے ایسے نہیں
ہوتے۔ بیاہ ہوگا تو ساس کیا منہ میں پٹخے گی۔ لڑکی میں
ایسی شرارت کس کام کی؟ اسی قسم کی باتیں ہمیشہ سنتی
رہتی تھی لیکن اس کی چنچل فطرت اسے چین سے بیٹھنے
نہ دیتی تھی وہ یہ ساری صلواتیں اس کان سنتی اور
اُس کان اُڑا دیتی۔ اسکے بھائی کے دوست اسکے
بھی دوست تھے۔ ان کے ساتھ وہ کرکٹ اور فٹ بال
کھیلتی۔ بانس لیکر پتنگ لوٹتی۔ آس پاس کے درختوں پر
چڑھ جاتی۔

اندرانی کا باپ دفتر سے آنے کے بعد شام کے
وقت سنیل کو پڑھایا کرتا تھا، نہا دھو کر کچھ ناشتہ کرتا
اور پھر سنیل کو لیکر بیٹھ جاتا۔ سنیل بڑا کند ذہن لڑکا
تھا۔ ہر وقت شرارت کی فکر میں رہتا۔ کتابوں کو ہاتھ
بھی نہ لگاتا۔ باپ دفتر میں رہتا۔ ماں کھانے پکانے
میں لگی رہتی۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔
خرچ کی تنگی کی وجہ سے وہ اُسے اسکول میں بھی داخل
نہ کرا سکتے تھے ایک لڑکے کی تعلیم کا صرفہ وہ برداشت
کر رہے تھے اس سے زیادہ ان کے بس کی بات
نہ تھی۔ ماں باپ نے سمجھ لیا تھا کہ کمبخت کے نصیب
میں بھیک مانگنا لکھا ہے۔

اندرانی بھی اپنی ٹوٹی ہوئی سلیٹ لیکر سنیل
کے ساتھ پڑھنے بیٹھ جاتی لیکن بیچ میں دخل در
معقولات ہوتا رہتا "اندو ذرا ادرک کتر لے۔ اندو
لکڑیاں لا دے۔ کمبخت کہاں چلی گئی۔ اتنی بڑی [illegible]
ہو گئی اور گھر کے کام کو ہاتھ نہیں لگاتی"۔ اندرانی
سنی ان سنی کر دیتی، پڑھتی تو ایسا زیادہ نہ تھی

اس بہانے مزہ لیا کرتی تھی۔ اپنی ٹوٹی سلیٹ پر لکھتی رہتی
اور باپ پر سوالوں کی بوچھار کر دیتی۔ "پتاجی یہ
کیا ہے؟ پتاجی میرے لیے ایک پھول کھینچ دو۔
مجھے کیوں نہیں پڑھاتے۔ میں بھیا سے اچھا لکھنے
لگوں گی۔" بیچارہ کبھو بیٹی کی سلیٹ پر لکھتا پھر بیٹے کی
سلیٹ پر لکھتا۔ وہ گم ہو رہتا اور یہ سوچا کرتا کہ
اندرانی لڑکا کیوں نہ ہوئی۔ گھر بھر کی عقل اسکے حصہ
میں آ گئی تھی۔ لڑکی اگر کند ذہن بھی ہو تو کچھ ہرج
نہیں۔ صورت شکل کی اچھی ہوئی تو سب عیب چھپ
جاتے ہیں۔ لیکن لڑکے کی بات اور ہے۔ سنیل کا
ایشور جانے کیا ہوگا۔ شریف آدمی کے گھر جنم لیا ہے
محنت مزدوری قلی گری کیسے کریگا۔

عرصہ گزر گیا۔ سڑک کے اس کنارے رتن کے گھر
جشن ہو رہا تھا۔ باجے بج رہے تھے سارا گھر روشنی
سے جگمگا رہا تھا۔ طرح طرح کی سواریوں سے راستہ
پٹا پڑا تھا۔ آج اسی بدصورت لڑکی کا بیاہ تھا اور
ساری چہل پہل اسی وجہ سے تھی اندرانی کی ماں نے
حسد بھری نگاہوں سے یہ منظر دیکھا اور جل گئی۔ لڑکی کا
باپ جتنا روپیہ لٹا رہا تھا ولایت کا تعلیم یافتہ لڑکا
حاصل کرنے کے لیے دس ہزار کا تو اکیلا جہیز ہی تھا۔
لڑکی سہنے میں پیلی پڑی تھی۔ بیچاری اندرانی! اسکے
بھی بیاہ کے دن تھے گو اسکے ماں باپ اس بات کا
اعتراف اپنے دل میں بھی کرتے ہوئے ڈرتے تھے
وہ اس کی عمر دس سال بتلاتے تھے، لیکن انھیں
جہاں رہتے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا، اور پڑوسیوں نے
اندرانی کو بچپن سے دیکھا تھا، انھیں دھوکا دینا آسان
نہ تھا۔

سنیل آخر تک غبی رہا۔ اس کی آواز بڑی اچھی
تھی اس لیے اس نواح کے تمام موسیقی کلبوں اور
تفریحی تھیٹروں میں اس کی مانگ رہتی تھی۔ باپ
سے بہت ڈرتا تھا اور اگر ممکن ہوتا تو وہ کبھی باپ کے
سامنے نہ جاتا۔ باپ کے دفتر چلے جانے کے بعد
وہ اشنان کرنے اور کھانا کھانے آتا۔ ماں بھی برا
بھلا کہتی رہتی تھی۔ مارنے کی بھی دھمکیاں دیتی تھی
مگر پھر بھی کھانا تو کھلا ہی دیتی تھی سنیل یہ ساری
صلواتیں روزانہ معمول کے مطابق سنتا اور گھر سے
نکلتے ہی بھول جاتا۔ غرض اسکی حالت سنبھلنے کی کوئی
امید نہ تھی۔

اندرانی تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا اور حساب سیکھ
گئی تھی۔ کچھ تاریخ اور جغرافیہ بھی پڑھ لیا تھا۔ کبھو بیٹی
کے پڑھانے میں زیادہ محنت نہ کرتا تھا۔ ہاں اگر
وہ کچھ پوچھتی تو بتا دیتا اور اس کا املا اور سوال بھی
ٹھیک کر دیا کرتا۔ پچاس ہی برس کی عمر میں آج
بوڑھاپا چھا گیا تھا۔ زندگی کی کشمکش نے اس پر برا
اثر کیا تھا۔ اور اب اس میں کسی بات کی امنگ یا
جوش باقی نہ تھا۔ گھر والوں کی معاش کے لیے
اسے کام تو کرنا پڑتا تھا لیکن اس کی طبیعت کام
سے بیزار تھی۔ بڑے لڑکے کو پڑھنے کا بہت شوق
تھا، لیکن خرچ نہ ہونے کی وجہ سے اسے بھی دیویکی
کی تعلیم کی ساری امیدوں اور آرزوؤں کو خیرباد کہکر

ایک سو دو روپے کی دوکان پر ملازمت کرلینی پڑی۔ کبیر کو اس سے کسی سہارے کی توقع نہ تھی۔ اندرانی کے بیاہ کی فکر کے سوا اُسے کسی بات کا خیال نہ تھا۔ خواب میں بھی اُسے یہی خیال رہتا تھا۔

ایک روز صبح کو اندرانی کتابیں لیکر باپ کے پاس آکر بیٹھی ہی تھی کہ اسکی ماں بھی آگئی اور بولی "جا رسوئی میں جاکر ذرا چاول دیکھ لے۔ ہمیشہ کام سے جان چراتی پھرتی ہے۔ کھانا پکانا کب سیکھے گی؟ چھوڑ یہ سب! ایک ٹھو گئی بڑی پڑھنے والی۔ ام اے پاس کرینگی نا!"

اندرانی کو مجبوراً اٹھ کر جانا پڑا۔ اسکی ماں میاں کے پاس بیٹھ کر کہنے لگی "تم اسکے بیاہ کا بھی فکر کروگے یا بس پڑھنا لکھنا ہی؟ پڑھنا اچھی بات سہی مگر اس سے کام تھوڑا ہی چلے گا" کبیر نے تیوری پر بل ڈال کر کہا "دن رات چیخ پکار سے کام چلیگا؟ میں مقدور بھر تو اسکے لیے بر ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کیا کروں غریب آدمی کی بیٹی کا بیاہ جھٹ پٹ نہیں ہو جاتا۔"

"اچھا پھر کوئی لڑکا تمہاری نظر میں ہے؟" بیوی نے پوچھا "تم تو مجھے کچھ بتلاتے نہیں اور پچھ دن سے سارے سوالوں کے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اگلا بس چلے تو میری کھال اتار لیں۔ لڑکی کی عمر گھٹ تو رہی نہیں، بڑھ رہی ہے۔ پندرہ برس کی ہوگئی۔"

شوہر نے تلخی سے جواب دیا "تو اسکے ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اسکی عمر پندرہ نہیں سولہ برس ہے۔ دو تین جگہ بات چیت کر رہا ہوں مگر کوئی امید نہیں۔ وہ لوگ جہیز بہت مانگتے ہیں۔"

بیوی نے کہا "ہم غریب سہی مگر اندرانی ایسی پیاری صورت کی ہے جیسے کسی راجکمار کی بہو ہو۔ لوگ اس بات کا خیال نہیں کرینگے؟"

شوہر نے ٹھنڈا سانس بھر کر جواب دیا "میری جان زری خوبصورتی کو کون پوچھتا ہے۔ معمولی سے کلرک کیلیے بھی پانچ ہزار کی رقم چاہیے۔ لوگوں کو حسن کی ضرورت نہیں دولت کی خواہش ہے۔ اور ہم کسی کو کیا دوش دیں جب ہم اپنے بیٹے کا بیاہ کریں گے تو ہم بھی روپیہ والا گھر دیکھیں گے۔"

بیوی نے کہا "ہم ایسے غریبوں کی نسبت اور ناپسند ہی کیا، لیکن ہر شخص کا حال ہمارا جیسا ہی تو نہیں، لوگ خوبصورت بہوئیں بھی چاہتے ہیں۔"

"متوسط الحال گھرانوں میں تو ایسا نہیں ہے ممکن ہے بڑے بڑے زمینداروں اور راجاؤں کے ایسے خیالات ہوں، کیونکہ انھیں اپنے بیٹوں کو فروخت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انکے علاوہ جو لوگ خوبصورت بہوئیں چاہتے ہیں وہ بال بچے والے دوہیجواں ہوتے ہیں یا عیاش اور اگر ممکن ہو تو خوبصورت لڑکیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایسا لڑکا چاہو تو آسانی سے مل سکتا ہے۔ جہیز بھی نہ دینا پڑے گا۔"

بیوی نے مایوس ہو کر جواب دیا "نہیں میری اپنی

بچی کو کوئی تیر نہیں دھکیلنا چاہتی۔ پہلے کہیں
دور کوشش کر دو۔"

کبیر نے کہا "کوشش تو کر رہا ہوں لیکن اسکے
ڈھکنے سے فائدہ ہی کیا۔ اس طرح رشتہ تو ہونے
سے رہا۔ اچھا جا کر اندرانی کو بھیج دو۔ اگر سنیل اس سے
آدھا بھی ذہین ہوتا تو مجھے یوں مایوسی نہ ہوتی۔"

بیوی نے کہا "وہ تو بالکل بچہ ہو گیا ہے
روز ٹکٹی جھلتی ہوں مارتی بھی ہوں مگر اسکے کان پر
جوں نہیں رینگتی۔"

کبیر نے مسکرا کر کہا "تم بھلا تو مزدور کھتی رہتی
ہو مگر فوراً ہی اسے کھانے کو بھی دے دیتی ہو۔ تو
بھلا اسے کیا شرم آنے۔ ایک دو دن بھوکا رکھو
تو اس کی آنکھیں کھلیں اور کام کرنے کی ضرورت معلوم ہو"

سنیل کی ماں یہ کہہ کر چلی گئی کہ "آخر تو میرا بچہ ہے
مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ وہ بھوکا رہے اور میں
کھاؤں۔"

اندرانی پھر آ کر پڑھنے بیٹھ گئی۔ باپ نے اس کو
دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا "آہ! غریبی سب میں بڑا
جرم ہے۔ یہ راج محل کے لائق ہے لیکن میں اس
موتی کو کوڑے پر پھینکنے کے لیے مجبور رہوں۔"

اندرانی نے کہا "پتا جی تمہیں معلوم ہے یہاں
لڑکیوں کا اسکول کھلنے والا ہے"

باپ نے جیسے گرد و پیش کے حالات کی کچھ خبر
نہ تھی پوچھا "واقعی؟ کون لوگ کھول رہے ہیں؟"
اندرانی نے کہا "کوئی دولتمند بیوہ ہے اسکے
اولاد نہیں ہے اس لیے وہ اپنا روپیہ دین کے کاموں میں
لگا رہی ہے۔ بہت سی لڑکیوں کو مفت تعلیم دی جائیگی
پتا جی! میں بھی چلی جاؤں؟"

باپ نے کہا "میں تو منع نہیں کرتا۔ مگر اپنی ماں سے
پوچھ لو ورنہ وہ سارا گھر سر پہ اٹھا لیں گی۔"

اور در اصل اندرانی کی ماں کو یہ بات بہت ناگوار
ہوئی۔ گو اس نے اندرانی کا نام ست اور نکما رکھ چھوڑا
تھا مگر پھر بھی غریب گھر کا بہت سا کام کر دیا کرتی تھی
وہی اکیلی اس کا ہاتھ بٹانے والی تھی اس لیے اس کا
علیحدہ کرنا اسے منظور نہ تھا "لڑکی کا پڑھ لکھ کر کیا ہوگا۔
اور پھر اب وہ سیانی ہو گئی ہے۔ ایسے پڑھنے کے دن
نہیں ہیں۔ لوگ نام رکھیں گے۔"

کبیر گھر گرہستی کی باتوں میں بہت کم دخل دیا کرتا تھا،
لیکن اس مرتبہ اس نے بیٹی کی حمایت کی اور بیوی سے
کہا تم سمجھتی نہیں ہو اس کا باہر نکلنا اور لوگوں سے
ملنا جلنا اچھا ہے۔ ممکن ہے کسی اچھے گھرانے کی نظر
چڑھ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو بس پھر کام بن جائیگا۔ میں نے
کتابوں میں اس قسم کے واقعات ہو جانے کا حال پڑھا ہے
تم اسے جانے دو۔"

غرض اندرانی کو بَر مل جانے کی دھندلی سی امید میں
اسکول جانے کی اجازت مل گئی۔ اسکے والدین کو تعلیم
کی تو زیادہ پروا نہ تھی، اس کو وہ لڑکی کے لیے ایک
غیر ضروری ہنر سمجھتے تھے، اگر ہو تو اچھا اور نہ ہو تو کوئی
مضائقہ نہیں۔ اندرانی کو فیس تو نہ دینی پڑتی تھی لیکن
پھر بھی صاف ستھرا رہنا پڑتا تھا اور کتابیں خریدنی پڑتی

تھیں۔ آخر ایک دن تنگ آکر اس کی ماں نے کہا
"میں روز روز اس کے لیے نئے کپڑے اور چیزیں
کہاں سے لاؤں، تم تو اپنی بیٹی کو میم صاحب بنانا
چاہتے ہو مگر جیب میں ٹکا نہیں ہے"

کبیر نے ہنس کر جواب دیا "اس کو بھی بیاہ کے
خرچ میں شامل سمجھو۔ اگر اس وقت دس روپیہ خرچ
کرو گی تو ممکن ہے کبھی ایک ہزار کی بچت ہو جائے"
غرض کسی نہ کسی طرح چند ضروری کپڑے مہیا کیے گئے
اور کبیر نے بعض چیزیں تنخواہ ملنے پر ادا کرنے کا وعدہ
کر کے قرض خریدیں۔ گھر آیا تو بیوی نے سستے بلاؤز
کو ہاتھوں میں اٹھا کر طنز سے کہا "یہ کیا لے آئے، یہ تو
مہینے بھی نہیں چلنے کے"

اس کے شوہر نے جواب دیا "پانچ روپیہ میں اس سے
بہتر نہیں مل سکتے اور دوں کی قیمت بہت زیادہ تھی
اندر سے کہہ دینا کہ وہ احتیاط رکھے"

اندرانی کو یہ چیزیں غنیمت معلوم ہوئیں۔ اس نے
بڑے شوق سے ان کو اپنے ٹین کے چھوٹے سے
صندوق میں حفاظت سے رکھ دیا۔ کتابیں اور دوسری
ضروری چیزیں پڑوسیوں سے مانگ لیں اور اسکول
جانے کو تیار ہو گئی۔ کبیر داخل کرانے ساتھ گیا۔

اندرانی کا مارے خوشی کے زمین پر پاؤں نہ
پڑتا تھا۔ ماں کھڑکی میں سے اُن کو جاتے ہوئے دیکھ
رہی تھی۔ اُس کی لڑکی کے حسن سے وہ تنگ و تاریک
گلی جگمگا اٹھی تھی اور یہ کیفیت تو اُس وقت تھی کہ وہ
نہایت سادہ لباس پہنے ہوئے تھی اور سنگھار بالکل نہ تھا
اگر کسی دولت کی لڑکی کی طرح سونے اور ہیرے کا زیور
اس کے پاس ہوتا تو کوئی راجکماری بھی اُس سے
بڑھ کر نہ ہوتی۔ وہ پرارتھنا کر رہی تھی کہ کوئی [illegible]
اندرانی کو پسند کر لے تو اُسے زندگی میں چین نصیب ہو

اندرانی کے خیالات کچھ اور ہی تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم
حاصل کر کے اپنے بھائیوں کی ہمسری کرنا چاہتی تھی۔ اُنکے
نزدیک اُنکی ذہنی پستی مسلم تھی اور وہ عورتوں کا ذکر
تحقیر سے کرتے تھے۔ اندرانی کو یہ بات ناگوار تھی۔ وہ
اُن کو دکھانا چاہتی تھی کہ ایک لڑکی بھی اُن کی ہم پایہ
بلکہ اُن سے بہتر بھی ہو سکتی ہے۔ سنیل اب ایک سینما
کے ٹکٹ خانہ میں کلرک ہو گیا اور قریب قریب روزانہ
مصور کتابیں اور رسالے گھر لاتا تھا۔ اندرانی انھیں
پڑھنا چاہتی تھی لیکن انگریزی سے واقف نہ تھی۔ وہ
سمجھتی تھی کہ اسکول میں جلدی سے انگریزی سیکھ لے گی
بیاہ کا اُسے بالکل شوق نہ تھا۔ وہ آس پاس کی
شادی شدہ لڑکیوں کو دیکھتی تھی کہ بال بچوں اور
گھر بار کی فکروں میں دبی رہتی ہیں۔ ان کی ہوس کا
خیال بھی کبھی اس کے دل میں نہ آتا تھا البتہ وہ استانیوں
کو دیکھ کر رشک کرتی تھی جو روزانہ اسکول کی گاڑیوں
میں ادھر سے گزرتی تھیں۔ انکی زندگی مسرور اور
بے فکر معلوم ہوتی تھی۔ انھیں اچھی تنخواہ ملتی تھی جسکو
وہ اپنی مرضی کے مطابق صرف کر سکتی تھیں۔ وہ
اچھا لباس پہنتیں اور کافی چست و چالاک نظر آتیں
اندرانی کی نظر میں وہ سب خوش و خرم معلوم ہوتی تھیں
وہ بھی انھیں کی طرح بننا چاہتی تھی۔ اس کی یہی زندگی

اسے کس قدر محبت تھی۔ وہ کس قدر پابند ہے۔ اسکے
۔ اسکی ماں کے پاس ایک پیسہ بھی اپنا نہیں تاہم کچھ
پس انداز نہیں کر سکتے۔ ہمیشہ اپنی مفلسی کا رونا روتے
رہتے ہیں۔ اگر اندرانی خود روپیہ کمانے لگے تو کیسی اچھی
بات ہو۔ اسے خوشی تھی کہ روپیہ نہ ہونے کے باعث
اس کا بیاہ نہیں ہوگا۔ اگر وہ چند سال اور کنواری
رہی تو لکھنا پڑھنا اور اپنا بسر اوقات کے لیے روپیہ
کمانے کے قابل ہو جائیگی۔

اسکول میں اس نے بہت جلد نام پیدا کر لیا۔ اسکے
غیر معمولی حسن، عقل و فراست اور محنت کی عادت کی
وجہ سے ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ وہ دوسری
لڑکیوں کی نسبت جلد سبق یاد کر لیتی۔ اسے اونچے
درجوں میں جلد جلد ترقی مل گئی۔ اس کی ماں کو اس پر
بڑا ناز تھا۔ تعلیم نسواں کے خلاف اس کی بدگمانی زائل
ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے اپنی بیٹی کو کالج میں تعلیم دلانے
کا بھی خیال آ جاتا تھا۔ لیکن ہمسائے اس کی زندگی تلخ
کیے دے رہے تھے۔ لڑکیوں کا کام پڑھنا نہیں۔ اب
اندرانی بیاہ کے لایق ہے۔ اگر وقت پر بیاہ ہو جاتا
تو اب تک کئی بچوں کی ماں بن چکی ہوتی۔

کبیرا اپنے مقدور بھر بیٹی کے لیے مناسب بر کی تلاش
کر رہا تھا لیکن روپیہ کے بغیر کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ بعض
لوگوں نے اس کی خوبصورتی کا حال سن کر لڑکی کو دیکھنے
کا خیال ظاہر کیا۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ جہیز ملنے
کا کوئی امکان نہیں تو بات ٹھنڈی پڑ گئی اور کوئی نہ آیا۔
کبیرا پر اور بھی بڑھاپا چھا گیا۔ اسکی بیوی کا مزاج بالکل
بگڑ گیا تھا، یہاں تک کہ اب سنیل بھی اس کے سامنے
نہ جا سکتا تھا اور کبھی کبھی اسے بھوکا رہنا پڑتا۔ گھر میں
آتا تو ماں ڈانٹ لیتی "موا کتا، کھانے کو شیر کمانے
کو گیدڑ۔ بہن کے لیے بر نہیں ڈھونڈھا جاتا۔ تھوڑی
سی خاک دو ٹکی کمانے کے لیے۔ اب ذات باہر
کر دیے جاؤ گے۔ کوئی ارتھی کو بھی ہاتھ نہیں لگائیگا
گھر میں پڑے پڑے سڑو گے۔"

لیکن سنیل ہندوستانی نظمیں بنانے میں مصروف
تھا اسے گھربار کے جھگڑوں میں پڑنے کی فرصت
نہ تھی۔ وہ جلدی جلدی کھانا کھاتا۔ خاموشی سے
صلواتیں سنتا اور بھاگ جاتا۔ بڑے بھائی اٹل
کو بھی برا بھلا سننے کا حصہ مل جاتا مگر وہ جواب
دیتا۔ "میں کیا کروں تم لڑکی کا بیاہ تو کرنا چاہتی
ہو اور پیسہ خرچ نہیں کرتیں۔ یہ کوئی آسان بات
تو نہیں۔ میں ایسی حماقت کی بات کس سے
کہدوں۔ پانسو روپے بھی ہوتے تو کچھ سہولت
ہو جاتی۔ اندرانی خوبصورت سہی لیکن نری خوبصورتی
کو پوچھتا کون ہے؟"

اندرانی یہ ساری گفتگو سنتی۔ مگر اسکے دل میں
اپنے ماں باپ کی مشکلات سے کوئی ہمدردی نہ ہوتی
بلکہ الٹا غصہ آتا۔ اس کے نزدیک سب کے سب
بیوقوف ہو گئے تھے۔ آخر بیاہ سے فائدہ کیا؟ شوہر
کی ضرورت اسی لیے تو ہوتی ہے کہ روٹیوں کا سہارا
ہو جائے۔ اگر وہ اسکی تعلیم ختم ہو جانے دیں تو وہ
اپنی چھوڑ دوسروں کی معاش کا ذریعہ بھی پیدا کر لیگی

اُسے محبت کی تمنا ضرور تھی کہ جوانی کا اقتضا ہے، لیکن وہ اس کو اپنے جیسے متوسط الحال طبقہ کے لیے ناممکن الحصول سمجھتی تھی۔ وہ اپنے گرد و پیش مصیبت تکلیف اور لاانتہا کشمکش پاتی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ دولت کے بغیر مسرت ممکن نہیں۔ اُسے زندگی کا دردناک پہلو ہر جانب نمایاں نظر آتا تھا تو ہر روز دن بھر کی سخت محنت کے بعد گھر آتا اور بیوی بچے بن [illegible]۔ افلاس نے غریب کے تمام طبعی احساسات مردہ کر دیے تھے۔ اندرانی سمجھتی تھی کہ باپ کی غریبی کی وجہ سے کسی اچھی جگہ بیاہ ہونے کی امید نہیں۔ یہ بہتر ہوگا کہ وہ تعلیم ختم کر کے سب سے بے نیاز ہو جائے۔ وہ جانتی تھی کہ بیاہ اُس کے لیے لازمی ہے لیکن وہ اپنے نفس کو دھوکا دینا چاہتی تھی۔ اسکول کا کورس تو اُس نے قریب قریب ختم کر لیا تھا اگر ماں باپ تھوڑا اور صبر کریں تو وہ کالج میں داخل ہو جائے لیکن اُسے اندیشہ تھا کہ لوگ اُسے زیادہ عرصہ تک نہ چھوڑیں گے۔

ایک روز صبح وہ پڑھنے بیٹھی ہی تھی کہ ماں آ گئی اور بُرا بھلا کہنا شروع کیا "بڑی میم صاحب بنی ہے۔ جب دیکھو پڑھتی ہی رہتی ہے۔ میں تمہاری چھوکری ہوں۔ میرے بس کا نہیں ہے کام دھندا۔ جاؤ جا کر پلیٹیں دھوؤ ابھی۔

اندرانی نے غصہ میں کتاب پھینک دی اور رکابیاں دھونے چلی گئی۔ ٹب کے پاس بیٹھ کر انہیں رگڑ رگڑ کے مانجنا شروع کیا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ ان سب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ اسکول میں ایک عمدہ انعام کا اعلان ہوا تھا جو سالانہ امتحان میں سب سے زیادہ نمبر پانے والی لڑکی کو ملتا۔ اگر ماں ہر وقت دخل نہ دیا کرتی تو اندرانی وہ انعام ضرور حاصل کر لیتی۔ وہ رکابیاں مانجھ رہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی "کیا سنیل بابو گھر پر ہیں؟"

اندرانی نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ ایک اجنبی نوجوان دروازہ پر کھڑا ہوا اُس کے بھائی کو بلا رہا تھا۔ اندرانی کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہ تھا، اُس نے کسی قدر ترشی سے جواب دیا "سنیل بابو یہاں نہیں ہیں۔ نگار خانہ میں جا کر دریافت کیجیے۔"

نوجوان نے جواب دیا "میں وہیں سے آ رہا ہوں، وہ وہاں بھی نہیں ہیں۔ مجھے اُن سے بہت ضروری ملنا ہے۔"

اندرانی نے کہا "تو پھر موسیقی کلب میں ہوں گے، اور کہاں جاتے۔"

نوجوان وہاں بظاہر بلا وجہ کچھ دیر کھڑا رہا پھر چلا گیا۔

اندرانی کی ماں فوراً باہر آئی اور بولی "تم غیر آدمی سے کیوں باتیں کر رہی تھیں۔ تمہارا یہ طریقہ بہت خراب ہے۔ میں کہتی ہوں تمہاری عمر کی لڑکی کے لیے ہر ایرے غیرے سے بات چیت کرنا مناسب نہیں۔"

"میں کیا کرتی۔" اُس نے ایک سیدھی سی بات

پوچھتی۔ اور کوئی جواب دینے والا نہ تھا۔ میں بھی گم ہو جا کر بھاگ آتی؟"

"بڑی نادان ہو۔ اسکول میں یہی سبق سیکھا ہے۔ چل جلدی سے آ جا۔ آج شام کو کچھ لوگ تجھے دیکھنے آئیں گے۔"

اندرانی نے اس کے جواب نہیں دیا اور جاکر پڑھنے بیٹھ گئی۔ کبیر نے اس روز بیماری کے بہانے رخصت لے لی تھی انیل کو اس بات کی ہمت نہ ہوئی اس لیے وہ معمول کے مطابق دفتر گیا۔ سنیل ابھی نہیں اس کے پیچھے ماں اسے خوب برا بھلا کہتی رہی اندرانی ناشتہ کیے بغیر اسکول چلی گئی اسے دل میں کوفت ہو رہی تھی۔ ماں نے اسے روکنا چاہا "تم یہاں کیوں نہیں رہتیں۔ اتنا کام پڑا ہوا ہے۔ مجھے کمرے صاف کرنا ہیں اور پھر کھانا پکانا ہے۔"

"میں کیا جانوں، مجھے کچھ پروا نہیں"۔ اندرانی نے ناک سکیڑ کر جواب دیا اور چلی گئی۔ ماں نے ملامت بھری آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا۔ کبیر نے کہا "ہمیں ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ سچ پوچھو تو ہم اسے بالکل کنوئیں میں ڈھکیل رہے ہیں، اس سے تو وہ ہمارے گھر پیدا ہی نہ ہوتی"

بیوی نے کہا "بس چپ رہو خوشی کے موقعہ پر زبان سے ایسی بات نہ نکالو۔ اگر تقدیر میں ہے تو بڑی عمر کے میاں کے ساتھ بھی خوش رہیگی۔ مگر ہاں اسکے بچے نہ ہوتے۔"

کبیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لوگوں کے طعنوں سے تنگ آکر آخرکار اس نے اندرانی کا بیاہ ٹھہرا دیا۔ دولہا دوہیجواں تھا۔ بچے بھی تھے۔ کبیر ہی کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ اسے ایک بڑی عمر کی بیوی کی ضرورت تھی جو گھربار کو بھی سنبھالے اور بچے بھی پال سکے۔ اسکے سامنے جب اس رشتہ کی تجویز پیش ہوئی تو وہ فوراً رضامند ہو گیا۔ کبیر کو بھی اس سے بہتر کوئی شخص نہ مل سکا۔ اسکا دل اپنی بیٹی کو بھینٹ چڑھاتے ہوئے خون رو رہا تھا مگر چارہ ہی کیا تھا۔

رشتہ قریب قریب طے ہو گیا پھر بھی چونکہ بیاہ سے پہلے لڑکی کو دیکھنے کا دستور تھا اس لیے دولہا اور اس کا ایک رشتہ دار اندرانی کو دیکھنے کے لیے اس روز شام کو آنے والے تھے۔

اندرانی اسکول سے واپس آئی تو گھر کی کایا پلٹ دیکھی۔ ہر کا کمرہ جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا گیا تھا اور اس کی آرائش کے لیے کچھ فرنیچر بھی مستعار لیا گیا تھا۔ ماں رسوئی میں مٹھائی بنانے میں مصروف تھی۔ وہاں گئی تو ماں نے جھٹ سے ایک تھالی سجا کر اسکو دی۔ "پہلے کچھ کھا لو۔ تم تو بالکل بیمار معلوم ہوتی ہو۔ اگر وہ لوگ تمہیں اس حال میں دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔"

ماں کی بات سن کر اندرانی کا غصہ بھڑک اٹھا لیکن اسنے کھانے سے انکار نہیں کیا۔ اس کے ہونٹوں کے خم سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دل میں کوئی منصوبہ باندھ رہی ہے۔ برابر والے گھر سے ایک لڑکی اسکا بناؤ سنگھار کرنے کے لیے آئی۔ اندرانی کی ماں نے رسوئی سے باہر آکر اسے دیکھا اور بولی "میری اچھی

بنی۔ دیکھنا اسے خوب بنا سنوار دینا، تم جانو ہلکے پاس بیٹھ رہو۔ تو ہے نہیں۔"

اُس نے جواب دیا "تمہاری بیٹی کو زیور کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دولہا بھی دیکھتے ہی خوش ہو جائیگا"

اندرانی نے جلدی سے کپڑے بدل لیے۔ برابر والے گھر کی لڑکی اُس کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر ہنسنے اور مذاق کرنے لگی۔ اندرانی نے منہ پھیر لیا۔ اسکی ماں نے ہاتھ کے اشارہ سے خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔

دولہا والے تھوڑی دیر میں آگئے۔ اُنکی آؤ بھگت ہوئی اور مٹھائی پیش کی گئی۔ اس وقت گھر میں بہت سی عورتیں اور لڑکیاں جمع ہو چکی تھیں۔ اُنہوں نے کواڑوں کے پیچھے سے اُس خوش نصیب شخص کو دیکھا اور بولیں "اندرانی کے لائق تو بالکل نہیں"

اندرانی کی ماں نے سر پیٹ لیا اور کہا "کیا بس کی بات ہے۔ فقیروں کو پسند کرنے کا کیا حق! اگر ایشور کی مرضی ہے تو اس کے ساتھ بھی خوش رہیگی۔"

اب کبیر گھر میں آیا اور اندرانی کو باہر والے کمرہ میں لے گیا۔ اُسے اندرانی کا منہ دیکھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ بوڑھے دولہا نے حیرت سے اندرانی کو دیکھا۔ اُس نے سنا تھا کہ لڑکی اچھی صورت کی ہے۔ لیکن اس تمامتر حسن کا گمان بھی نہ تھا۔

اُس نے چند معمولی سوالات پوچھے اور اسکے بعد ہمراہی رشتہ دار نے دولہن کو آشیرباد دیکر کہا "آپ اب تاریخ مقرر کر لیں۔"

اندرانی واپس آئی۔ اُسکی آنکھوں میں غصہ کے مارے آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ ماں تسلی دینے لگی لیکن اُس نے اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا "کیا تم واقعی اس بڈھے سے میرا بیاہ کر دوگی؟"

اندرانی کو روتا دیکھ کر اُس کی ماں کے بھی آنسو نکل آئے اُس نے جواب دیا "میری پیاری۔ کیا کریں ہم لوگ غریب ہیں۔ ہمیں اچھا لڑکا ملنا مشکل ہے۔ عمر تو ضرور کچھ ڈھلی ہوئی ہے مگر آدمی اچھا ہے۔ تمہیں خوش رکھے گا۔"

اندرانی نے سر جھکا لیا اور رونے لگی۔ ماں کو اور بہت سے کام کرنے تھے اس لیے چلی گئی۔ اتنے میں سنیل آگیا۔ اندرانی کو روتا ہوا دیکھ کر اُسے بڑا تعجب ہوا۔ پوچھنے لگا "کیا بات ہوئی، کیوں رو رہی ہو۔ تمہاری اُستانی نے تمہیں کچھ کہا؟"

اندرانی نے بگڑ کر جواب دیا "آپ کو معلوم ہے کہ میری اُستانیاں مجھے کچھ نہیں کہتیں۔ اور پھر اب تو تم ہمیشہ کے لیے اسکول چھڑائے دیتے ہو۔ کم از کم اس جنم کے لیے تو میری پڑھائی ختم ہو گئی۔"

سنیل پھر بھی کچھ نہ سمجھا اور پوچھا "آخر کیوں؟"

اندرانی نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "یہ لوگ کہیں سے ایک بڈھے کو پکڑ لائے ہیں اور اُس سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔"

سنیل تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "دیکھو بہن اگر میرا کہنا مانو تو میں اب بھی تمہیں بچا سکتا ہوں۔ ماتاجی اور پتاجی ناراض تو ضرور ہوں گے تمہیں اُن کا غصہ تو برداشت کرنا پڑیگا لیکن نقصان نہیں

ہونے کا بھی وعدہ ہے۔

اندرانی نے منہ اٹھا کر کہا "تم کہو تو میں ضرور مان لوں گی۔ اس بڈھے سے بیاہ کرنے سے بہتر ہو کوئی بات ہو۔ میں تو اس کے خیال سے بھی پریشان ہوں۔"

سنیل نے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی آس پاس تو نہیں ہے۔ پھر اندرانی کے قریب آکر اسکے کان میں کچھ کہا۔

اندرانی ایک دم زرد پڑ گئی پھر سرخ ہو گئی، کچھ دیر چپ رہی پھر پوچھا "ماتا جی اور پتا جی کو تو کوئی نقصان نہیں ہوگا؟"

سنیل نے سر ہلا کر کہا "ہرگز نہیں۔ اتنے بڑے شہر میں کون کس کی پروا کرتا ہے اور پھر انکے تو کوئی دوسری بیٹی بھی نہیں۔ تمہاری عمر اٹھارہ سال کی ہو گئی اور تم اپنے فعل کی مختار ہو۔ اسکے علاوہ قانونی کارروائی تو کرنے سے رہے۔ پتا جی اول اول ناراض ہوں گے، مگر پھر سب خوش ہو جائیں گے۔"

"مجھے اس کی تو پروا نہیں کہ وہ خوش ہونگے یا ناخوش۔ انہیں اگر کوئی نقصان نہ ہو تو میں تیار ہوں"

سنیل نے کہا "نقصان کچھ نہیں ہوگا۔ اچھا تو یہاں چند منٹ تم ٹھہرو۔ میں ابھی آیا۔"

اندرانی کی ماں کو رسوئی میں کسی کام کی ضرورت ہوئی۔ اس نے اندرانی کو پکارا مگر جواب نہ ملا۔ اس نے پھر پکارا۔ دوبارہ آواز دی مگر جواب ندارد۔ وہ غصہ میں بھر کر باہر آئی۔ اس کا خیال تھا کہ اندرانی جان بوجھ کر جواب نہیں دے رہی تھی۔ وہ اسے آکر جھاڑنا چاہتی تھی۔ مگر وہ نہ آئی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ آخر لڑکی کہاں چلی گئی بغیر پوچھے تو وہ کہیں جاتی نہ تھی کہیں کوئی بری بات تو نہیں ہو گئی۔

کبیر پڑوسیوں کی ستنارچیز واپس کرنے گیا تھا۔ واپس آکر اسنے خوابگاہ میں بیوی کو پریشان صورت خاموش کھڑے ہوئے دیکھا۔ اس نے حیرت سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

بیوی نے جواب دیا "اندرانی کہیں نہیں ملتی"۔ کبیر پر جیسے بجلی گر پڑی۔ اس نے بیچارگی سے ادھر ادھر دیکھا اسکی نظر ایک خط پر پڑی جو اندرانی کی میز پر رکھا تھا جسے اندرانی کی ماں نے نہیں دیکھا۔ اسے اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

سنیل نے لکھا تھا۔

"پیارے پتا جی! میں اندرانی کو لیے جاتا ہوں۔ میں بالکل نکما ہوں پھر بھی اندرانی کو بھینٹ چڑھتے ہوئے خاموشی سے نہیں دیکھ سکتا۔ ہماری کمپنی کے ڈائرکٹر مسٹر گھوش نے اس کو دیکھ کر پسند کر لیا ہے، وہ فلم کے لیے ایک ایسی ہی لڑکی کی تلاش میں تھے۔ اندرانی نے فلم میں کام کرنا منظور کر لیا ہے اس کو کافی تنخواہ ملیگی۔ اس کا فکر نہ کیجیے۔ ہمارا ڈائرکٹر بہت مہذب اور دولتمند شخص ہے۔ امریکہ ہو آیا ہے۔ اندرانی منظور کرے تو وہ اس سے شادی کرنے کو بھی تیار ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھی رضامند ہو جائیگی۔ انکے بیاہ کے بعد ہم سب لوگ آپ کی آشیرباد لینے آئینگے۔ سنیل"

کبیر تو گویا پتھر کا ہو گیا۔ "نامراد مر کیوں نہ گئی"۔ اسکی بیوی نے رو کر کہا "کمبخت نے ہمیشہ کے لیے ناک کاٹ دی"

(ستیا دیوی۔ "ماڈرن ریویو")

نقش و نگار

(از جناب ضیاء احمد صاحب ایم اے بدایونی)

دنیا میں صداقت ایک ایسی چیز ہے کہ جہاں ہوگی کبھی نہ کبھی اپنا اثر ضرور دکھائے گی۔ محبت ہو یا عداوت مدح ہو یا ذم ع - مزا دے جائے گی جو دل سے ہوگی - یہی کلیہ شاعری پر بھی بجنسہ صادق آتا ہے اگر شعر میں صداقت اور شاعر میں خلوص ہے تو کلام بغیر تاثیر دکھلائے نہیں رہ سکتا۔ خیالات میں واقعیت، جذبات میں جوش اور انداز بیان میں آمد - یہی چیزیں ہیں جو شعر کو شعر بنا دیتی ہیں - عرب شاعر نے کیا خوب کہا ہے

وان اشعر بیت انت قائلہ　　شعر یقال اذا انشدتہ صدقا

یعنی سب سے بہتر شعر جو تم کہہ سکتے ہو وہ ہے جس کو سن کر لوگ کہہ اٹھیں کہ "سچ کہتا ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ جن شعراء کے یہاں یہ صداقت موجود ہے اُن کا کلام از دل می خیزد و بر دل می ریزد کا مصداق ہے اس کے برخلاف جن اساتذہ نے کاوشِ فکر، دقتِ خیال اور آورد سے کام لیا ہے اُن کے نتائج فکر پڑھ کر ہم اُن کے زورِ کمال اور قدرتِ کلام کا اعتراف تو ضرور کرتے ہیں، مگر طبیعت میں جوش و ولولہ نہیں پیدا ہوتا - گویا اُن کی شاعری دماغی ورزش کا سامان تو بہم پہنچاتی ہے، روح کی بالیدگی کا سرمایہ نہیں رکھتی

جلیل صاحب قدوائی ملک کے اُن نوجوانوں میں ہیں، جو اپنے اندر حقیقی شاعرانہ صلاحیتیں رکھتے ہیں - اور جو شاعری کے اس نکتہ سے آگاہ ہیں - اُن کو دیکھکر اور اُنکے مجموعہ کلام "نقش و نگار" کو پڑھ کر میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ وہ داستانِ دل اُس وقت تک نہیں بیان کرتے جس وقت تک کہ وہ حقیقی داستان نہ ہو اور وہ اپنے آپ کو بیان کرنے پر مجبور نہ پائیں - اگرچہ یہ درست ہے کہ اس مجموعہ میں خیال اور ادا کے اعتبار سے (جیسا کہ آپ آگے ملاحظہ کریں گے) بعض ساقطات ایسے ہیں جنکو خامی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے - (جلیل صاحب نے اپنے کلام کی نسبت خود کوئی دعویٰ کو سامنے نہیں رکھنا پسند نہیں کیا ہے اور "عرض مصنف" میں نہایت صفائی سے اس امر کا اعتراف کر دیا ہے) مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ شاعری کا ایک صحیح نصب العین رکھتے ہیں، جو اُنکے ذوقِ سلیم کی دلیل ہے - اور نصب العین کا وصف یہی ہے کہ سترقی ہو یعنی نظر کے سامنے اور رسائی سے

نامعلوم۔ انسان کا فرض بس اس قدر ہے کہ وہ اس نصب العین سے غافل نہ ہو اور مجھے یقین ہے کہ کوئی ذی فہم یہ الزام جلیل صاحب پر نہیں لگا سکتا۔ علاوہ بریں جو کلام اس کے بعد شائع ہوا ہے اس میں مسامحات بھی شاذ و نادر ملتے ہیں۔ نقش و نگار ایک چھوٹا سا جاذب نظر مجموعہ ہے جس میں چند نظمیں، قومیں اور رباعیاں ہیں۔ اور سب اپنے رنگ میں خوب ہیں۔ جلیل صاحب مولانا حسرت موہانی کے رنگ کے معتقد اور مقلد ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے رنگ حسرت کی پیروی نہایت کامیابی سے کی ہے۔ چونکہ مولانا حسرت کا تعلق سلسلۂ مومن سے ہے اس لیے بے محل نہ ہوگا اگر ہم اس سلسلہ کی کڑیوں کو ملانے اور اس طرز کے اساتذہ کی خصوصیاتِ کلام دکھانے کی غرض سے اصل کیفیت کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر دیں۔

مشہور ہے کہ مومن دہلوی نے شروع میں شاہ نصیر کو (جو دہلی کے ناسخ کہے جاتے ہیں) اپنا کلام دکھایا تھا۔ چنانچہ ابتدائی غزلوں میں وہی رنگ جھلک رہا ہے۔ مگر صاحب ذوقِ صحیح تھے اس لیے طبیعت نے خود اس روش سے اِبا کیا اور ایک نئی طرز کے موجد ہوئے جس کی خصوصیات نازک خیالی اور بدیع الاسلوبی ہیں۔ ان کے شاگرد مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی نے بہ قول صاحب گل رعنا "خیال کی دلفریبی اور بیان کی رنگینی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی" کو اس خوبی کے ساتھ سمویا کہ بیاختہ دل سے داد نکلتی ہے۔ شیخ امیر اللہ تسلیم لکھنوی تلمیذ نسیم کے عہد تک اردو شاعری بہت سی منزلیں طے کر چکی تھی اور زبان کافی طور پر منجھ چکی تھی یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں پختگی کلام، دلپذیری مضامین، رنگینیِ الفاظ اور چستیِ تراکیب زیادہ پائی جاتی ہے۔ نسیم مدتوں لکھنؤ میں رہے اور تسلیم تو لکھنؤ کے متوطن ہی کہلاتے تھے۔ مگر مقامِ تعجب بھی ہے اور موقع شکر بھی کہ دونوں نے اپنی آن قائم رکھی اور "طرز شاعرانِ لکھنؤ" سے متاثر نہ ہوئے۔ مولانا حسرت تسلیم کے شاگرد ہیں اور جیسا کہ صاحب شعر الہند نے لکھا ہے انھوں نے لکھنؤ کا حق ہمسائگی صرف اس قدر ادا کیا ہے کہ وہاں کی زبان اختیار کی ہے۔ ورنہ ان کے کلام میں بیک وقت غالب کی حقیقت طرازی اور مومن کی لطافتِ بیان کار فرما نظر آتی ہیں چنانچہ خود فرماتے ہیں

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود   تجھ سے حسرت شاعری کا نام روشن ہو گیا

مولانا دورِ حاضر کے متغزلین میں چوٹی کے شاعر ہیں اور اُن کی غزلوں میں جذبات و واردات کا جوش، فارسی تراکیب کی دلکشی، اور مختصر بحروں کا انتخاب ایسے تیر و نشتر ہیں جو انسان کو تڑپا دیتے ہیں۔

جلیل صاحب قدرۃً جذبات و وارداتِ قلبیہ سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے

شاعری میں وہ پیرایۂ اظہار اختیار کیا جو جذبات و واردات سے بحث کرتا ہے۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر
وہ مولانا حسرت کے سامنے اپنا نذرانۂ عقیدت ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں

وہ رمز شناس عاشقی ہے — ہے درد بھری تری کہانی
نغموں میں بھی اک تڑپ ہے پیدا — اللہ رے ترا غم نہانی
ارباب کمال میں تری قدر — افسوس یہ ہے کہ کم نے جانی
ہے حسن ہے ابھی نقشِ اردو — ہوگی کبھی تیری قدر دانی

جلیل صاحب کی نظموں میں عموماً جذبات کی فراوانی، تاثیر کی بہتات، صفائی اور سادگی نمایاں ہے۔
اور ان کو پڑھ کر یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے کہ شاعر نے جو کچھ لکھا ہے خود متاثر ہونے کے بعد لکھا ہے اور
در حقیقت یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ سب سے پہلی نظم جسکے چند شعر اوپر نقل ہوئے حسرت موہانی
پر ہے۔ خیالات کی صداقت اور بیان کی سلاست کے لحاظ سے یہ نظم نہایت پُراثر اور پاکیزہ ہے۔
ایک نظم مولانا محمد علی مرحوم کی والدۂ ماجدہ بی اماں مرحومہ کے متعلق ہے جس میں ہر ہر قدم پر پختگی اور
سلاست کی شان نظر آتی ہے۔ چند شعر بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں

جس پہ قرباں ہوں زیست عدم تیرا ہے — جس پہ چلتا ہے جہاں نقش قدم تیرا ہے
تیری تعمیر میں سرمایۂ غیرت پنہاں — تیری فطرت میں اک احساس حمیت پنہاں
ہر روش درس پیام اجل دیتی ہے — زندگی تیری یہ تعلیم عمل دیتی ہے
زندگی نذر رہ ملت بیضا کر دے — ذرۂ خاک کو ہمدوش ثریا کر دے

"ہیرو" اور "تکیہ" پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ بھی جذبات اور تاثیر کے لحاظ سے کامیاب ہیں۔ "ہماری تمنا"
میں ترنم اور دلآویزی کی کمی نہیں۔ آخری نظم جسکا عنوان "برکھا رت" ہے بہت نیچرل اور سادہ ہے اور
حالی کے رنگ کا بہت کامیاب تتبع ہے۔ خوف طوالت مانع ہے ورنہ یہ نظم نذرِ ناظرین کی جاتی۔ چند شعر
ملاحظہ ہوں شاید ان سے پوری نظم کی خوبی کا کچھ اندازہ ہو سکے

اُٹھے کالے کالے بادل — ایسے کالے جیسے کاجل — گھر گھر آیا گھم گھم برسا — پانی چھم چھم چھم چھم برسا
سبزہ ہوا میں لہراتا ہے — فرش پہ موتی بکھراتا ہے — پیڑ نہا دھو کر نکھرے ہیں — پہنے کپڑے سبز کھڑے ہیں
بالائیں پریاں جھول رہی ہیں — حسن پہ اپنے پھول رہی ہیں — نین رسیلے چھب متوالی — ہنسی انوکھی بات نرالی

نظموں کے بعد غزلوں کا نمبر ہے۔ جلیل صاحب کو درد و یاس سے قدرتی مناسبت معلوم ہوتی ہے۔
جسکا نتیجہ یہ ہے کہ اس قسم کے مضامین غزلوں میں زیادہ ہیں۔ اور چونکہ جذبات میں صداقت ہے اس لیے

پڑھنے والے کی طبیعت پر لامحالہ اثر ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ ہی زبان و انداز بیان میں صفائی اور گھلاوٹ جو لوازم غزل سے ہیں بافراط ہیں۔ فلسفیانہ زاویۂ نگاہ اور ہلکا صوفیانہ رنگ بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ اور لطف سے خالی نہیں۔ مثال کے طور پر چند شعر سنیے اور لطف اُٹھایئے

ہم محوِ اصل تھا نہ اسیرِ مجاز تھا ۔۔۔ اک راز تھا کہ محوِ تماشائے راز تھا

دل نے تڑپ کے کر دیئے طے سارے مرحلے ۔۔۔ میں مبتلائے کشمکشِ ضبطِ راز تھا

دوسرے شعر میں ایک خاص کیفیت کو نہایت نیچرل انداز سے بیان کیا ہے۔ بعض وقت تو انسان چاہتا ہے کہ راز کو ضبط کرے۔ مگر راز ہے کہ افشا ہوا جاتا ہے۔ ایسے موقع پر عجب ہیجان اور کشمکش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اتنے میں دل کی تڑپ تمام عقدہ کھول دیتی ہے۔ جس سے گو رسوائی ہو مگر طبیعت کا بار ہلکا ہوتا ہے۔ اسی کو شاعر نے "کر دیئے طے سارے مرحلے" سے تعبیر کیا ہے۔

ہے وہی میرے لیے حاصل یک عمرِ وفا ۔۔۔ تم نے جو جرمِ محبت نظر انداز کیا

مقاد کے مختلف ہونے سے نقطۂ نظر میں کس قدر فرق ہو جاتا ہے کہ ایک چیز جو زید کے نزدیک قطعاً ناقابلِ التفات ہے، عمرو کے عقیدہ میں وہی سرمایۂ کائنات ہے! مثلاً محمد علیؒ کی ذہانت، خطابت، انشا پردازی، دفتری نقطۂ خیال سے قابلِ توجہ ہیں مگر اُنکی سیاسی سرگرمیاں ناقابلِ اعتنا اور اُن کی فہرستِ کمالات میں محسوب نہ ہونے کے لائق۔ حالانکہ قوم پرستانہ زاویۂ نظر سے دیکھیے تو جس چیز نے محمد علی کو محمد علی بنا دیا وہ اُنکی یہی "شوریدہ سری" تھی۔

کس درجہ وہ مجبور بھی ہے رحم کے قابل ۔۔۔ جس کو کہ کسی نے کبھی گریاں نہیں دیکھا

بات کس قدر سچی ہے اور شاعر کی افتادِ طبع کی کیسی غمازی کر رہی ہے۔

عشق میں راس نہیں صاحبِ ارماں ہونا ۔۔۔ شرط پہلی ہے یہاں سوختہ ساماں ہونا

یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں ہے کہ لکھنے والے نے یہ شعر اثر میں ڈوب کر لکھا ہے۔

تلاشِ حسن میں جو دل کسی منزل پہ رک جائے ۔۔۔ اُسے اہلِ نظر آوارۂ منزل سمجھتے ہیں

نصب العین کی شان یہی ہے کہ وہ بے ترقی اور ناممکن الحصول ہو۔ حالی نے اسی مضمون کو دوسرے طریقہ سے ادا کیا ہے

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں ۔۔۔ اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

عہدِ عشرت کی یاد رہے تو یہ ۔۔۔ دل میں نشتر سا اک چبھوتی ہے

عہدِ عشرت کی یاد کو نشتر چبھونے سے تعبیر کرنا نہایت مطابقِ فطرت ہے۔ نفسِ خیال میں جدت نہیں

چشمہ تو ساری رات روتی ہے ۔۔۔ جب کہ دنیا تمام سوتی ہے
باغ میں چاندنی چٹکتی ہے ۔۔۔ آنکھ بے اختیار روتی ہے
موسم گل کا تذکرہ نہ کرو ۔۔۔ دلِ مرحوم یاد آتا ہے
اس کی محفل میں اب بار ہے دل ۔۔۔ شاد جاتا ہے شاد آتا ہے

آخر میں چند رباعیاں ہیں جنکی تعداد دس ہے اور جلیل صاحب کی شاعری کی خصوصیات اُن میں بھی جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر ایک رباعی درج کی جاتی ہے

رباعی

مشرق سے جو کل سحر نمودار ہوئی ۔۔۔ رونق دہ باغ و دشت و کہسار ہوئی
لیکن مرے دل کی آرزوے مایوس ۔۔۔ ایسی سوئی کہ پھر نہ بیدار ہوئی

آخر میں ایک ناقد کا فرض ہے کہ کلام میں جزوی فروگزاشتیں جو کہیں کہیں دکھائی دیتی ہیں اُن کو صفائی سے بیان کر دے۔ نقش و نگار میں بعض جگہ طرز ادا میں اور بعض جگہ بندش الفاظ میں سقم نظر آتا ہے۔ اور اگرچہ ایسے اسقام کلام کے مجموعی محاسن پر بیدا اثر نہیں ڈالتے تاہم اگر نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ مثلاً مولانا حسرت سے یہ کہنا

تو جلد بریں کا میہماں ہے ۔۔۔ ہو گی وہیں تیری میہمانی

اس میں مصرعۂ اول ذرا کھٹکتا ہے۔ یا مولانا شرر کے مرثیے میں ردیف کو جس طرح صرف کیا ہے اُس میں کسی قدر جھول معلوم ہوتی ہے

لکھنؤ میں اک دکاں باقی تھی علم و فضل کی ۔۔۔ ہو گئی بند آج وہ بھی اک دکانِ عندلیب
کوئی کہتا تھا ابھی جاری رہے گا دلگداز ۔۔۔ ہو یہ سچ تو ہے یہی کافی نشانِ عندلیب

صفحۂ ۹ پر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عجب باغ لیے ہوں دل پر۔ "دل میں" چاہیے۔ صفحہ ۱۱۔ اس دیدۂ پُر آب کو یونہیں بلکتا چھوڑ کر۔ دیدہ کے لیے بلکنا نہیں کہتے۔ صفحہ ۱۶۔ موتی کھیرنا کی جگہ موتی کھیرنا چاہیے۔ ملے ہزار۔ کھٹ اور چھپ ۔ تک اور جھپک ۔ بچپن اور لڑکپن کے قوافی بھی محل نظر ہیں۔ صفحہ ۱۰ پر پیاری میں یا کا اظہار اور صفحہ ۲۲ پر عذر کے عین کا وزن سے گرنا۔ صفحہ ۳۰ پر ہم کی ہا کا ساقط ہونا۔ نیز (جس کو کہ کسی نے کبھی گریاں نہیں دیکھا) میں کاف کی تکرار سے ترکیب میں تنافر پیدا ہونا معیوب ہے۔ اسی طرح لذتِ ناکامی کو لیکن دل سے مت کم کیجیے۔ یہاں "مت" متروک ہونے کے علاوہ یوں بھی ناگو

معلوم ہوتا ہے۔ یا۔ "جو کہے اب آپ سے یہ فتنۂ قم کیجیے" - اس مصرعہ میں فتنۂ قم کی ترکیب دلپسند نہیں۔
قطع نظر اسکے کہ ایسی لغزشیں اس مجموعہ میں کم ہیں اور جو ہیں وہ چنداں اہم نہیں، یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جلیل صاحب کا زمانۂ ابتدا کا کلام بڑی حد تک ان لغزشوں سے پاک ہے۔
اسکے علاوہ بفحوائے اِنّ الحسنات یذہبن السیّئات اُنکے کلام کی مجموعی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے ان چند مسامحات سے کوئی نقصان نہیں۔ اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ جلیل صاحب قدوائی صحیح معنی میں شاعر کہے جانے کے مستحق ہیں اور اُنکے مجموعۂ کلام (نقش ونگار) میں بلاشبہ درد و اثر کے ایسے بہت سے شعر یہاں ہیں جو اہلِ دل کو تڑپا دینے کے لیے کافی ہیں۔

"یاد نہیں"

(از جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی)

خود فراموش قفس ہم ہیں چمن یاد نہیں
غیر کے ہو گئے ایسے کہ وطن یاد نہیں

ناز نازِ حسن کی ایسی ہے اگر ناز نہ کر
تجھکو اس چاند کا تاریک گہن یاد نہیں

اس کی محفل میں ہوا تھا کبھی اپنا بھی گزر
باتیں کچھ کی تھیں مگر مجھکو دہن یاد نہیں

شکوۂ ہجر کی خواہش نہ کرے دل لے تجھے
سامنا ہو تو کوئی رنج و محن یاد نہیں

فرقت ایسی کی گردش کی یہ عادت ہے کہ مجھے
مل کے بیٹھے تھے کبھی روح و بدن یاد نہیں

کیوں سناؤ گے وہ صحبت اہلِ دنیا کو باتیں
کیا تمہیں طرزِ مکافاتِ سخن یاد نہیں

طرۂ گیسو پہ ابھی تیری محبت کی قسم
میں نے دیکھا تھا مگر مشکِ ختن یاد نہیں

کیا بتاؤں تجھے میں تیری محبت کیا تھی
دست و پا کو مرے زنجیر و رسن یاد نہیں

تند... پا کے ہل جاتے ہیں آوارہ وطن
جب تو نکلے ہوئے موتی کو عدن یاد نہیں

ذبح ہونے سے مرے اُنکو تعجب ہے تو ہو
اپنے ابرو کی وہ خوں ریز شکن یاد نہیں

کون سنتا ہے یہ افسانۂ غم اے ثاقب
قابلِ اہلِ زمانہ کوئی فن یاد نہیں

واجد علی شاہ

(از خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

۱۳ فروری، ۲۱ محرم ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء بعد شام سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بہادر کی تاجپوشی اور تخت نشینی کا غلغلہ تمام شہر میں ہے۔ آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا ہے۔ پلٹنیں سلامی کو پرا جمائے کھڑی ہیں۔ کارچوبی خوشنما وردیاں پہنے ہوئے سوار ٹہل رہے ہیں رسالہ داروں کے نئے ٹھاٹھ ہیں در دولت سے گلستان ارم اور کوٹھی فرح بخش تک روشنی کے ٹھاٹھ لگے ہیں۔ ہر برج پر تمامی کی جھنڈیاں نصب ہیں۔ خاص بازار سے رمنے تک میلہ لگا ہے۔ رونق پھر رہی ہے۔ تماشائیوں کا سڑک پر ہجوم ہے۔ انتہائی روشنی سے دیوالی کی رات معلوم ہوتی ہے۔ دریا میں چراغوں کی رنگینی کے عکس سے پانی میں آگ لگی ہوئی ہے دریا میں بجرے سجے ہوئے کھڑے ہیں شناوں کے بادبان چھوٹے ہوئے ہیں۔ مچھلی والے بجرے پر ڈنکا ترم بج رہا ہے۔ ماہی ڈانڈوں سے ملبتر تمغے سجا رہے ہیں۔ باغ گلستانِ ارم رشکِ بہشت بنا ہوا ہے۔ کوٹھی فرح بخش دلھن کی طرح سجی ہوئی ہے۔ لوگ آپس میں طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ غربی اور شرقی دونوں پھاٹک رمنے کے بند ہیں (اتنے میں مہاراجہ بالکرشن کی سواری آئی، پھاٹک کھلا) روش پر نواب امین الدولہ ٹہل رہے ہیں۔ فتح الدولہ اور عنایت علی رسالدار کو اپنے ہمراہ لیکر بارہ دری کی طرف سے کھڑکی سے گلستانِ ارم میں چلے آئے۔ مہاراجہ بالکرشن نے فرمانِ جلوس سُنایا۔ دوسری طرف مصلح السلطان اہتمام الدولہ حیدر حسین خاں شرف الدولہ غلام رضا خاں۔ مرزا وصی علی خاں۔ حفیظ الدولہ مولوی میر باقر علی۔ سفیر شاہی کھڑے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سواری کی آمد آمد کا غل ہوا۔ چوبدار مرد ہے، پکار رہے ہیں "سواری ہے بادشاہِ عالم کی نگاہ روبرو" چاروں طرف سے ہٹو بچو کی آواز آ رہی ہے۔ کرنل رچمنڈ رزیڈنٹ بہادر خفا ہو رہے ہیں کہ کیوں اتنا غل مچایا ہے، آہستہ بولو، آہستہ بولو۔ اس شور و غل میں سُنتا کون ہے۔ آخر چیرا اسی سے ولایتی لیکر کمر میں لگائی اور صاحب بہادر بھی قرینے سے کھڑے ہو گئے۔ جب سواری کا بوجھ زینے پر چڑھنے لگا۔ ہمراہیوں کی کثرت سے آہنی جنگلا جو زینے کی گرد میں لگا تھا، ٹوٹ کر نیچے آ رہا۔

بادشاہ کی سواری بارہ دری کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بڑے صاحب سے ہاتھ ملایا!

بادشاہ کے مقرب خاص امیر الدولہ میر مہدی علی خاں سونے کا خاصدان ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں۔ نواب علی نقی خاں تسبیح ہاتھ میں لیے وظیفہ پڑھتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ سیف الدولہ علی حسین خاں داروغہ دیوان خانہ صحن میں کھڑے ہیں۔ بادشاہ تخت رواں پر سوار ہوئے۔ بارہ دری کے کمرہ خاص میں جا کر دوگانہ شکرانہ ادا کیا۔ عبائے خاص دوش پر ہے، سیف ایرانی ہاتھ میں ہے، گلے میں موتیوں کا مالا پڑا ہے، کمر سے پٹکا بندھا ہے۔ مشروع کا پائجامہ بڑے پائینچے کا پہنے ہوئے، سرخ کشمیری شال کی قبا پر متن زیب جسم ہے، دو پلی ٹکے دار کامدانی کی پیوازی ٹوپی زیب سر ہے، زلفیں کھینچی ہوئیں۔ گھیتلا جوتا کامدار زیب پا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے زینے سے تخت شاہی پر جلوس فرمایا۔ نواب امجد الدولہ نے چھوٹی کشتی جس پر تاج شاہی رکھا تھا پیش کی۔ ابھی بادشاہ تخت پر کھڑے تھے کہ جناب مجتہد العصر نے تاج شاہی بسم اللہ کہکر زیب سر کیا۔ ایک طرف بڑے مجتہد بھی تاج میں ہاتھ لگائے ہوئے ہیں۔ بآواز بلند کہا "واجد علی شاہ بادشاہ اودھ ہوئے"۔ پھر بادشاہ تخت رواں پر چار زانو ہو بیٹھے۔ تخت کے اوپر ایک کارچوبی شامیانہ بھی کھنچا ہے جسکی ڈوریاں ریشمی ہیں۔ اور کھمبے سونے چاندی کے ہیں۔ اسکے نیچے چتر مرصع خواص لیے کھڑا ہے پشت پر دو چنور بردار کھڑے ہیں (یہ وہی تخت و تاج و چتر ہے جو غازی الدین حیدر بادشاہ کے وقت میں نو کروڑ روپیہ میں تیار ہوا تھا) پہلے نواب نے نذر پیش کی۔ پھر شہزادوں نے نذریں دیں۔ بڑے صاحب زیر تخت کرسی پر بیٹھے اور سب صاحب لوگ کھڑے رہے۔ ملازموں نے ادب سلام کہکے نذریں پیش کیں۔ تمام رجواڑوں کی طرف سے نذریں گزریں۔ نذر کی اشرفیاں زیری تورلیوں میں جمع ہوئیں۔ بادشاہ نے پہلے نام سادات حسینی کے دستخط فرمائے۔ مبارک سلامت کا غل ہوا۔ کئی ہزار طبلوں پر چوب پڑنے لگی، اونچے سروں میں شہنائی بجائی گئی۔ نور کے طائفے چلے سنہری روپہلی سوا مت پڑے، دوپٹوں پر کامدار جھالریں بنی ہوئی، پچکے کی تیلی، اطلس کی گوٹ، ستوتیاں ٹکائے ہوئے، کمر لچکتی ہوئی۔ سرمئی کناری نہ ہے۔ سرخ، سبز کارچوبی دوشالے، جہاں ذرا ٹھمک گئے، کانوں کی بجلیاں تڑپنے لگیں۔ انکا بھاؤ بتا کے ناز سے پھرنا، راگنی کا ساز کے پردے سے نکلنا، تان کا ٹوٹنا عجب لطف دکھا رہا ہے۔ سرمئی پشوازیں بہار دکھا رہی ہیں۔ ڈھاڑی بکٹ نفاری ساز بجا رہے ہیں کالا نوت، پربن، کندھوں پر اچھے اچھے رکھے کھڑے ہیں تارہ ہوا اور بیٹھ گئے۔ ٹپہ، غزل، ٹھمری، ترانہ، خیال اڑا رہے ہیں۔ آوازوں میں سمندر کا ناٹ ہے۔ چینی لوگ مزے سے جلترنگ بجا رہے ہیں۔ فرنگی ارگن بجا رہے ہیں۔ کہیں بلیہ ہوتا ہے اہل دربار کو خلعت ملے۔ نمک خواروں نے مزے لوٹے۔ فرمان معافی جاری ہوئے۔ سلامی کی

توپیں شہر کے چاروں ناکوں پر چھوڑی گئیں۔ ڈھنڈورا پٹا "خدا کا ملک بادشاہ کا، آج سے اودھ کے
بادشاہ سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بہادر ہوئے۔ جو کوئی عدول حکمی کریگا سخت سزا پائے گا" پھر
تخت سے اُتر کر تخت رواں پر سوار ہوئے۔ ایک طرف بڑے صاحب ایک طرف چھوٹے صاحب
ہمرکاب ہوئے۔ روشن چوکی والے شادیانہ بجاتے ہوئے ساتھ ساتھ ہوئے۔ کمپنی بہادر کی طرف کے
فوج واسطے حفاظت کے آئی۔ نواب امین الدولہ مع اہل کار رخصت ہوئے۔ چھاؤنی سے پانچ
کمپنیاں واسطے انتظام کے آئیں۔ حضور کی سواری محلسرا میں اُتری۔ جرنیل مرزا سکندر حشمت بھائی
کو نذر دے کر محبت آبدیدہ ہوئے۔ بادشاہ بیگم، نواب ملکہ کشور فخر الزمانی، نواب تاج آرا بیگم
والدۂ بادشاہ نے بلائیں لیں، سیلے صدقے اُترنے لگے۔ محلسرا کے تمام محلے نے نذریں دیں۔
اتنے میں ابر رحمت گھر کر آیا اور کچھ ترشح ہونے لگا۔ صبح کو نواب امین الدولہ سعید الدولہ اہل
دربار منتظر تھے کہ حضور تشریف لائے۔ پھر وہی جشن وہی جلسے ہونے لگے۔ انعام اکرام تقسیم ہوا۔
کچھ دنوں بعد نواب امین الدولہ معزول ہو گئے۔

۵ اگست ۱۸۴۷ء کو نواب علی نقی خاں بہادر کی سفارشیں پہنچیں۔ بادشاہ نے طلب فرمایا۔
حاضر ہوئے۔ سلام کیا۔ نذر دی۔ انتیس ۲۹ پارچے کا خلعت وزارت مرحمت ہوا "رکن رکین خلافت
جہان داری عمدۂ سلطنت و شہریاری امیر الامرا مدار المہام وزیر الممالک معتمد الخاقان تلمیذ
السلطان سیف مسلول رمح مصقول معرکہ دشمن گاہی ساعد ساعد پاکیزگی و صفا ناہج مناہج صداقت
و وفا مرید مرشد پرست اخلاص گزین خانہ زاد عقیدت سرشت صفوۃ آئین مختار وزی اقتدار یار
وفادار سپہ سالار رستم ہند مدار الدولہ منتظم الملک نواب علی نقی خاں بہادر سہراب جنگ فدوی خاص
جہان شاہ ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ" خطاب ملا۔
پچیس ہزار روپیہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ انھوں نے دست بستہ عرض کی کہ فیض آباد کا دارونہ عدالت
(رح) حفیظ اللہ فرنگی محل کا مولوی بے قصور محسن وزیر سابق کے عتاب میں آگیا ہے۔ میری دوستی کے
صلے میں خانہ نشین ہے، مروت سے بعید ہے کہ میں خلعت وزارت پہن لوں اور وہ محروم رہ جائے۔
حکم ہوا اچھا اُسکو بھی پیش کرنا۔ دوسرے روز مولوی صاحب طلب ہوئے۔ اُنکے گھر میں تیسرا
فاقہ تھا، کہ شاہی چوبدار نے آکر سلام کیا۔ اور کہا کہ آپ کو وزیر اعظم نے یاد فرمایا ہے۔ یہ اسکو
امداد غیبی سمجھ کر حاضر آستانۂ عالی ہوئے۔ دربار لگا ہوا ہے۔ وزیر علی نقی خاں دست چپ
کرسی پر جلوہ فرما ہیں۔ شہزادے داہنی طرف کرسی پر جلوہ افروز ہیں اکابر سلطنت، رفقاء

مصاحبین اپنے اپنے مراتب سے بیٹھے ہیں۔ کہ ڈیوڑھی سے چوبدار نے آواز دی "بادشاہ عالمیان ہو! مولوی حفیظ اللہ حاضر ہے۔ نگاہ روبرو۔" اسی طرح ڈیوڑھی سے بادشاہ تک دو طرفہ چوبدار کھڑے ہوئے آواز پیچھے لب دیکھے لگا رہے ہیں۔ کہ میر دوسے کو خبر ہو گئی۔ اُس نے دست بستہ عرض کیا "مولوی حفیظ اللہ حاضر ہے"۔ بادشاہ نے اشارۂ ابرو سے اجازت حضوری دی۔ مولوی حفیظ اللہ لال پردہ کے پاس کھڑے تھے۔ داروغہ ڈیوڑھی نے حکم دیا جانے دو۔ پردہ اُٹھتے ہی اندر کا اکھاڑا نظر آیا۔ جا بجا سے جھک جھک کر برابر سلام کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے داہنے ہاتھ پر پانچ اشرفیاں (جو کسی مہاجن سے سودی لائے تھے) رکھ کر بایاں ہاتھ نیچے رکھ کر نذر دکھائی بادشاہ نے دست مبارک بڑھا دیا۔ نذر قبول ہو گئی۔ نشست دوبارہ خلعت ملا اور دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ سابق پر عطا ہوئے۔ خلعت میں چیرہ، گوشوارہ، دوشالہ، رومال، تھان کمخواب، پٹکا، تسبیح مونگے کی مرحمت ہوئی۔ رخصت ہو کر گھر آئے اور پہلے سرکار کی ہاتھی پر سوار کر کے بھیجا۔ گھر پر آ کے ایک ہزار روپیہ مہاجن سے اور سودی لیا۔ شادی کو میر دے چوبدار شاہی محل کے لوگ انعام کے لیے حاضر ہوئے۔ بمشکل تمام پانچ سو روپیہ انعام دے کر جان بچائی۔ لوگوں نے کہا یہ مولوی صاحب ہیں جو کچھ دیں تبرک سمجھ کر لے لو۔ دوسرے روز واجب العرض پیش کی کہ بخشی گری پر حکم بعید یا جانے جو مسطور ہو گئی۔ مولوی صاحب اپنے سابقہ عہدہ پر ممتاز ہو کر فیض آباد گئے۔ اسی طرح آج بخشی کا محکمہ مہینوں رہا۔ رفیق خاص خواجہ اسد علی خاں قلق کو خلعت سرفرازی عطا ہوا۔ مصاحبین خاص میں ضم ہو گیا۔ پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ آفتاب الدولہ مہر الملک خواجہ اسد علی خاں شمشیر جنگ کا خطاب ملا۔ خدمت دیوان خانہ تفویض ہوئی۔ مہاراجہ بالکرشن کو مشیر الدولہ خطاب ملا۔ خدمت دیوانی حاصل ہوئی۔ حیدر حسین کو اہتمام الدولہ خطاب ہوا۔ دیوان عام کے مہتمم ہوئے۔ بشیر الدولہ، گلبدن الدولہ، دیانۃ الدولہ، احسن الدولہ، فیروز الدولہ خواجہ سرا نواب ناظر محلات شاہی مقرر ہوئے۔ حاجی شریف ترک سواران خاص اور کئی پلٹنوں کے رسالدار ہوئے۔ ثروت الدولہ، وہاج الدولہ ملازمت سے موقوف ہو گئے لیکن شاہی وظیفہ جاری رہا۔

شاہان اودھ کے عہد میں بلکہ تمام ہندوستان کے راجہ مہاراجہ بادشاہوں کے زمانے میں یہ بات تھی کہ جب کوئی شخص بادشاہ کے دربار میں پیش ہوا اور اُسکی نذر بادشاہ نے قبول فرمائی، سمجھ لینا چاہیے کہ اُسکو ملازمت سرکاری ضرور ملیگی۔ یا کسی کو بادشاہ نے خطاب مرحمت فرمایا، تو خطاب کے ساتھ ہی ساتھ معقول تنخواہ ضرور مقرر کی جائیگی۔ جس میں عزت و آبرو کے ساتھ بسر کر سکے۔ اور یہ

تنخواہ پشت در پشت چلی آتی تھی۔ تمام اودھ کی سلطنت میں ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جسکو خطاب ملا ہو اور شاہی وظیفہ نہ مقرر ہوا ہو۔ آخری شاہ اودھ کے دربار میں تو تمام ہندوستان کے چیدہ لوگ مصاحبوں میں ملازم تھے۔ ایک سے ایک بڑھکر شاعر، مولوی، دانا، حکیم۔

اسی زمانہ میں جناب عالی کا مزاج کچھ ناساز ہوگیا۔ کچھ دنوں کے بعد الحمدللہ صحت حاصل ہوئی۔ ہزاروں صدقے اُترے، تیل ماش بڑے تزک و احتشام سے آئے۔ منتیں مرادیں پوری ہوئیں۔ غسل صحت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ حکم ہوا کہ جلد سامان کیا جائے۔ سلطان عالم حضرت عباس کی درگاہ تشریف لے جائیں گے۔ جلو خانے میں سب موجود ہوں۔ مجرئی بھی سب حاضر ہوں۔ چوک میں آئینہ بندی ہونے لگی۔ تاریخ معینہ پر بادشاہ حمام میں تشریف لیگئے۔ نہا دھوکر جامہ خانہ میں رونق افروز ہوئے۔ پوشاک کی کشتیاں آئیں، لباس فاخرہ زیب جسم فرمایا اور ہوادار پر سوار ہوکر باہر تشریف لائے۔ عماری دار ہاتھی پر سوار ہوئے۔ جھنڈیاں تمامی کی جھک گئیں۔ سلامی کی توپیں چھوٹیں۔ شہر میں سواری کی دھوم تھی۔ در دولت سے درگاہ تک تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے۔ سواری بہت قرینے سے نکلی۔ آگے آگے تمام فوج، اسکے بعد پلٹنیں برق دم لیتیں، سواروں کے پرے دور سے غل ہوگیا لو اب ڈنکا آیا، نگینہ دار ماہی مراتب آپہنچا۔ اتنے میں بیرق اور پرچم دکھائی دیا۔ نشان و علم نظر آئے۔ آگے آگے سقے چھڑکاؤ کرتے ہوئے، مشکوں میں گلاب اور کیوڑا بھرے ہوئے، تمامی کی لنگیاں باندھے ہوئے۔ دو تین سو شتر سوار زرتار شملے باندھے ہوئے پیدا رویاں طاؤس کی طرح مست سانڈنیاں جھیلا، کہیں ایک منزل سے دوسری کی۔ باندار چوبدار، روشن چوکی والے شہنائی نواز جلودار غنچہ رو، گلفام دہنے بائیں چنور ہلاتے ہوئے۔ چہرہ پر سورج مکھی لگائے ہوئے۔ صید و شکار کا سامان قراول غضب کے ترکارتی ہیں، عقاب تیز پر۔ خالی بوچے اور ہوادار سرخ نالکیاں نفیس پالکیاں انگریزی باجے بجتے ہوئے جارہے ہیں۔ اتنے میں جلوس خاص آیا۔ برچھے والے برق انداز بھالے والے خاص بردار کندھوں پر خاصیاں رکھے ہوئے۔ پگڑی سادہ مرصع کار۔ نقیب آواز لگاتے ہوئے با ادب ملاحظہ دولت و اقبال کی ترقی۔ ساتھ میں ہاتھیوں کے غول مخملی کارچوبی جھولیں پڑی ہوئیں۔ ریشمی رستے، طلائی مرصع کام کٹ، مستکوں پر چاند سورج لگے ہوئے، دانتوں پر چوڑی چڑھی ہوئی، فیلبان بھی نکھرے ہوئے، سر پر چیرے باندھے ہوئے، طرّے اور گوشوارے لٹکتے ہوئے، گنگا جمنی گجباگیں لیے ہوئے، جن پر بادشاہ کے عزیز قریب جلوہ افگن۔ بیچ میں بادشاہ سلامت، ادھر ادھر تمام دولتخواہ ارکان دولت ہمراہی میں اشرفیاں، روپے لٹاتے ہوئے۔ اس شان و شوکت

سے سواری درگاہ میں داخل ہوئی۔ پہلے انگلی اُٹھا کے زیارت پڑھی، پھر ضریح مبارک آنکھوں سے مس کی۔ دو ہزار روپیہ کی نذر چڑھائی۔ اسی شان و شوکت سے واپس آئے۔ ذرا سے درگاہ تک جانے میں لاکھوں روپیہ تقسیم ہو گیا۔ اسی طرح رات دن جلسے رہتے تھے۔ لوگ اس آرزو میں رہتے تھے کہ ایک مرتبہ بادشاہ ہمارا سلام لے لیں، پھر دولت کی کمی ہی نہیں ہے۔ جس کا سلام قبول ہو گیا، مالا مال کر دیا۔ خلعت دیا تو زر بھی دیا۔ خطاب دیا تو تنخواہ بھی کر دی۔ اس داد و دہش کا یہ فیض تھا کہ لکھنؤ میں سونا برس رہا تھا۔ الماس علی خاں خواجہ سرا نواب ناظر کے چہیتے مسیح علی خاں، حیدر بخش کی فقط شب برات میں لاکھ روپے کا آتشبازی کترا جاتا تھا، عبیر کی طرح اُڑایا جاتا تھا جس کی سیر [illegible] صبح کو مہترانی چن لے جاتی تھی۔

آرزوے حامد

(از جناب مولوی حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ)

وصل یار فتنہ خو کی آرزو — یاس کی یاس آرزو کی آرزو

آرزو کی جان کبھی ایمان بھی — تم سے جان آرزو کی آرزو

اُن کا جلوہ بار بار آیا نظر — پھر وہی ہے آرزو کی آرزو

پھر گیا دل سے جو وہ تیر نگاہ — اب کسے دل میں لہو کی آرزو

ہے غم عشق آرزو کی آبرو — دل کو ہے اس آبرو کی آرزو

اُنکو فرصت ہوش اڑانے کی نہیں — ہم کو اُن سے گفتگو کی آرزو

گر کے طے ہوتی ہے اے دل راہ دوست — اور تجھکو جستجو کی آرزو

برق وحدت نے جلا دی دل کے ساتھ — انتہائے ما و تو کی آرزو

صلح کرتے جان دیکر تجھ سے ہم — تو نے کب اے جنگجو کی آرزو

آرزوے دل پہ دیتے جان ہم — [illegible] ہوتی عدو کی آرزو

دامن آلودہ اشک رہے تر ہوا — رہ گئی بے حسرت رفو کی آرزو

چاہیے گل کی حقیقت پہ نظر
کر نہ حامد رنگ و بو کی آرزو

قبر میں جانا ہے جنکو حشر کا ساماں کریں

آخری غزل ہے جو حضرت ریاض مرحوم نے اپنے دستِ خاص سے تحریر فرما کر رسالہ کو دی تھی مقطع پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ واقعی قبر کا سامان ہو رہا ہے۔ (ایڈیٹر)

جمع ہو وہ مشقے کریں وہ جمع تو پیکاں کریں
میرے دل میں رہ کے جو چاہیں مرے ارماں کریں

کیوں مجھے رخصت کریں کیوں حشر کا پیماں کریں
نزع میں کیوں آئیں مجھ پر آپ کیوں احساں کریں

اس طرح چھیڑیں مرے دل سے مرے پیکاں کریں
گدگدی اُٹھے تبسم غنچۂ پیکاں کریں

لوٹتے ہیں لطف آنکھوں پر فرشتے ساتھ کے
ان فرشتوں سے بھی چھپ چھپ کے ہم عصیاں کریں

عشق وہ ہے نام جسکا رکھ دیا ہے سب نے درد
درد ہو تو چارہ گر سب درد کا درماں کریں

ہیں مزے کی اے دلِ بیتاب تیری شوخیاں
چل حسینوں پر تجھے صدقے کریں قرباں کریں

جان پر دشمن کی لوٹیں ہم کو اُن سے کیا غرض
جا کے اپنا کام اُن کے ناوک و پیکاں کریں

آ بسے دل میں گلگشت کرتا ہے حسینوں کا خیال
وہ پری خانہ ہے جس گھر کو حسیں ویراں کریں

سینے پر آنچل ہے خلوت میں تہِ فانوس شمع
شمع عریاں ہے یونہی کیا شمع کو عریاں کریں

بند آنکھیں ہوں مری۔ آنکھوں میں صورت آپکی
نزع میں آپ اس طرح مشکل مری آساں کریں

اپنے پہلو میں اُنھیں رکھینگے ہم دل کی طرح
گھر تو گھر ہے زخم میں ڈوبے ہوئے پیکاں کریں

جان ڈالے آئنہ میں چاند سی صورت کا عکس
آئنہ بن جائے دل اتنا اُسے حیراں کریں

ہم مسلماں بھی ذرا شانِ خدائی دیکھ لیں
کعبۂ دل میں کسی کافر کو اب مہماں کریں

کچھ پہنچے صحرا کے کانٹے کچھ پہنچے گلشن کے پھول
دل میں اب سودا یہ ہے آباد پھر زنداں کریں

اب تو ہر قطرہ نظر آتا ہے طوفاں در بغل
کم ہے۔ جو کچھ۔ تو ہمارے دیدۂ گریاں کریں

یہ نہ سمجھیں جانے والے۔ دو قدم کی راہ ہے
قبر میں جانا ہے جنکو حشر کا ساماں کریں

کیوں اُلٹے پھرتے ہیں مجھسے دل ہدف کیونکر بنے
رُخ ذرا میری طرف بھی ناوکِ مژگاں کریں

لطف ہے مقتل میں چمکیں آج دو دو بجلیاں
آستیں تو چڑھ چکی ہے تیغ بھی عریاں کریں

موت کا خوابیدہ سایہ ہے ہماری زندگی
خون ارماں ہو چکے۔ اب خاک ہم ارماں کریں

نشۂ مے سے جواں بنتے ہیں پیری میں ریاضؔ
وقت ہے توبہ کریں اب قبر کا ساماں کریں

درسِ عبرت

(از جناب حکیم آشفتہ صاحب لکھنوی)

تو مسلماں ہے مگر اسلام سے بیگانہ ہے — بے خبر مذہب سے، مذہب کے لیے دیوانہ ہے
بے مروت ہے، فنا تیرا ابھی کیا افسانہ ہے — جس نے اپنی شمع گل کر دی ہے وہ پروانہ ہے
تجھ میں نخوت آ گئی خودداریاں جاتی رہیں
سب تری رنگینیاں گلکاریاں جاتی رہیں

تیرا شیوہ تھا کبھی انسانیت انسان تھا — جوہر اخلاق سے کامل ترا ایمان تھا
تجھ میں تھا بذل و کرم جود و سخا احسان تھا — تھی تری قدرت معاون قدرتی سامان تھا
تو نے طاعت چھوڑ کر ارض و سما کو کھو دیا
بھول کر احکامِ دیں دل سے خدا کو کھو دیا

بے وفا تو بن گیا تجھ میں وفا باقی نہیں — بے حیائی آ گئی شرم و حیا باقی نہیں
ہاتھ اٹھتے ہیں مگر شانِ دعا باقی نہیں — ہو چکا تاریک دل یادِ خدا باقی نہیں
تو نے فطرت کو مٹا ڈالا ارے یہ کیا کیا
اپنی آزادی کے ہاتھوں روح کو مردہ کیا

تجھ کو تعلیمِ کرم تھی آ گئی بیداد کیوں — تو سراپا خلق تھا پھر بن گیا جلاد کیوں
بھول کر آئینِ مذہب ہو گیا آزاد کیوں — تو نے کی تعلیمِ دینِ احمدی برباد کیوں
تو جو دیتا ہے زمانے بھر کو تعلیمِ قتال
کوئی اس تبلیغ پر قرآں کی آیت بھی ہے دال

کوئی مجمل یا مصرح آیتِ قرآن ہے — یا کوئی ان گالیوں کی جنگ کا فرمان ہے
ہر طرف تیری زباں سے حشر کا سامان ہے — تو بڑا ایمان والا ہے ترا ایمان ہے
پھر اسی منہ سے مساواتِ عمل کا ادعا
دور ہو جا راہ سے اے مفسدِ دینِ خدا

گالیوں سے مقصدِ تبلیغ کرتا ہے ادا — واہ اے پیرِ طریقت واہ کیا کہنا ترا

درس عبرت

[illegible] ساختہ مذہب کہ لے صل علیٰ — ایک باجے کی صدا نے جسکو ٹکڑے کر دیا

جب یہ کفرستان تھا پڑھتا تھا تو جب بھی نماز
تیرا اسلام بھی وہی ہے اور وہی اب بھی نماز

یاد کرتا ہوں وقت سنگھ کا جو طور تھا — رات دن گھنٹوں کا بجاؤں میں دور دور تھا
آ [illegible] باس سے بڑھ کے آگے جو رہا — تیرا مذہب آج ہے کچھ اور پہلے اور تھا

چپ رہی اس وقت اٹھی جس وقت شان اقتدار
اب گلے کٹوا رہی ہے کیوں زبان اقتدار

تیری اپنوں سے بھی کب غیر تو پھر غیر ہے — سب موحد کلمہ گو ہیں اور سب میں بیر ہے
فرقہ فرقہ متحد باہم ہو یہ بھی خیر ہے — یاں تو ہے کعبہ ہی کعبہ یاں بھی دیر ہے

تجھ کو مسلم ذہنیت پہ اپنی شرم آتی نہیں
روح اس ظلمتکدے میں بیٹھ کے گھبراتی نہیں

اے معظم مولوی اے محترم ویدانتی — سچ ہے دنیا آپ کو اب تک نہیں پہچانتی
عقل اگر ہوتی تو کہنا اس طرح کیوں مانتی — آپ اس سے خاک چھنواتے بھلا یہ چھانتی

یہ گلا باجے کی آوازوں پہ کٹواتی کہیں
چار پتوں کے لیے پیپل کے کٹ جاتی کہیں

مذہبی پردوں میں کیا کیا ہوتے کھیلے ہیں شکار — شام غم سے کی ہے پیدا کس طرح صبح بہار
لہر کے حیوانوں پہ انسانوں کی جانوں کو نثار — واہ کیسی شان سے پیدا کیا ہے اقتدار

کیا مقدس وید کی سچی یہی تعلیم ہے
کیا اسی بنیاد حق پر مذہبی تنظیم ہے

کیا انہیں اخلاق پر انسانیت کو ناز ہے — کیا صداقت میں یہی ڈوبی ہوئی آواز ہے
کیا یہی سچا دھرم ہے وہ جو قدرت ساز ہے — قابل تقلید عالم کیا یہی انداز ہے

خود غرض انسان یوں مذہب سے بیگانہ نہ بن
تجھ پہ دشمن ہنس رہے ہیں دیکھ دیوانہ نہ بن

ہند کے نور نظر غیرت سے تو مرتا نہیں — بےحیا خرما کے ٹھنڈی سانس بھی بھرتا نہیں
دیکھتا ہے رات دن آنکھوں سے کچھ کرتا نہیں — ہاتھ سر پہ دختران ہند کے دھرتا نہیں،

درسِ عبرت

کتنے ہیرے تو نے پھینکے خزفِ تخلیط میں
کتنے موتی تو نے رولے دامنِ تخلیط میں

خفتہ اے دیں تجھے اب رہنما دیتے نہیں　　بند آنکھیں کھول لے فرصت ذرا دیتے نہیں
پوچھتا ہے راہ تو تجھ کو بتا دیتے نہیں　　ہوش آجائے کبھی ایسی دوا دیتے نہیں

یاد رکھ یہ خاک میں اک دن ملا دینگے تجھے
راہزن ہیں لوٹ لینگے اور ستا دینگے تجھے

تجھکو یہ نفرت کہ سایہ سے بھی کتراتا ہے تو　　غیر پہلو سے نکل جائے تو گھبراتا ہے تو
بے نیازی پر مزا پھر یہ کہ اِتراتا ہے تو　　اس طرح تاریخِ ماضی روز دُہراتا ہے تو

جب یہ عالم ہے تو بس عشرت کے ساماں ہو چکے
ایک آشفتہ بیاں ہند و مسلماں ہو چکے

جذباتِ آثر

(از جناب مرزا جعفر علی خاں آثر لکھنوی بی اے)

درد سے مانوس جانِ مبتلا ہو جائیگی　　رفتہ رفتہ بیقراری مدعا ہو جائیگی
جب شکستِ رنگ سے دل کی جلا ہو جائیگی　　خود فنا آئینۂ رازِ بقا ہو جائیگی
زندگی اُسکے لیے دامِ بلا ہو جائیگی　　جسکو بھی تجھسے محبت بے وفا ہو جائیگی
نامرادی کا بُرا ہو، ہاتھ اٹھ سکتے نہیں　　ڈر یہ ہے بربادِ ناموسِ دعا ہو جائیگی
شمع کے مانند سرگرمِ طلب رہنا ہے شرط　　رات بہتے بہتے منزل زیرِ پا ہو جائیگی
دل ہی بٹ جائیگا یا مٹ جائیگی دلکی خلش　　کچھ نہ کچھ دردِ محبت کی دوا ہو جائیگی
نشہ بن کر جب تری آنکھوں سے ٹپکیگا شباب　　اور ہی کچھ کیفیت نامِ خدا ہو جائیگی
کیا خبر تھی اُس نگاہِ فتنہ زا کے سامنے　　دل میں جو بھی آرزو ہے التجا ہو جائیگی

زمزمۂ غم نے جہاں چھیڑا رگِ جاں کو آثر
زندگی اک نغمۂ بے ساز و صدا ہو جائیگی

[illegible] ... [illegible]

[illegible] ... کیا اگر چہ زندگی دور رہت۔ خدا کرے مرحوم کے احباب اور

[illegible] ... جلد شایع کریں کہ یہی [illegible] کی اصلی یادگار ہے۔

[illegible] ... اگر چہ ذکر اکثر شخصی حیثیت سے نظر کی جائے تو حضرت [illegible] کے

[illegible] کی طرح اخلاص و محبت و خلق و مروت کا مجسمہ تھے۔ حتی کہ چھوٹوں اور نیازمندوں

کو [illegible] کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

محبی حکیم عبدالوالی صاحب نے بیس سال ہوئے جب لکھنؤ سے ایک اعلیٰ درجہ کا رسالہ "معلومات" جاری کیا تھا جو تھوڑے ہی دنوں کے بعد بند ہو گیا۔ حال ہی میں "معلومات" پھر شایع کیا گیا ہے۔ اب تک چار پرچے نکل چکے ہیں اور ہر پرچہ میں لایق اڈیٹر کے قلم سے جو مضامین نکلے ہیں وہ پڑھنے کے لایق ہیں، اور اس قابل ہیں کہ ملک کے ارباب فکر و حل اور انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب غور سے اُن کا مطالعہ کریں۔ اُردو رسائل میں اس وقت معلومات ہی ایسا پرچہ ہے جو سیاسی، تمدنی اور تعلیمی زندگی کے اہم مضمون سے بحث کرتا ہے اور یہ امید بیجا نہ ہوگی کہ اہل ملک اسکی قدر کرنے میں بخل کو دخل نہ دینگے۔ معلومات کے بعض مضامین کے متعلق کسی قدر تفصیل سے لکھنے کا موقع انشاءاللہ پھر ملیگا۔ فی الحال ایک غلط فہمی دفع کرنے کے لیے کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔

مولانا شوکت علی صاحب، رہیلکھنڈ کے حلقہ سے اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار ہیں اور سر محمد یعقوب انکا مقابلہ ہے۔ معلومات یعقوب صاحب کا حامی ہے اور مولانا شوکت علی کی اُمیدواری کا مخالف۔ انکا ... سے ایک صحبت میں جبکہ حکیم عبدالوالی اور مولانا دونوں موجود تھے میں نے مولانا شوکت علی کی امیدواری سے اختلاف کیا۔ یہ واقعہ معلومات میں جس محل پر بیان کیا گیا ہے، اندیشہ ہے کہ اُس سے یہ سمجھا جائیگا کہ میں بھی سر یعقوب کا موید ہوں۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ یعقوب صاحب میرے دیرینہ کرم فرما ہیں، مگر ملکی سیاسیات میں ہم دونوں کا مسلک سالہاسال درازسے مختلف ہے۔ اس لیے مولانا شوکت علی کے مقابلہ میں انکی تائید کا وہم بھی [illegible] مولانا شوکت علی کی اُمیدواری سے میرے اختلاف کی بنا صرف اس قدر ہے کہ جب تک جزیرة العرب کامل طور پر برطانوی حکومت کے تسلط سے آزاد نہ ہو جائے، مولانا شوکت علی اسمبلی میں جا کر وفاداری کا حلف اٹھائیں گے، تو میری رائے ناقص میں انکا یہ فعل اسلامی غیرت و شرف کے منافی ہوگا۔

[illegible] میں انتظام کیا گیا مگر چونکہ دوست [illegible]
[illegible] اب [illegible] جلد شائع کر دیں کہ یہی شاعر کے کمالات کی اصلی یادگار ہے۔
[illegible] کو چھوڑ کر اگر شخصی حیثیت سے نظر کی جائے تو حضرت [illegible]
[illegible] بھائیوں کی طرح اخلاص، محبت اور خلق و مروت کا مجسمہ تھے۔ حتیٰ کہ چھوٹوں اور دنیا [illegible]
[illegible] بزرگی کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

محبی حکیم عبدالوالی صاحب نے بیس سال ہوئے جب لکھنؤ سے ایک اعلیٰ درجہ کا رسالہ "معلومات" نکالا تھا جو تھوڑے ہی دنوں کے بعد بند ہو گیا۔ حال ہی میں "معلومات" پھر شائع کیا گیا ہے۔ اب تک چار پرچے نکل چکے ہیں اور ہر پرچہ میں لائق اڈیٹر کے قلم سے جو مضامین نکلے ہیں وہ پڑھنے کے لائق ہیں، اور اس قابل ہیں کہ ملک کے ارباب فکر و علم اور انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب غور سے اُن کا مطالعہ کریں۔ اُردو رسائل میں اس وقت معلومات ہی ایسا پرچہ ہے جو سیاسی، تمدنی اور تعلیمی زندگی کے اہم شعبوں سے بحث کرتا ہے اور یہ امید بیجا نہ ہوگی کہ اہل ملک اسکی قدر کرنے میں تامل کو دخل نہ دینگے۔ معلومات کے بعض مضامین کے متعلق کسی قدر تفصیل لکھنے کا موقع انشاءاللہ پھر ملیگا، فی الحال ایک غلط فہمی دفع کرنے کے لیے کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔

مولانا شوکت علی صاحب، رہیلکھنڈ کے حلقہ سے اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار ہیں اور سر محمد یعقوب [illegible] اُنکا مقابلہ ہے۔ معلومات سر یعقوب صاحب کا حامی ہے، اور مولانا شوکت علی کی اُمیدواری کا مخالف۔ [illegible] سے ایک صحبت میں جبکہ حکیم عبدالوالی اور مولانا دونوں موجود تھے، میں نے مولانا شوکت علی کی امیدواری سے اختلاف کیا۔ یہ واقعہ معلومات میں جس محل پر بیان کیا گیا ہے اندیشہ ہے کہ اُس سے یہ سمجھا جائیگا کہ میں بھی سر یعقوب کا موید ہوں۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ یعقوب صاحب میرے دیرینہ کرم فرما ہیں، مگر ملکی سیاسیات میں ہم دونوں کا مسلک سالہاسال درازسے مختلف ہے۔ اس لیے مولانا شوکت علی کے مقابلہ میں اُنکی تائید کا وہم [illegible]

مولانا شوکت علی کی اُمیدواری سے میرے اختلاف کی بنا صرف اس قدر ہے کہ جب تک جزیرۃ [illegible] کامل طور پر برطانوی حکومت کے تسلط سے آزاد نہ ہو جائے، مولانا شوکت علی اسمبلی میں جا کر وفاداری کا حلف اُٹھائیں گے، تو میری رائے ناقص میں اُنکا یہ فعل اسلامی غیرت و شرف کے منافی ہوگا۔

[illegible] قوام

[illegible] خوشبو [illegible] بہت [illegible] لاکھوں [illegible] پان خوش ذائقہ ہو جاتا ہے۔ قیمت فی تولہ [illegible]

خشکی قوام

فی تولہ قسم اول [illegible] قسم دوم [illegible] قسم سوم [illegible]

زعفرانی قوام

فی تولہ قسم اول [illegible] قسم دوم [illegible] انتہائی قوام فی تولہ [illegible]

شاہی برقی قوام

بالکل نئی ایجاد ہے جس میں مسالوں سے خوشبو اور تلخی پیدا کی جاتی ہے اور تمباکو بالکل شامل نہیں ہوتی۔ جو اصحاب تمباکو نہ کھاتے ہوں اسکے استعمال سے پان کو خوش ذائقہ بنائیں قیمت فی تولہ [illegible]

تمباکو کی گولیاں

طلائی فی تولہ [illegible] نقرئی فی تولہ [illegible] زعفرانی فی تولہ [illegible]
سادہ بلا ورق فی تولہ [illegible]

تمباکو خوردنی

زردہ پتی فی سیر [illegible]
زردہ خشکی [illegible]
„ دانہ دار [illegible]
زردہ خشکی نقرئی [illegible]

تمباکو کشیدنی

حقہ پینے والوں کے لیے طرح طرح کے خوشبودار خمیرہ تمباکو تیار کیے جاتے ہیں قیمت فی سیر [illegible]

المشتہر: مظفر الملک اینڈ سنز لکھنؤ

واحدی منجن اکسیر دنداں

یہ منجن اس نسخے سے بنایا گیا ہے جو خود واحدی صاحب ایڈیٹر نظام المشائخ کو ان کے ڈاکٹری طبیب کے زمانے میں [illegible] میں مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم نے عنایت فرمایا تھا۔ اس سے دانتوں اور مسوڑھوں کی تمام خرابیاں اور تکلیفیں رفع ہو جاتی ہیں۔ جس حال سے واحدی صاحب اسے خود بھی استعمال کرتے ہیں اور اپنے شہر کے ہر مزدور کو بھی دیتے ہیں۔ ہر شخص اسکا شاہد ہے اور اسے سب سے اچھا منجن تسلیم کرتا ہے۔ سینکڑوں ہلتے ہوئے دانت اس منجن نے جوڑ دیئے۔ متعدد آدمی ہیں جنہیں پائیریا کی شکایت تھی اور ہر کھانے کے ساتھ مسوڑھوں کا خون اور مسوڑھوں کی پیپ پیٹ میں اتر اتر کر جن کی صحت کو برباد کر رہی تھی صرف اس منجن کو ملنے سے ان کے مسوڑھے اچھے ہو گئے اور آج وہ خدا کے فضل سے تندرست ہیں۔ جس منجن سے پائیریا جیسے موذی مرض کو آرام ہوتا ہو اور جس منجن سے ہلتے ہوئے دانت جڑ جاتے ہوں اس کے دوسرے معمولی فوائد بیان کرنے فضول ہیں۔ یہ خیال کر کے کہ دہلی سے باہر کے لوگوں کے پاس بھی اس منجن کو پہنچایا جائے ہم نے واحدی صاحب سے منجن کا یہ نسخہ مانگ لیا ہے اور لاگت کی لاگت اسے فروخت کر رہے ہیں۔

قیمت فی شیشی [illegible] (آٹھ آنے) محصول [illegible] دو اور تین شیشیوں پر محصول [illegible] لگتا ہے

المشتہر

مینیجر رسالہ نظام المشائخ
[illegible] کوچہ چیلاں - دہلی

[illegible] !
[illegible] جس سے [illegible]

پری جمال صابن (رجسٹرڈ)

[illegible] اور خوبصورتی کا مخزن ہے۔ چہرے [illegible] مہاسے دور کرکے چہرے کو [illegible] آب کی مانند سرخ، سپید اور ریشم کی طرح ملائم کر دیتا ہے۔ طبی اصول سے تیار ہوا ہے۔ مرد اس کے عاشق، لڑکے اس کے متوالے اور لڑکیاں اس کی فدائی ہیں فی بکس تین ٹکیہ قیمت ایک صابن دس آنہ ایک روپیہ عہ

زنانہ سنگھار بکس (رجسٹرڈ)

یہ بکس عورتوں کی زینت بڑھانے اور بناؤ سنگھار کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس ڈبے کے ڈھکنے بکس میں آئینہ بھی لگا ہے۔ اس میں پانچ چیزیں اور انعام ہے (۱) پری جمال صابن ایک ٹکیہ (۲) پری بہار آئل شیشی ۲ تولہ (۳) پان کی بہار ایک ڈبیہ (۴) خوشبودار مسی ایک تولہ (۵) بال صفا صابن ایک ڈبیہ اور (۶) ماہ سرمہ نور نظر مفت۔ فی بکس ایک روپیہ

پیرس پوڈر

سہ گانہ لفنیس کریم، گالوں کی سرخی یہ تینوں چیزیں عورتوں کی خوبصورتی اور حسن کو قائم اور خوب نکھار کر مثل حور کے بنا دیتی ہیں لفنیس کریم لگانا چہرہ ملائم ہوگا، پیرس پاؤڈر پھول سے چہرے پر لگانے سے چہرہ چاند سا ہو جائے گا۔ اور گالوں کی سرخی گالوں پر ایسی بہار دیتی ہے کہ مزہ آ جاتا ہے۔ فی سٹ ایک روپیہ چھ آنہ

حکیم محمد یعقوب خاں مالک کارخانہ نورتن ہربل عطر خانہ

دماغی ہیر آئل

یہ خوشبودار روغن یونانی دواؤں سے تیار کیا جاتا ہے [illegible] جب اگر کمزور ہو گئی ہوں یا دو بال کھچڑی سفید ہونے شروع ہو گئے ہوں۔ آنکھوں کی روشنی میں کمی ہو سر میں درد رہتا ہو تو اس کا استعمال کیجیے۔ دماغی کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ فی شیشی ۱۲ آنہ فی سیر چھ روپیہ

خضاب مازو

خضاب مازو بہت مشہور و معروف ہے مگر ہم نے اس کو ایسی ترکیب دی ہے کہ صرف ایک مرتبہ لگائیے اور دوبارہ کے لیے دوا اپنا گرویدہ بنا لے قیمت فی سیر پانچ روپیہ عہ

ترکیب استعمال: یہ ہے کہ [illegible] خضاب بھگو دیجیے اگر جلدی ہو تو جوش دیکر اس کے پانی میں گاڑھا گاڑھا [illegible] حاجت استرہ وغیرہ کی نہیں ہے کسی قسم کا پتہ رکھ کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک بندش رہے بعد خشک ہونے کے کھول ڈالیے۔ کھلی خواہ بیسن سے دھو کر کسی قدر خوشبودار روغن لگا دیجیے بال قائم مثل ریشم اصلی رنگ کے ہو جائیں گے کوئی داغ دھبہ یا سیاہی جلد پر نہ آئیگی۔

حسن افزا

نہایت اعلیٰ درجہ کا ابٹنہ ہے جس کی خوبی صرف ایک ہفتہ لگانے سے معلوم ہو جائے گی۔ رنگ کو صاف کرتا ہے، حسن کو نکھارتا ہے مہاسوں کا دشمن ہے۔ صابن یا بیسن کے بجائے اس سے منہ دھونا چاہیے۔ قیمت فی سیر للعہ چھٹانک

منیجر کارخانہ کاظم علی ۵۳ وکٹوریہ سٹریٹ لکھنؤ

رسالہ

الناظر

ایڈیٹر ظفر الملک علوی

جلد [illegible]	ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء	نمبر ۳

فہرست

نئی کتابیں

...اسلام - خواجہ عبد الحی فاروقی استاد حدیث ... تفسیر القرآن کا وہ حصہ جس میں ... تفسیر ہے - قیمت ۱۲ر

...اسلام - فرانس کے مشہور فلسفی ارنسٹ رینان ... لیکچر میں دکھایا تھا کہ اسلام علوم اور تمدن کا ... ہے - اور فرانس کے ایک دوسرے فاضل ... اس کا رد لکھا تھا - قاضی احمد میاں اختر ...گڑھی نے اس رسالہ میں یہ دونوں مضامین نیز رینان کا جواب الجواب اور سید امیر علی صاحب کا ... مع حیات رینان کے جمع کر دیا ہے - قیمت ۱۰ر

...ی - مسٹر محمد مجیب پروفیسر جامعہ ملیہ کا ایک ڈراما جو ... کی ذہنی اور قومی رہنمائی کے لیے لکھا گیا ہے - ۶ر

دیوان مومن - مولوی ضیاء احمد صاحب بدایونی ایم اے لکچرر مسلم یونیورسٹی نے کلام مومن پر ایک بسیط ناقدانہ مقدمہ لکھ کر غزلیات، فردیات و رباعیات کو بہتر نسخوں سے تصحیح کر کے مع شرح و حواشی مرتب کیا اور مومن کی تصویر اضافہ کی ہے - حجم ۳۶۰ صفحے کتابت و طباعت واضح - دیدہ زیب جلد - قیمت [illegible]

نظام تعلیمات - ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب ہندوستان میں فن تعلیم کے سب سے نامور ماہر ہیں - یہ انھیں کی قابل قدر کتاب کا ترجمہ ہے جس میں انگلستان جرمنی - فرانس - اور ہندوستان کے تعلیمی طریقوں پر مفصل بحث کی گئی ہے - مترجمہ احمد الدین مارہروی ایم اے - حجم ۵۰۰ صفحے دیدہ زیب جلد قیمت صرف [illegible]

تصانیف سید سجاد حیدر صاحب (یلدرم)

...جدال - سید سجاد حیدر صاحب کی جدید الطبع کتاب جو ایک ترکی ناول کا ترجمہ ہے - حجم ... صفحے - قیمت ۱۲ر

(ان کا نظر کے بند رہنے کے زمانہ میں جو کتابیں شائع ہوئیں)

...ب الفت - ایک ترکی افسانے کا ترجمہ - حجم ۸ جزو - قیمت ۱۲ر

...ب حسیناں - ایضاً - حجم ۵ جزو - " ۸ر

...ب - ایک ترکی ڈرامے کا ترجمہ - حجم ۱۰۰ صفحے - " ۱۰ر

...ودو افسانے - اوپر کی تینوں کتابوں کا مجموعہ - قیمت [illegible]

بنام خدا و موجدِ جاں آفریں

نمبر ۳ جلد ۳۸ ستمبر ۱۹۳۴ء

شبابِ بنی اسرائیل کے دو افسانے

(از جناب الحاج منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے، ڈپٹی کلکٹر)

(۱)

اسباطِ یعقوبؑ ارضِ موعود میں آباد ہوئے۔ فصلِ خصومات کے لیے پنچایتیں قائم کیں۔ دفعِ اعدا کے لیے قضاۃ نامزد کیے، اور حکومت و ریاست، آزادی و خود مختاری کے خواب دیکھنے لگے۔ مگر کوہ پیکر دشمنوں سے ہر طرف گھرے ہوئے تھے جنکو صحائفِ سابقہ میں کبھی "عمالقہ" کبھی "فلستی" کبھی "عمونی" اور کبھی "ادومی" وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے اور جن سے جنگ و جدال کا سلسلہ نامتناہی ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ وہ اِنکو غاصب سمجھتے کہ ہمارے آبائی ممالک پر متصرف ہیں۔ یہ اُن کو ظالم کہتے کہ ہم کو خداداد میراث سے متمتع ہونے نہیں دیتے۔ وہ موقع پاکر اِنکے دیہات و باغات پر تاخت کرتے، یہ گھات دیکھ کر اُن کا مال و متاع لوٹ لاتے۔ کبھی وہ عبرانیوں کو غلام بناتے اور کبھی یہ فلسطینیوں سے قلبہ رانی کراتے تھے۔

جنوب مغرب میں بحیرۂ روم کے ساحل تک فلستیوں کا علاقہ تھا جو سب سے زیادہ جنگجو، جفاکار، جور پیشہ، جابر اور اسرائیلیوں کے جاہل ترین دشمن تھے۔ بدقسمتی سے بنی اسرائیل میں باہم اتفاق نہ تھا وہ آپس میں لڑتے۔ خانہ جنگیوں اور بدکاریوں میں مبتلا ہو کر دشمنوں کو تاخت و تاراج کا خود موقع دیتے تھے۔

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

اس شور و شر طوفان بے تمیزی کے عہد میں اسرائیلیوں کا صوبہ "دان" فلستیوں کے تصرف میں آ گیا۔ اور ۴۰ برس تک وہاں کے باشندے دغا پیشہ حکام کے جور و جفا کے شکار رہے۔ جب صبر و تحمل کا پیمانہ لبریز ہوا، آہ و فریاد کے نالوں سے عرش و کرسی میں تزلزل پیدا ہو گیا تو مظلوموں کے گھرانے میں ایک بانجھ عورت کے بچہ ہوا جس کی بابت ہاتف غیب نے بشارت دی کہ وہ فلستیوں کا شر "دان" سے دفع کرے گا بشرطیکہ اس کے سر پر کبھی استرہ نہ لگایا جائے اور اس کے والدین تمام منشیات اور ناپاک غذا سے محترز رہیں۔

یہ مبارک فرزند تاریخ یہود میں "سمسون" کے نام سے مشہور ہے لیکن اس کی فوق الفطرت شجاعت و جوانمردی، کشورکشائی اور نبرد آزمائی کی داستانوں میں یونانی ہرکلیز، ایرانی "رستم" اور ہندی ارجن و بھیم کا پرتو نظر آتا ہے۔

عہد طفولیت سے اس کی زیرکی و دانائی، ہمت و دلاوری کی دھوم تھی۔ ہوشیار ہوا تو شہر "تمنہ" کی ایک فلستی لڑکی سے شادی کا ارادہ کیا۔ بنی اسرائیل غیر قوموں سے ازدواج و مناکحت ناپسند کرتے تھے، والدین مزاحم ہوئے "کیا تیرے بھائیوں کی بیٹیوں میں یا ساری قوم میں کوئی خوبصورت عورت نہیں ہے جو تو نامختون فلستیوں میں بیاہ کرتا ہے" مگر سمسون نے نہ مانا۔ لڑکے کی ہٹ سے لاچار ہو کر والدین بیٹے کے ساتھ نسبت کرنے یا دینے گئے۔ "تمنہ" کے قریب ایک نخلستان میں ماں باپ آرام کر رہے تھے اور سمسون اس باغ کی دوسری طرف گلگشت میں مصروف تھا کہ ایک مہیب شیر سامنے آیا۔ سمسون نے اس کو بکری کی طرح چیر ڈالا۔ مگر والدین سے اس سانحہ کا کچھ ذکر نہ کیا۔ وہ ہنسی خوشی نسبت پختہ کر کے گھر واپس آئے اور ان کو اس شادی کی کچھ ملامت نہ ہوئی۔

کچھ عرصہ کے بعد شادی کرنے گیا اور اسی نخلستان سے گزرا تو دیکھا کہ شیر کی لاش اسی جگہ پڑی ہے اور اس کے ڈھانچے میں شہد کی مکھیوں نے چھتہ لگایا ہے۔ اس نے تھوڑا شہد ہاتھ میں لیا اور کھاتا ہوا سسرال پہنچا۔ ملک کے رواج کے مطابق باشندگان "تمنہ" کی ہفت روزہ ضیافت کا اعلان کیا۔ شہر کے ۳۰ منتخب رئیس مدعو کیے گئے اور ان کی خوب خاطر تواضع ہوئی۔

مجلس گرم ہوئی تو سمسون بولا کہ میں ایک پہیلی کہتا ہوں، اگر سات دن کے اندر آپ لوگ اس کو حل کر دیں تو میں ہر ایک حاضر مجلس کو ایک کتانی کرتا اور ایک قیمتی جوڑا نذر کروں گا، اور اگر اس پہیلی کو کوئی نہ بوجھ سکے تو آپ حضرات مجھ کو ۳۰ جوڑے اور ۳۰ کرتے عنایت کریں۔ رفقاء جلسہ نے شرط منظور کی اور مشتاق ہو کر وہ معمہ دریافت کیا۔ سمسون نے کہا۔

"کھانے والے کے پیٹ سے کھانا نکلا اور زبردست سے مٹھاس نکلی" سب مہمان متحیر ہوئے

اور یہ پہیلیاں کوئی حل نہ کر سکا۔ مجبور ہو کر سمسون کی بی بی کو بہکایا کہ وہ اپنے شوہر سے اس پہیلی کا حل دریافت کرے تاکہ تمنہ والوں کی رسوائی نہ ہو۔ نئی دلہن نے وہ پرانا جادو چلایا جو ہر زمانہ اور ہر ملک کی عورتوں کو فطرت نے تعلیم کیا ہے اور جس کا توڑ کسی جن و بشر کو معلوم نہیں۔ اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْم۔ خلوت میں رو رو کر کہنے لگی "تجھے تو مجھ سے نفرت ہے۔ تو مجھ کو پیار نہیں کرتا۔ تو نے میری قوم کے لوگوں سے پہیلی پوچھی پر وہ مجھے نہ بتائی" سمسون نے کہا کہ میں نے اپنے ماں باپ کو بھی نہیں بتائی ہے تجھے کیسے بتاؤں۔ مگر ساحرہ نے نہ مانا سات دن مسلسل روتی رہی آخر تنگ آکر سمسون نے شیر اور شہد کا قصہ بیان کر دیا۔

ضیافت کا ساتواں دن تھا اور آفتاب لب بام پہونچ چکا تھا۔ سمسون کے بازی جیتنے میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی کہ رؤسائے شہر تشریف لائے اور داماد سے مخاطب ہو کر بولے کہ "شہد سے زیادہ شیریں کوئی چیز نہیں اور شیر سے بڑھ کر کوئی زبردست نہیں" سمسون سمجھ گیا کہ بیوفا دلہن نے یہ راز آشکارا کیا۔ کہنے لگا کہ "اگر تم میری بچھیا کو ہل میں نہ جوتتے تو میری پہیلی کبھی نہ بوجھتے" اب شرط کی جزا اور مشروط کی ادائی لازمی ہوئی تھی۔ درویش بر جانِ درویش اس عیاری کا بدلہ لینے عسقلان گیا جو تمنہ کے قریب ہی لب ساحل فلستیوں کا ایک آباد شہر تھا اور وہاں ۳۰ دولتمندوں کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کی پوشاکیں لایا اور تمنہ کے رفیقوں کو حسب وعدہ تقسیم کر دیں۔ یہ پہلا کڑوا پھل تھا جو سمسون کو عورت کے شجر محبت سے ملا اور وہ رنجیدہ ہو کر اپنے دیس کو واپس چلا گیا۔

مصیبت پر مصیبت یہ کہ عورت کے بغیر گزر نہیں۔ ہر کہ زن ندارد راحتِ تن ندارد۔ شب ماہ میں سونی سیج اندھیری گور میں کانٹوں کا بچھونا ہے۔ موسم گرما میں فصل ربیع کی تیاری کے وقت بی بی کی یاد نے بے چین کیا اور عروس کو رخصت کرانے تمنہ پہونچا۔ سسر نے کہا کہ وہ لڑکی میں نے اپنے ایک رفیق کو دیدی ہے تو اس کی چھوٹی بہن سے شادی کر لے۔ یہ توہین ناقابل برداشت تھی۔ سمسون غم و غصہ سے ماہی بے آب کی طرح بیتاب ہوا اور سسرال والوں کو سزا دینے کی یہ عجیب و غریب تدبیر نکالی کہ جنگل جا کر تین سو لومڑیاں پکڑیں اور ان کی دموں میں روشن مشعلیں باندھ کر تمنہ کے قطعات باغات میں چھوڑ دیں۔ ساری کھڑی کھیتی جل گئی بلکہ زیتون کے باغ بھی راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ سراسیمہ حیرت زدہ ساکنینِ دیار نے اس وحشیانہ جرم کا مرتکب تلاش کیا۔ معلوم ہوا کہ سسر کی ضد میں سمسون نے یہ حرکت کی ہے۔ انھوں نے اپنے غصہ کی آگ فرو کرنے کے لیے سمسون کو نہ پا کر اُس کے سسر اور بیوی کو جلتے بھاڑ میں جھونک دیا۔ اور اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔

بیوفا بیوی کا یہ انجام سُن کر محبت کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اُٹھی۔ وہ فلستیوں کے خون کا پیاسا ہوگیا اور بے تعداد ظالموں کو تہ تیغ کر کے دشمنوں کو کنعان کی سرزمین سے نکالا اور ہاتف غیب کی بشارت کے مطابق "دان" لیا۔

اسرائیلیوں کے سب قبیلے اس کی ہمت و بہادری کے رجز خواں ہوئے ہمسایہ سلطنتیں اُسکے نام سے تھرانے لگیں۔ وہ عبرانیوں کی مسند قضا پر متمکن کیا گیا اور اُسکے دبدبے سے ۲۰ برس تک امن کنعان میں امن قائم رہا۔

عورت کی محبت کا زہر اگرچہ ایک بار چکھ چکا تھا، لذت کے مصائب کا زخم خوردہ تھا، مگر عشق کا مریض کبھی شفایاب نہیں ہوتا۔ جنس لطیف کی یاد دل سے نہیں جاتی۔ چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

دوگونہ رنج و عذاب ست جان مردم را۔ بلائے صحبت نسواں و فرقت نسواں۔

سُنا کہ فلستیوں کے شہر "غزہ" میں ایک خوبصورت مغنیہ رہتی ہے، چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ حسن و جمال کی زیارت کے لیے ایک شب بے یار و مددگار دشمنوں کے مُلک میں اُسکے گھر جا پہنچا۔ فلستی تاک میں تھے فصیل کا محاصرہ کر لیا اور شہر پناہ کے پھاٹک بند کر کے گھات میں بیٹھے کہ صبح کے وقت سمسون برآمد ہو تو اسکو قتل کر دیا جائے۔ محبت کے مدہوش کو نصف شب گزرنے کے بعد ہوش آیا۔ اپنے تہور پر ندامت ہوئی۔ تہ رُب و تفکر و سوچ ڈھونڈھنے باہر نکلا۔ راستے مسدود۔ دروازے مقفل۔ دشمن ہوشیار۔ خدا کا نام لیا۔ شہر پناہ کا بڑا دروازہ بیخ و بنیاد سے اُکھاڑ کر اپنے کاندھے پر سپر کی طرح رکھا۔ اور فلستیوں کے سامنے سے نکل گیا مگر کسی جوانمرد کو ٹوکنے کی ہمت نہ ہوئی۔

عشق و محبت کے افسانے اور اُنکے خطرناک انجام کہاں تک بیان کیے جائیں۔ دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار۔ کہ پیدا نشد تختۂ بر کنار۔ البتہ یہ عبرتناک کہانی سننے کے قابل ہے کہ "سورق" کی وادی میں ایک حسین عورت "دلیلہ" نام رہتی تھی جسکے دام محبت میں سمسون ایسا گرفتار ہوا کہ تمام کاروبار سے معطل ہو کر شب و روز اُسکی خدمت میں حاضر رہنے لگا۔ دشمن سمسون کی دلاوری سے عاجز تھے۔ اس موقع کو غنیمت سمجھکر عورت کی خوشامد کرنے لگے کہ اُسکی وساطت سے سمسون کی بہادری کا راز دریافت کیا جائے۔

برادرانِ یوسف نے اپنے بھائی کو چند کھوٹے درہموں کے عوض فروخت کیا تھا، اُس بیوفا نے گیارہ سو روپے کے وعدے پر اپنے جاں نثار شیدائی کو بیچنے کا اقرار کر لیا۔

راز و نیاز کے وقت مُنہ مُسکرا کر عاشق سے پوچھنے لگی کہ "تجھ پر غالب آنے کی کیا تدبیر ہے؟ سمسون

سے کہا کہ "مجھکو بید کی سات ہری ہری شاخوں سے باندھیں تو میرا زور جاتا رہیگا"۔ وہ سوگیا تو
اُس ستمگار نے عاشق کو بید کی ڈالیوں سے باندھا اور کچھ آدمی گھات میں بٹھا کر سمسون کو جگایا کہ
"فلستی تجھ پر چڑھ آئے"۔ وہ بیدار ہوا اور بید کو ایسا توڑا "جیسے سن کا سوت آگ پاتے ہی ٹوٹ
جاتا ہے"۔ دلیلہ شرمندہ ہوکر بولی کہ تو نے دھوکا دیا اور مجھ سے جھوٹ بولا۔ سمسون نے
کہا کہ مجھ کو نئی رسیوں سے جو کبھی کام میں نہ آئی ہوں باندھا جائے تو میں بے بس ہو جاؤنگا۔ دلیلہ
نے اس کا بھی امتحان کیا مگر رسیاں دھاگے کی طرح ٹوٹ گئیں۔ دلیلہ کہنے لگی کہ مجھ ایسی محبت
کرنے والی عاشق زار سے دروغگوئی زیبا نہیں۔ سچ بتلا کہ تیری غیر معمولی قوت کا راز کیا ہے۔ اُس نے
جواب دیا کہ اگر تو میرے بالوں کی ساتوں لٹیں تانے کے ساتھ بُن دے تو میری طاقت سلب ہو جائیگی
اُس جفاکار نے بالوں کو بُن کر کھونٹے سے باندھ دیا اور چلائی کہ "فلستی تجھ پر چڑھ آئے"۔ سمسون نے
آنکھ کھولی اور کھونٹے کو تانے کے ساتھ اُکھاڑ ڈالا۔

تب عاجز ہوکر وہ کہنے لگی کہ تیرا دعوے الفت اور لاف عاشقی غلط ہے۔ تو نے مجھکو تین بار
دھوکا دیا اور اِک ذری سی بات نہ بتائی۔ ایسے بے رحم سے دل لگانا جان کا زیان خلق کی نصیحت
ہے سمسون نے لاکھ ٹالا مگر وہ فتنہ پرداز اصرار سے باز نہ آئی۔ لاچار ہوکر بتا دیا کہ "میری طاقت
کا راز میرے بالوں میں ہے۔ اگر میرا سر مونڈا جائے تو مجھ میں کچھ زور باقی نہ رہیگا"۔ اب دلیلہ کو اطمینان
ہوا اور اُس نے یقین کرلیا کہ سمسون نے اصلی راز ظاہر کر دیا ہے۔ فلستی سرداروں کو گھات میں
بٹھایا۔ خوشامد اور چاپلوسی کی میٹھی میٹھی باتیں کرکے سمسون کو اپنے زانو پر سلایا۔ اور اُسکے بالوں
کی ساتوں لٹیں اُسترے سے صاف کرادیں۔ اس خدمت سے فارغ ہوکر شور مچایا "سمسون
اٹھ، فلستی تجھ پر چڑھ آئے"۔ اُلفت کا متوالا جاگا تو معلوم ہوا کہ تقدیر سوگئی۔ ہاتھ پاؤں کی قوت
سلب تھی۔ دشمن سامنے آئے اور گرفتار کرکے اُسکی آنکھیں نکال لیں۔ وہ "غزہ" کے جیل خانے
میں پیتل کی بیڑیوں سے جکڑ کر رکھا گیا اور چکی پیسنے کی مشقت اُسکے سپرد کی گئی۔

چند روز کے بعد فلسطین کے رؤسا نے اس مہتم بالشان کامیابی پر جشن شاہانہ برپا کیا۔ اپنے
دیوتاؤں پر قربانیاں چڑھائیں اور رقص و سرود میں منہمک ہوئے۔ جب دماغ بادۂ ناب سے گرم
ہوا تو تذلیل و تمسخر کے لیے سمسون اُس مجلس میں طلب کیا گیا۔ گھر مردوں اور عورتوں سے بھرا
تھا۔ فلستیوں کے تمام سردار جمع تھے۔ چھت پر تقریباً تین ہزار مرد و زن کا اجتماع تھا۔
ایک لڑکا اندھے سمسون کو ہاتھ پکڑ کر لایا اور اُس عالیشان بارگاہ کے وسط میں دو ستونوں

کے قریب کھڑا کر دیا۔ سمسون کے سر کے بال پھر اگ آئے تھے۔ اُس نے دو عالم کے فریادرس سے عرض کی کہ "اے مالک میں تیری منت کرتا ہوں کہ فقط ایک بار مجھے زور بخش تاکہ میں دشمنوں سے اپنی آنکھوں کا بدلہ لوں اور انھیں کے ساتھ مر جاؤں۔" یہ دعا کرکے دونوں درمیانی ستونوں کو پکڑا۔ ایک پر دہنے ہاتھ سے اور دوسرے پر بائیں ہاتھ سے زور لگایا تو وہ گھر اُن سرداروں پر اور اُن سب لوگوں پر جو وہاں جمع تھے گر پڑا۔

"پس وہ مُردے جن کو اُس نے مرتے دم مارا اُن سے بھی زیادہ تھے جنکو اُس نے جیتے جی قتل کیا تھا۔"

---

(۲)

جب بنی اسرائیل پر قاضیوں کی حکومت تھی۔ اور ابھی ان سلطنت کا افتتاح نہ ہوا تھا۔ نہ شموئیل مبعوث ہوئے تھے اور نہ ساؤل کو فرماں روائی کا خلعت پہنایا گیا تھا کہ سرزمین کنعان پر قحط کی مصیبت نازل ہوئی۔ عسرت زدہ قبیلے تلاش رزق میں چار طرف سرگرداں ہوئے۔ ایک یہودی الیملک نام اپنی بیوی نعومی اور دو بیٹوں کو ساتھ لیکر "موآب" کے ہمسایہ ملک میں پہونچا اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ کچھ عرصے کے بعد الیملک دنیا سے رخصت ہوا۔ مگر اُسکی بیوہ نعومی، دار الھجرۃ میں سکونت گزیں رہی اور اپنے بیٹوں کی اُسی بستی میں شادیاں کردیں۔ ایک بہو کا نام عرفہ اور دوسری کا روت تھا۔ فرماں بردار بیٹے۔ اطاعت شعار بہویں آنکھوں میں نور کلیجے میں ٹھنڈک۔ جلا وطنی کا غم اور بیوگی کا الم فراموش ہوگیا تقریباً دس سال تک یہ تارکان وطن "موآب" میں بعافیت بسر کرتے رہے۔

قضاء کردگار سے دونوں بیٹے یکے بعد دیگرے عالم جاودانی کی طرف راہی ہوئے ایک دل اور دو داغ۔ کلیجہ کا گھاؤ ناسور بنا اور پھوٹ کر بہا۔ زندگی سے بیزاری اور "موآب" کے زمین و آسمان سے نفرت ہوگئی۔ عالم وحشت و سراسیمگی میں بہوؤں کو ساتھ لیا کنعان کی طرف کوچ کردیا۔ کچھ دور چل کر سوچی سمجھی اور نوجوان بہوؤں کو فہمایش کی کہ وہ اپنے میکے واپس جائیں اور سکھ چین سے رہیں مگر وہ دونوں چلا چلا کر رونے لگیں اور ساس کی رفاقت ترک کرنے پر رضامند نہ ہوئیں۔ نعومی نے اصرار کیا اور سمجھایا کہ اُسکے کوئی فرزند نہیں ہے جو ان غمزدہ بیواؤں سے عقد کرلے نہ کوئی ایسا دولتمند رشتہ دار ہے جو انکے بار کا متحمل ہوسکے اس لیے

مناسب وقت یہی ہے کہ وہ اپنے وطن میں رہیں اور شادیاں کریں۔

خوشدامن کی فہمایش اور تاکید کا عرفہ پر اثر ہوا۔ وہ چالیس قدم تک مشایعت کرکے واپس گئی اور چند روز کے بعد نئے تعلقات میں پھنس کر نعومی اور اسکے فرزندوں کو بھول گئی۔ چوں در بر دیگرے نشیند۔ خواہد کہ ترا دیگر نہ بیند۔

لیکن پیکر صدق و صفا روت متوفی شوہر کی ماں کو غربت و مسافرت میں تنہا چھوڑنا آئین وفاشعاری کے خلاف سمجھ کر اُسکی جدائی پر رضامند نہ ہوئی۔ "جہاں تو جائیگی میں جاؤں گی۔ جہاں تو رہیگی میں رہوں گی۔ تیرے لوگ میرے لوگ تیرا خدا میرا خدا ہوگا۔ جہاں تو مریگی میں مرونگی اور وہیں دفن ہوں گی" ساس مجبور ہوئی اور بیوہ بہو کو ہمراہ لیکر بیت لحم پہونچی۔

شہر میں غل ہوا کہ دس برس کے بعد نعومی پردیس سے آئی۔ خویش و بیگانہ، اغیار و آشنا، مزاج پُرسی کے لیے حاضر ہوے۔ دل شکستہ نعومی نے اُنکے خیر مقدم کا شکریہ ادا کیا مگر گزارش کی کہ لوگ اُسکو نعومی نہ کہیں، بلکہ "مارہ" کے نام سے یاد کریں "مجھ پر قہر خداوندی نازل ہوا۔ میں بھری پُری گئی تھی اور گود خالی کرکے آئی ہوں۔ لہذا "مارہ" کہلانے کی سزاوار ہوں، نعومی کے مبارک نام کی مستحق نہیں"!!

نعومی بیت لحم پہونچی تو ربیع کی فصل تیار تھی اور جَو کاٹنے کا وقت تھا۔ ساس سے اجازت لیکر روت مزدوری کی تلاش میں نکلی۔ پہلے جس کھیت میں قدم رکھا اُسکا مالک ایک شخص بوعز نام الیملک مرحوم کا رشتہ دار تھا۔ اس نوجوان حسینہ کو مزدوروں کے غول میں دیکھ کر حال دریافت کیا معلوم ہوا کہ وہ "موآب" کی رہنے والی ہے اور نعومی کے ساتھ آئی ہے۔

روت کی عدیم المثال رفاقت اور حیرت انگیز وفاشعاری بیت لحم میں مشہور ہو چکی تھی۔ اُس کے حسن و جمال کا گھر گھر چرچا تھا۔ بوعز سمجھ گیا کہ وہی گلاب کی کلی آج اُسکے چمن میں خنداں ہوئی ہے۔ لڑکی کو پاس بُلا کر شفقت و مہربانی سے کلام کیا اور اُسکو مزدوری کرنے، بالیاں چُننے کی اجازت دی۔ کھانے کا وقت آیا تو روٹی اور سِرکہ سے ضیافت کی اور اپنے خدام کو اس نووارد کی خاطر مدارات کی تاکید کر گیا۔ روت شام تک بالیاں چُنتی رہی اور کوئی مانع نہ ہوا۔ غروب آفتاب کے وقت ایک بڑا انبار جَو کا اکٹھا کرکے ساس کی خدمت میں لائی اور دن بھر کی کیفیت بیان کی۔

ساس نے یہ ماجرا سنا تو بولی کہ "بوعز ہمارے قریبی رشتہ کا ہے۔ وہ خداوند کی طرف سے

---

۱ عبرانی زبان میں "نعومی" کے معنی "شیریں اور خوشگوار" ہیں۔ "مارہ" کے معنی تلخ و بدمزہ ہیں۔ ۱۲

برکت پائے جسنے زندوں اور مُردوں پر مہربانی کی۔ تو اسکی کنیزوں کے ساتھ جا یا کر اور وہ تجھے کسی دوسرے کھیت میں نہ پائیں"۔ غرض گندم و جَو کی فصل ختم ہوتے تک روت بوعز کے کھیت پر کام کرتی رہی۔ اور شام سے صبح تک ساس کی خدمت گزاری میں حاضر رہتی تھی۔

قدیم عہد میں دستور تھا کہ کوئی شخص لا ولد بیوہ چھوڑ کر انتقال کرے تو اُس کا قریب ترین رشتہ دار ذمہ دار ہے کہ متوفی کا اثاث البیت، باغ مزرعہ خرید کرلے اور اسکی بیوہ سے نکاح کرے تاکہ مرحوم کا گھر بے چراغ نہ ہو۔ اور اُس کا نام دنیا میں باقی رہے۔

نعومی کو فطرتاً آرزو تھی کہ اُس کے شوہر اور بیٹوں کا نام زندہ رہے۔ خدا کی طرف سے یہ سامان ہوا کہ روت جس کھیت پر مزدوری کرنے گئی اُسکا مالک اپنا قریبی رشتہ دار نکلا اور وہ پردیسی بہو کے حالِ زار پر مہربان بھی ہو گیا تو اُسکو تمنا ہوئی کہ اسرائیلیوں کے قدیم قانون سے فائدہ اُٹھا کر اپنے گھر میں رونق و تازگی پیدا کرے۔ بہو کو ہدایت کی کہ وہ غسل کرکے صاف ستھری پوشاک پہنے اور خوشبو لگا کر شب کے وقت بوعز کے خرمن میں جائے اور دیکھے کہ تقدیر کا فرشتہ اُسکو کیا بشارت دیتا ہے "جو کچھ کرنا مناسب ہے وہ بوعز خود تجھکو بتائے گا"۔

روت نے حکم کی تعمیل کی۔ جب بوعز کھا پی کر فارغ ہوا اور اپنے کھلیان کے پاس استراحت کرنے لگا تو وہ دبے پاؤں آئی اور اُسکے قدموں کے پاس لیٹ گئی۔ آدھی رات کو بوعز نے کروٹ لی۔ اپنے پاؤں کے پاس عورت دیکھ کر ڈر گیا۔ پوچھا کہ کون ہے؟ جواب ملا "میں تیری لونڈی روت ہوں۔ تو کنیز پر اپنا دامن پھیلا دے کیونکہ تو نزدیک کا قرابتی ہے"۔

بوعز خوش ہو کر بولا "تمام شہر جانتا ہے کہ تو پاک دامن عورت ہے" اور یہ بھی سچ ہے کہ "میں نزدیک کا قرابتی ہوں" لیکن ایک قریب تر رشتہ دار موجود ہے تو آج کی شب اِسی خرمن میں آرام کر، میں صبح کو اُس سے دریافت کرکے جواب دُوں گا۔

روت نے ساری رات اُسی جگہ گزاری اور صبح تڑکے "جب ایک دوسرے کو پہچان نہ سکتا تھا" اُٹھی اور ساس کی خدمت میں حاضر ہو کر شب کی روداد بیان کی۔

اُس زمانے میں شہر پناہ کا پھاٹک قومی اور مُلکی جلسوں کے لیے "دارالشوریٰ" تھا۔ بوعز پھاٹک کے قریب بیٹھا اور جب وہ قریب تر رشتہ دار نظر آیا تو اُسکو ٹوک کر اپنے پاس بُلایا۔ برادری کے دس اکابر جمع کیے اور سب کو گواہ کرکے اُس رشتہ دار سے کہا کہ نعومی جو موآب کے دیس سے واپس آئی ہے الیملک کا مال بیچتی ہے۔ اگر تو اُسکو خرید کرے

تو تجھے مُردے کی بیوی موآبی روت بھی لینا ہوگی تاکہ اُس مُردے کا نام اُسکی میراث پر قائم کرے۔ اگر تو نہیں لینا چاہتا تو مجھے بتا دے کیونکہ تیرے سوا اور کوئی نہیں جو اُسے لے اور میں تیرے بعد ہوں"۔

رشتہ دار نے ملک کے رواج کے مطابق معاہدہ کی تصدیق کے لیے پانوں سے جوتی اُتاری اور بوعز سے کہا کہ مجھکو اُس زمین کی ضرورت نہیں ہے تو لیلے۔ بوعز نے اُسی مجلس میں تمام اکابر اور حاضرین کو شاہد بناکر نعومی کی زمین خرید لی اور روت سے عقد کرلیا۔

اس مبارک شادی سے ایک لڑکا پیدا ہوا جسکا نام عوبید رکھا گیا۔ اسی عوبید کا بیٹا "اشیا" تھا جسکے ایک گرامی قدر فرزند داؤد کا مقدس نام دنیا کی تاریخ میں مشہور ہے۔ اسی مولود مسعود کے طفیل سے روت آج تک زندہ ہے اور عہدنامہ عتیق میں ایک مستقل کتاب اُسکے نام سے موجود ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشآء واللہ ذو الفضل العظیم۔

قدردان شہنشاہ کی نکتہ نوازی پر قربان جایئے۔ مصیبت زدہ ساس کی رفاقت کا ثمرہ دونوں بہوؤں کو ملا۔ عرفہ نے چالیس قدم تک مشایعت کی تھی اُسکو ایک قوی ہیکل خیرہ زور فرزند عنایت ہوا جو فلسطیوں کا سپہ سالار بنا۔ تمام بنی اسرائیل اُسکے مقابلہ سے عاجز آگئے۔ اُس کے چالیس قدم کے عوض چالیس دن تک اسرائیلی لشکر کے سامنے "ہل من مبارز" کا ڈنکا بجاتا رہا مگر کسی بہادر کو اُس سے پنجہ زنی کی مجال نہ ہوئی۔ البتہ روت کی خدمت و طاعت عرفہ سے ارفع و اعلیٰ تھی لہٰذا روت کا پوتا میدان میں آیا تو عرفہ کا طالع اقبال بے نور ہوگیا۔ روہ پتھر کے ایک ٹکرے سے داؤد نے جالوت کو ہلاک کردیا۔

نوائے بسمل

تیری عنایتوں نے گرانبار کردیا　　آمرزشوں نے اور گنہگار کردیا
کس ذوق شوق سے تھا چلا حشر دیکھنے　　مایوسیوں نے مجھکو خبردار کردیا
میں رازِ کائنات سے بیگانہ وار تھا　　پیرمغاں نے واقف اسرار کردیا
ہم زندگی سمجھتے تھے جسکو وہ خواب تھا　　سچ پوچھیے تو موت نے بیدار کردیا
کیا چاہتا ہوں اُن سے میں سرگشتۂ وفا　　میری نگاہ یاس نے اظہار کردیا
دعوے میں سادگی تھی مگر پیچ پڑگئے　　افشا جو قصۂ رسن ودار کردیا
بسمل کو میکدے سے سروکار تھا مگر　　ساقی کی چشم مست نے ہشیار کردیا

بسمل ابن سعید

سیرتِ مرزا

(از جناب منشی ممتاز حسین صاحب عثمانی ایڈیٹر اودھ پنچ -)

محترمی مولانا ظفر الملک السلام علیکم

میرے حق میں یہ فرمایش کہ اپنے محترم و معظم مرحوم دوست علامہ ڈاکٹر مرزا محمد ہادی پی ایچ ڈی مرزا رسوا کے حالات قلمبند کروں، بہت ہی روح فرسا ہے - یہی وجہ تھی کہ جناب منشی دیا نرائن نگم بی اے ایڈیٹر زمانہ، کانپور کی فرمایش پوری نہ کر سکا -

جناب مرزا مرحوم کی وفات سے دو تین روز قبل منشی نگم صاحب اُن سے حیدرآباد میں ملے تھے - راقم الحروف بھی اُس وقت کتابوں کی الماری سے چند کتابیں تلاش کر رہا تھا جناب مرزا بستر مرگ پر دراز تھے - منشی نگم صاحب چارپائی کے پاس کھڑے تھے اور اُن سے فرمایش کر رہے تھے کہ کہ اپنے حالات زندگی مجھے نوٹ کرا دیجیے - جناب مرزا تپ محرقہ یا مرض الموت میں مبتلا تھے مگر ہوش بر جا تھے انھوں نے میری طرف اشارہ کیا کہ اکثر حالات سے ممتاز حسین واقف ہیں، اگرچہ عمر میں یہ مجھ سے بہت چھوٹے ہیں مگر میں نے کبھی ان سے کوئی بات چھپائی نہیں اکثر خود ہی بغیر انکے پوچھے اپنے واقعات بیان کیے ہیں - آپ ان سے کہیے، غالباً بہت خوشی سے یہ فرمایش پوری کریں گے منشی صاحب نے کلام کے متعلق استفسار کیا تو فرمایا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے - مہادیو پرشاد ٹنڈن کے پاس میری دو تین بیاضیں ہیں - مگر وہ بہت پہلے کا کلام ہے - محل طویل گفتگو کا نہ تھا منشی نگم صاحب کے ساتھ بمبئی کے محمد یوسف صاحب انصاری ناظم بھی تھے - یہ دونوں رخصت ہوئے - جب میں لکھنؤ واپس آیا تو یہاں جناب مرزا کے انتقال کی خبر مشہور ہو چکی تھی - اُنکے بعض اعزا نے فاتحہ خوانی کی مجلس کی تھی اور مرزا صاحب کے احباب رنج زدہ بیٹھے تھے - میرے آنے کے دو تین روز بعد منشی نگم صاحب کا والا نامہ تحریر حالات کے تقاضے کا پہونچا اور محترمی جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز بھی تشریف لائے جنھوں نے ارادہ ظاہر کیا کہ مرحوم کے حالات میں لکھنے والا ہوں تم کو جو معلوم ہو مجھے بتا دو - میں نے ایک مختصر سی یادداشت انھیں لکھوا دی منشی نگم صاحب کے خطوط برابر پہونچتے رہے اور میں یہی جواب دیتا رہا کہ جناب عزیز سے کہیے - آخرکار جنوری سنہ ۱۹۳۳ء کے "زمانہ" میں جناب مرزا کی تصویر اور جناب عزیز کا پہلا مضمون بعنوان "مرزا رسوا مرحوم" شایع ہوا اور پھر مدتوں اس کا سلسلہ جاری رہا -

افسوس ہے کہ میرے پاس یہ پورا سلسلہ محفوظ نہیں اب میں اپنی یاد پر دوبارہ زور ڈالتا ہوں ممکن ہے کہ جزوی اختلاف ہو جائے۔

جناب مرزا رسوا مرحوم کی صحیح تاریخ ولادت ذہن سے اتر گئی۔ انھوں نے خود اپنا زائچہ بنایا تھا جو تلف ہو گیا۔ مگر اتنا یاد ہے کہ ۱۸۵۷ء میں شاید وہ پیدا ہوئے تھے۔ جو زائچہ انھوں نے تیار کی تھی اسکے اواخر صفحات میں انھوں نے مختصر حالات بھی اپنے لکھ دیے ہیں۔ صحیح تاریخ پیدائش اس میں ضرور درج ہوگی۔ مرزا صاحب مرحوم اصلاً ماژندرانی ایرانی تھے۔ ان کے جد اعلیٰ مرزا رشید بیگ (آغا رشید) ایران سے دہلی آئے اور شاہی فوج میں ایک معزز عہدہ پر مقرر ہوئے دہلی پر جب ادبار مسلط ہوا تو ان کے صاحبزادے مرزا ذوالفقار علی بیگ ترک وطن کر کے اودھ کے توپ خانۂ شاہی میں ایجیٹن مقرر ہوئے (چوپٹیوں پر "ایجیٹن کی گلی" بہت مشہور تھی) انکے صاحبزاد مرزا آغا علی بھی سپاہی تھے اور فوج ہی میں ملازم رہے لیکن انھیں علوم سے رغبت خاص تھی چنانچہ انھوں نے اپنے صاحبزادے مرزا آغا محمد تقی مرحوم کو بحسب رواج زمانہ فارسی عربی زبان اور بعض علوم عقلیہ کی تعلیم دلوائی۔ انھیں ریاضی کا بہت شوق تھا۔ چند اوراق انکے لکھے ہوئے راقم الحروف کے پاس اب تک محفوظ ہیں (یہ ایک لوگارثم کے اوراق ہیں) جلد پر انھوں نے انگریزی کی ابجد بھی اپنے ہاتھ سے لکھی ہے۔ وہ بہت بدصورت ہے۔ تاہم اس سے پتہ لگتا ہے کہ انھیں کسی قدر توجہ اس جدید زبان کی طرف بھی تھی۔ ایک قطعے میں انگریزی مہینوں کی تعداد ایام یوں نظم کی ہے ؎

بود سی یوم در ماہ ستمبر — دگر اپریل و جون و ہم نومبر
بماہ فروری دو کم از آں دان — باقی مہ سی و یک یوم بشمر

چند قواعد عدد معلوم سے غیر معلوم کے استخراج کے ہیں۔ کچھ حسابی کھیل ہیں۔

مرزا آغا محمد تقی مرحوم نے فنون جنگ تو سیکھ لیے تھے مگر علمی توغل و اشتغال کی وجہ سے کوئی فوجی عہدہ قبول نہیں کیا انکی شادی نواب احمد علی خاں عرف آغا شیر کی صاحبزادی سے ہوئی جو کہ نواب سید حسین خاں طباطبائی کے اقربا سے تھے۔ نواب سید حسین خاں کا تذکرہ حبیب السیر (تاریخ) میں تفصیل سے موجود ہے اور جہاں کہیں مورخ نے انکا نام لیا ہے نہایت تکریم و تعظیم کے ساتھ لیا ہے۔

الغرض مرزا مرحوم ننہال ددھیال دونوں جانب سے شریف النسب اور عالی خاندان تھے۔ دہلی میں جب تک رہے معزز و محترم رہے لکھنؤ میں آئے تو یہاں بھی — مقنع اہل زمانہ سے بر استغنا مجھے خود جناب مرزا فرماتے ہیں ؎

دلّی چھٹی تھی پہلے اب لکھنؤ بھی چھوڑیں
دو شہر تھے یہ اپنے دونوں تباہ نکلے

(لکھنؤ چھوٹا اور ایسا چھوٹا کہ قبر تک یہاں نہ بنی)

جناب مرزا کا عہد طفلی زیادہ دنوں تک والدین کے سایۂ عاطفت میں بسر نہیں ہوا۔ بس پندرہ سولہ سال اس قلیل مدت میں اُنھوں نے فارسی کے تمام کتب متداولہ ختم کر لیے۔ عربی کی صرف و نحو (ابتدائی کتابیں) مگر شغل اپنے والد کے یا منی اور منطق میں انہماک زیادہ تھا۔ والدین کا اس کمسنی میں سر پر نہ ہونا، شباب کا جلد جلد گردن پر مسلط ہوتے جانا پھر اس پر یہ قیامت کہ متعلق پرورش و نگرانی تھی یعنی ماموں اور خالہ، اُنکا جاہل و خودسر ہونا۔ یہ ایسے مصائب تھے جو دفعۃً نازل ہوئے۔ تعلیم ذوق ذاتی پر منحصر ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ والدہ نواب زادی تھیں کافی دولت نقد اور کچھ سو گاؤں چھوڑ کے مری تھیں۔ گاؤں دونوں بہنوں میں مشترک تھے۔ جناب مرزا کے والدین جب زندہ تھے اُسی وقت سے تحصیل وصول کا کام ایک رشتے کے ماموں کے سپرد تھا۔ جناب مرزا کے والد ملکی مشاغل کے باعث کبھی گھر سے خبر نہ ہوئے اور والدہ اپنی بہن کو آزردہ کرنا چاہتی نہ تھیں۔ ان دونوں کی وفات کے بعد نقد اور زیور بطور امانت خالہ کے ہاتھ لگا جو پھر واپس نہ ملا۔ گاؤں مشترک تھے۔ کارگزاروں نے سرکاری بندوبست کے وقت پہلے ہی سے اپنے نام کرالیے تھے۔ جناب مرزا کی والدہ کے قبضے کا ثبوت ہی نہ تھا۔ جاہل خالہ صاحبہ بھانجے سے ڈرتی تھیں کہ جوان ہونے پر محاسبہ نہ کرے۔ یہ واقعات خود جناب مرزا نے بیان کیے۔ مال تال کی تو اُن کے نزدیک وقعت نہ تھی۔ لیکن بے اعتنائی کا تذکرہ کرتے وقت آبدیدہ اور افسردہ ہو جاتے تھے۔ جو چیز خالہ اور ماموں کے دست تغلب سے محفوظ رہی وہ خواجہ باسط کے ٹیلے پر چند مکان تھے جو آغا ولی سے آغا محمد تقی نے پائے۔ پھر اُن سے مرزا محمد ہادی مرحوم کو ملے۔ ان کا کرایہ خود جناب مرزا نے خالہ سے جدا ہو جانے پر وصول کرنا شروع کر دیا۔ اور یہی وجہ معاش رہ گئی۔

آغا محمد تقی مرحوم کے چند مخلص دوست تھے۔ ایک تو جناب مرزا دبیر مشہور شاعر مرثیہ گو۔ جن کے پاس خود جناب مرزا کے والد مرحوم اُن کو شاعری سکھانے لے گئے تھے۔ دوسرے ایک شیخ صاحب جن کا بھولا سا نام تھا حسین بخش یا حیدر بخش۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کے خوشنویس تھے اور خوشنویسی میں جناب مرزا کے اُستاد۔ اسکے ساتھ ہی بے مثل جعلساز بھی۔ اُنھوں نے دس پندرہ لاکھ کے سرکاری اسٹامپ بنائے اور بیچے۔ لطف یہ کہ معمولی رنگ اور موقلم سے یہ کام ہوتا تھا۔ نہ کوئی مشین تھی نہ اوزار

تھے۔ ان پر دعوے دھانی مقدمہ چلا۔ منشی بھگیا لال اشامپ فروش یا خزانچی اور خدا جانے کتنے کلکتہ اور لکھنؤ کے آدمیوں نے اس مقدمے میں سزا پائی۔ شیخ جی نے پہلے تو مرزا مرحوم کو خالہ کے مقابلے پر اُبھارا۔ لیکن جناب مرزا کو یہ گوارا نہ ہوا تو کہہ دیا کہ صاحبزادے میرے پاس نہ آیا کرو اس لیے کہ ایک ایک دن میں پکڑا جاؤں گا۔ اور میرے ساتھیوں پر بھی آفت آئیگی۔ اپنی اُستانی سے جتنی ضرورت ہو اُتنا خرچ مانگ لیا کرو۔ میرے کوئی آل اولاد نہیں۔ تمھیں سب کچھ ہو۔ جب تک میرا قابو چلیگا تمھیں تنگ ہونے نہ دوں گا۔ اُستانی جی نسا کوئی شریف زادی نہ تھیں مگر عملاً بہت ہی وفادار شریف النفس تھیں جناب مرزا اگر دس روپئے مانگتے تو بیس حوالے کرتیں۔

مکانوں کی آمدنی اور اُس آمدنی سے دہ چند شیخ جی کا دست غیب دونوں مل کے جناب مرزا کے واسطے کافی ہوگئے۔ اثنائے جوانی کے ساتھ ساتھ حصول علم کا فرض برابر ادا ہوتا رہا۔ اس حالت کو دو ہی تین برس گزرے تھے کہ عمل دست غیب باطل ہوگیا۔ یعنی شیخ جی جیل خانے سدھارے اور وہاں سے عدم آباد کی راہ لی۔ اب جناب مرزا کو بسر اوقات میں تنگی محسوس ہوئی۔ آبائی مکان ایک ایک کر کے بکے۔ گگرتوں کے قریب ایک باغ تھا وہ کسی چکن والے کے ہاتھ بکا۔

اس زمانے میں شاعری کا شوق زیادہ تھا جناب مرزا دبیر مرحوم بھی چل بسے تھے۔ بپابندی وضع مرزا اوج مغفور سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ ازبسکہ علمی ذوق مدرسی میں زیادہ نبھتا ہے اس لیے ضرورت ہوئی کہ کسی اسکول میں جگہ ملے سند کوئی پاس نہ تھی۔ لہٰذا ایک ہی سال میں منشی عالم کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ اور فیض آباد کے ایک شریف گھرانے میں شادی کر لی۔ بی بی ایسی ملیں جنھوں نے جناب مرزا کے فلسفی دل پر قبضہ کر لیا اور زیادہ قیام فیض آباد میں رہنے لگا مگر افسوس کہ دو ہی سال میں بی بی اور ایک لڑکی جو محبت کا نتیجہ تھی دونوں نے سفر آخرت اختیار کیا۔ اس دو برس کی مدت میں بھی وہ غافل نہ رہے اور بطور خود انگریزی پر محنت کرتے رہے۔ منشی عالم پاس کرنے کے بعد تا مانی پرائیوٹ امتحان انٹرنس کا پاس کر لیا۔

سننے والے متعجب ہونگے کہ جناب مرزا کے اساتذہ عربی فارسی اور شاعری کے تو ہیں مگر انگریزی میں ابھی تک کسی اُستاد کا وجود نہیں۔

مرزا مرحوم فارسی، حساب، چند مقالہ ہائے اقلیدس، نجوم اور بادی ہیأۃ میں اپنے والد کے شاگرد تھے خوشنویسی میں شیخ جی مذکور کے۔ شاعری میں مرزا دبیر اور مرزا اوج کے، عربی ادب میں خود اپنے۔ صرف ونحو عربی میں مولانا محمد یحییٰ لکھنوی اور منطق میں مولانا کمال الدین موہانی مرحومین سے

استفادہ کیا، اور بعض کتب شفا مولانا غلام الحسنین کنتوری مرحوم سے پڑھے (جب علامہ کنتوری لکھنؤ میں تھے اور اُنھوں نے ایک مدرسہ کھولا تھا ایک اخبار بھی نکالا جس کا نام اخبار المومنین بھی (شاید) جاری کیا تھا) پہلی جلد جس کا نقاب ایک جلد تھا ہندسہ وریاضی کے طبعی مذاق کے جناب مرزا نے رڑکی کالج کی طرف توجہ کی اور اس میں تکمیل ٹرگنامیٹری (علم تطابع مثلث) جامیٹریہ تسطیح ارض وغیرہ میں عملاً مہارت پیدا کرلی۔

جناب مرزا میں ایک لاجواب عادت یہ تھی کہ جس بات کی طرف ذرا بھی طبیعت رجوع ہوئی بس یہ چاہتے تھے کہ اُسی وقت اس میں کمال بھی حاصل ہو جائے۔ کیسی بھوک کیسی پیاس کیسا آرام کیسا سونا۔ نیند نہ آنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرتے تھے۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں رات کو دو بجے اُٹھ کر نہاتے تھے۔ معجون ہرش کھا لیتے تھے نوسادر اور چونا ملا کے سونگھتے تھے شوق کا یہ عالم کہ لو بھر آنکھ لگی اور پھر گھبرا کے اُٹھ بیٹھے۔ مشکل سے مشکل مسائل ہو جب تک حل نہ کرلیتے کھانے نہ ملتے۔

عام طور پر لوگوں کا قاعدہ ہے کہ جس فن کے سیکھنے کی ابتدا کرتے ہیں اُس کی پہلی کتاب پڑھتے اور اور جب وہ ختم ہو لیتی ہے تو درجہ بدرجہ پڑھتے ہیں، مگر ان حضرت کا نرالا دستور تھا کہ ابتدائی کتاب کے ساتھ ہی اس علم یا فن کی جتنی کتابیں مل جاتیں خواہ منتہی کے سمجھنے کی ہوں سب جمع کرلیتے تھے۔ اُنکی قوتِ عزم کا مشاہدہ راقم الحروف نے اکثر کیا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مصطفیٰ اور مصری قدیم زبان کا ایک چھوٹا سا رسالہ میرے سامنے اُنھوں نے نخاس میں خریدا (خدا سلامت رکھے نخاس عجب شے ہے۔ ہم غریبوں نے جن کو مال ڈھیلے کبھی نصیب ہوا ہی نہیں اکثر کوڑیوں کے مول جواہر خریدے ہیں) خط صوری سے جناب مرزا واقف نہ تھے۔ یہ رسالہ دس پندرہ ورق سے زیادہ حجم کا نہ تھا۔ اب گھر پلٹ چلنے کی جلدی ہوئی۔ "چلو بھئی میاں (میرا صرف) بھئی جلدی چلو۔ اسے ذرا سمجھنا ہے۔ بھئی دیکھتے ہو۔ عجب خط ہے"

اتنی جلدی کی کہ جو کتابیں میری پسند تھیں اور میں اُنکے دام چکا رہا تھا اُنھیں جا کر لے کے گھر واپس آنا پڑا۔ گھر پہنچتے ہی نہ تو اُنھوں نے کھانا مانگا نہ حقّا بھروایا صرف کپڑے اُتار کے ساری باندھ لی اور قلم دوات سامنے رکھ کے وہی اشکال بنانا شروع کر دیے۔ پہلے ہفتہ میں سرکاری کتبخانے اور ریڈ کرسچین کالج کے کتاب خانے سے اس موضوع پر جتنی انگریزی کتابیں مل سکیں سب ڈھیر کرلیں۔ ایک مہینے میں مصر و انگلستان سے تقریباً دس بڑی بڑی ہولی تازی عربی اور انگریزی کتابیں نئی آگئیں۔ جن میں سیکڑوں نمبروں کی لوحیں کتبے اور کتابوں کی عکسی تصویریں تھیں۔

دوسرے مہینے میں کتاب کی مدد کے بغیر ان تحریروں کو پڑھنے اور اُنکا مطلب بیان کرنے لگے۔

یہ بھی ان کا دستور تھا کہ جو کوئی ملنے آتا اگر وہ فی الجملہ باسواد بھی ہوا تو نہایت دلفریب طریقے سے وہ اور باتوں کی طرف سے اُس کا ذہن پھیر کے اپنے رجحان کا تابع کر لیتے تھے۔ میں اکثر حاضر رہتا تھا، سو جب سے بزاختش مجھی کو زیادہ بنا پڑتا تھا۔ میں صاف صاف عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس فن کا اصل ذوق نہ تھا۔ وہ الجھن انکی باتوں سے ہوتی تھی ابھار نو مہینہ ڈیڑھ کے بعد اکتانا پڑتا تھا۔ اکثر یہ غرض پڑھنے لگتا

سمجھے تھے مرزا سے ہم کا غم غلط   ایسی باتیں کیں کہ جی گھبرا گیا

اب کہتا ہوں کہ یہ بدنصیبی تھی۔ میں پیاسا بھی تھا۔ پانی میسر بھی نہ تھا۔ ایک شیریں دریا میرے سامنے موجزن تھا مگر اُس پر بھی سوء حظ اور نفس کی شامت نے مجھے محروم رکھا

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں پہلے پہل بائیسکل کی سواری کی وبا پھیلی۔ جناب مرزا کو بھی شوق ہوا۔ دو چرخی پانوں گاڑی خریدی گئی جس ... نے کہا کہ آپ سوار ہوں ہم مدد دیں گے مگر انھوں نے یہ فرمایا کہ "معاف رکھیے یہ بھی کوئی بڑا ہنر ہے جس میں اُستاد کی ضرورت ہو آپ اپنی سائیکل پر بیٹھیے آگے آگے چلیے میں بھی پیچھے آتا ہوں۔ یہی کیا۔ بس پندرہ منٹ میں پیڈل کا توازن صحیح کیا اور گھسیاری منڈی سے چھوٹے لال کے پل کی طرف جس کا نام موتی محل کا پل ہے روانہ ہوئے۔ اس پل کی بغل میں مشرق کی طرف ایک نشیبی سڑک ہے جب اس پر پہونچے تو پہیے خودبخود بہنے لگے۔ پہلے پہل کا بیٹھنا۔ لب سفر تجربہ مفقود۔ کوئی ساتھ نہیں جو سنبھالے بریک کرنا بھولے گرے ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی (یہ ۱۸۹۰ء کا ذکر ہے) مردانگی اور بہادری دیکھیے کہ تیور پر میل نہ آیا بائیسکل ہی پر گھر تک سوار ہوکے آئے ... بس ہو لگنے سے چوٹ ابھری۔ ورم چڑھا۔ اچکن کا اُتنا حصہ تنگ ہوگیا۔ اسوقت اتفاق سے گھر پر کوئی ملازم بھی نہ تھا۔ منشی جے نرائن ورما اثر۔ اور مولانا عبدالحلیم شرر ملنے آئے تھے۔ پلنگ کے کنارے کھڑے کہ جناب مرزا سے ملاقات ہوگئی کوٹھے پر نشست ہوتی تھی درد کی ایذا سے اوپر چڑھنا دشوار تھا۔ منشی جے نرائن سے کہا دیکھیے کوئی ملازم ہو تو آواز دے لیجیے۔ یہیں (نچلی منزل میں) بیٹھیں گے۔ اوپر سے کرسیاں منگوا لیجیے ابھی تک ان دونوں صاحبوں کو اس چوٹ کی خبر نہیں۔ جب ملازم آیا تو اس سے کہا یہاں کرسیاں بچھا دو اور تھوڑا ہلدی چونا پیس لاؤ۔

مزاج بھی عجیب وغریب تھی میں بائیس برس کی عمر۔ ناک نقشے سے درست۔ سانولا رنگ۔ چھریرا ڈیل۔ چوڑی دار گھٹنا ڈاسنٹے۔ دوپٹے کی گاتی باندھے رہتی تھی۔ اتنی مضبوط کہ درخت پر چڑھ کے سرکے بل گرتی اور ہنس کے کھڑی ہو جاتی"۔ تو نوشو گئے۔ میرے ڈنڈ پر لکھے: اس کا قول تھا۔ بلا کی

چالاک اور نڈر۔ مولانا شرر اس سے بہت ہنستے تھے وہ کس سے نہیں ہنستی تھی؟ جناب مرزا نے اسکا نام چھپٹا رکھا تھا (ابھی زندہ ہے) چھپٹا نے جب اچکن اُتاری اور لوگوں نے دیکھا کہ بایاں ہاتھ جناب مرزا کا [illegible] اٹھتا ہی نہیں تو حال کھلا کہ ہنسلی کی ہڈی بیچ سے ڈسلوکٹ ہو گئی ہے۔ بھلا مرزا ڈاکٹر کیوں بلاتے دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے سے ٹوٹی ہڈی کا جوڑ ملایا ہلدی چونے کا لیپ کیا جب سرے لگ گئے تو روئی کی گدی رکھی اور ایک لکڑی کا کڑا اوپر رکھ کے پٹی بندھوائی۔ غرض بی چھپٹا کی سرجری اور جناب مرزا کی سرزوری پر یہ مہم ختم ہو گئی۔ حالانکہ عمر بھر تجربہ ہوا مگر اس حال کا اثر بصورت ایک گرہ کے ابھرا رہا۔ ہاتھ ڈھیلے یا اونچا کرکے آستین پہننے میں ایذا ہوتی تھی۔

منشی جے نرائن پندرہ صفحے کا ایک مضمون اخبارات پر ترجمہ کرانے لائے تھے۔ اسی وقت اُسکا ترجمہ ہوا۔ شب کو آٹھ بجے ایک گھنٹے کے واسطے ادا بلایا تو دن کالج میں پڑھانا پڑتا تھا، درس ناغہ نہیں ہوا۔ البتہ دوسرے دن ریڈر چین کالج میں ناغہ کرنی پڑی۔

تیسرا واقعہ۔ جناب مرزا کی صاحبزادی شادی کے قابل تھی۔ بار کے مارے بی بی کچھ کہہ نہ سکتی تھیں انھوں نے راقم الحروف کو پردے کے پاس بلا کر مجھ سے بات چیت کی (اجازت تھی) آہستہ سے کہا "سنئے یہاں بچوں کی فکر آپ کو نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا "کیا آپ نے کوئی نسبت ٹھہرائی ہے؟" کہا ہاں۔ مگر مرزا صاحب کو آپ آمادہ کیجیے۔ آخر کب تک جوان لڑکی پہلو سے لگی بیٹھی رہے۔ مرزا صاحب کاہلی کرتے ہیں ورنہ کب کا اس فرض سے فراغت پا چکی ہوتی۔

آخری جملہ جس میں جناب مرزا پر کاہلی کا الزام رکھا گیا تھا جناب مرزا نے سن لیا۔ کتاب دیکھ رہے تھے اُٹھا کے ایک طرف رکھ دی۔ جھلا کے بولے "تو ہم کاہل ہیں؟ تم خود کاہل ہو۔ دیکھو آج ہی شادی ہوتی ہے۔ منے میاں ذری خواجہ غلام الثقلین صاحب کو بلا لائیے" (یہ الفاظ آج تک راقم الحروف کے کانوں میں گونج رہے ہیں) صبح کا وقت تھا۔ خواجہ مرحوم کچہری نہیں گئے تھے چلے آئے۔ اتنا اور عرض کر دوں کہ جناب مرزا کی پوری تنخواہ سود میں مہاجن لے جاتا تھا۔ خواجہ غلام الثقلین کو یہ امر بہت ناگوار ہوا اُنھوں نے کل تنخواہ پر قبضہ کر لیا۔ جناب مرزا کی پابندی عہد ملاحظہ کیجیے کہ جس دن سے تنخواہ کے بارے میں زبان ہاری پھر ایک پیسہ بھی خود اُس میں سے نہ لیا۔ ادھر کالج سے چپراسی روپیہ لایا اُدھر فوراً خواجہ مرحوم کے پاس بلا تصرف بھیج دیا گیا۔ اُنھوں نے ماہواری مصارف جناب مرزا کے گھر میں حساب کرکے بھیج دیے کچھ بچا یا کچھ مہاجن کو اصل و سود میں دیا۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا یہ احسان جناب مرزا کبھی نہیں بھولے کہ انھوں نے اپنے انتظام سے یہ روح فرسا آفت

دفع کی۔ بعد ادائی ڈھائی سو میں سے پچاس روپیہ ماہوار بچنے لگا۔ شاید سو روپیہ خواجہ کی تحویل میں باقی تھے
وہ اُن سے یہ کہہ کے مانگ لیے کہ آپ کی بھتیجی کی شادی ہے۔ تین سو روپیہ کالج میں پراویڈنٹ فنڈ کے
جمع تھے پادری بیر صاحب پرنسپل تھے اُن پر بھی ضرورت ظاہر کی گئی۔ انھوں نے بھی فوراً روپیہ دیدیا۔
اب مرزا مرحوم نے چھڑی اُٹھائی دولھا کے گھر پہنچے (دولھے کی رشتہ داری تھی) لڑکے والوں سے
فرمایا: آپ لوگ تقاضا کر چکے اب میں تقاضا کرتا ہوں۔ چلیے دولھے کو بلوائیے۔ آج ہی نکاح ہے
آج ہی رخصتی ہوگی۔ بس اب اُٹھیے۔" اُن لوگوں نے کہا "آئیں۔ اتنی جلدی؟ کسی کو بلوایا نہیں
اطلاع دیتے [illegible]۔ دن تاریخ نہیں دیکھا۔ ساچق کا جوڑا تیار نہیں" جیسا ایک فلسفی ایسے نامعقول
[illegible] نہیں جانتا۔ سب کو ابھی اطلاع ہو سکتی ہے۔ دن تاریخ
اچھا ہے کار خیر [illegible] بعد میں۔ ساچق [illegible]۔ جو میں کہتا ہوں وہی ہوگا اور
آج ہی ہوگا [illegible] بے تکلف اور [illegible] تھے گھر ایک رشتہ دار اور
دوست [illegible] کرتا ہوا۔ بیچارے دولھا والے سر [illegible] ہو رہے۔ یہاں راقم الحروف
کی جان [illegible] شادی [illegible] ضروریات بہم پہونچا [illegible] لکھنؤ کی رسموں کا تانتا بندھا۔ بہرحال
جو کچھ [illegible] اکٹھا کیا۔ [illegible] شب کو ایک بجے اس کار خیر سے
فراغت ہوگئی جب [illegible] حضرت آپ نے جلدی کر کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے تو
[illegible] فرماتے تم سب [illegible] مرزا کے ہاتھ [illegible] اپنی صاحبزادی کی شادی کا پلاؤ تو کھلوائیے
دیکھو کیسا ہوا ہے۔ جناب مرزا صاحب [illegible] سے جد ارادہ کے یہ مرحلہ طے کر دیا۔ پھر خیر
بھی [illegible] واقعات ہیں۔ کہاں تک بیان
کیے جائیں۔ [illegible] یہ حال تھا [illegible] بھاگتی ہوئی آندھی کی طرح ــ
[illegible] کے ساتھ [illegible] ثابت کیا تھا۔ چنانچہ [illegible] سید محمود مرحوم سے (بزمانہ قیام
لکھنؤ) کئی مرتبہ مختلف [illegible] بحث ہوئی سید محمود مرحوم کی یادداشت [illegible] قائل تھا ایک مرتبہ جس چیز کو دیکھ
لیا ہمیشہ یاد رہی۔ ان مباحث میں جناب مرزا کبھی سید محمود مرحوم سے پیچھے نہیں رہے۔ جناب
مرزا کی بحث و تقریر سے جب سید مرحوم خوش ہوتے تو عجب [illegible] کا سماں ہوتا۔ وہ دبوچ کے مرزا
کا منہ چوم لیتے اور مرزا غریب کسمسا کے رہ جاتے۔

واقعات کا تسلسل قائم رکھنا راقم الحروف کے امکان میں نہیں۔ اس وجہ سے کہ پہلے سے کوئی
تذکرہ (یادداشت) محفوظ نہیں۔ مجھ سے اور جناب مرزا سے پہلی ملاقات ۱۸۹۲ء میں ہوئی۔ میری

ولادت کا سنہ ۱۲۷۹ھ ہے۔ ۱۳۱۰ھ میں (غالباً انگریزی ۱۸۹۲ء تھا) میں نے پہلے پہل پنجاب یونیورسٹی کا امتحان دیا اور ناکام رہا۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں پھر امتحان دیا اور پاس ہوا۔ یہ امتحان سنٹینیل ہائی اسکول میں جو اب کالج ہے ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں جناب مرزا وہاں عربی و فارسی کے مدرس تھے لہذا بطور ایک نگراں کے انھیں امتحان گاہ میں ٹہلنا پڑتا تھا۔ میری عمر تمام طلبہ سے کم تھی اسوجہ سے جناب مرزا تعجب کرتے اور میری بنچ کے پاس کھڑے ہوئے میرے طرز تحریر کو بغور دیکھتے تھے میں جناب مرزا سے واقف تھا وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ میں اسوجہ سے صورت آشنا تھا کہ اسوقت جناب مرزا کا قیام مشن کالج میں تھا۔ اور میں جناب پروفیسر علی اصغر صاحب مدظلہ سابق مدرس لکھنؤ یونیورسٹی سے سبق پڑھنے جاتا تھا۔ جناب مرزا کا مکان راہ میں پڑتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سنہ ۱۸۸۴ء میں جناب مرزا نے کتب افلاطون کا ترجمہ اردو میں شروع کیا اور ایک ماہواری پرچہ میں جس کا نام اشراق رکھا تھا یہ ترجمہ باقساط شائع ہوتا رہا۔ والد مرحوم اسکے خریدار تھے۔ انھوں نے اسکی فائل مرتب کرلی تھی۔ مرزا کا نام طبقۂ اہل علم میں اسی زمانے سے مشہور ہوا۔ میں نے اشراق میں انکا اسم گرامی دیکھا تھا۔ والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ شخص (مرزا) حکیم افلاطون ہے جسنے میاوں اپنے ہموطنوں کو حکمت کے جواہر تقسیم کرتا ہے یہ کلمات کانوں میں پڑے ہوئے تھے اور یہی سبب ہے انکی وقعت دل میں تھی۔

اس عمر میں توجہ نہ ہونا قابل تعجب و حیرت ہے۔ مجھے اقبال ہے کہ میں کسی قدر حد اس سے زیادہ شوخ تھا۔ مولانا علی اصغر نے جناب مرزا سے کہدیا تھا کہ ان حضرت کا خیال رکھیے گا شوخی نہ کرنے پائیں۔ شاید اسی وجہ سے جناب مرزا میری بنچ کے پاس ہر پھیرے میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ میرے ساتھ ایک سنسکرت کا طالب علم بھی بٹھا دیا گیا تھا۔ اتفاق اُس بیچارے نے قلم جھٹکا۔ سیاہی کی بوندیں میری آستین پر پڑیں۔ میں نے اس کا انتقام یوں لیا کہ ہر دو منٹ میں قلم جھٹکنا شروع کردیا۔ غریب طالب علم سر سے پاؤں تک گھسی گھوڑا بن گیا۔ جناب مرزا نے میری یہ حرکت دیکھ لی اور چپکے سے کہا "تم ہوں گا مولوی صاحب سے"۔

بعد امتحان سے فارغ ہونے کے جناب مرزا مرحوم سے اور مجھ سے راستے گلی میں ملاقات ہوتی تو بطور ایک شناسا کے پس اُسوقت سے قبل کے تمام واقعات سامنے ہیں۔

مرزا مرحوم نے اپنی طبیعت کا تجربہ "شریف زادے" میں دکھایا ہے اس کتاب میں اُن کے بعض سوانح زندگی بھی ہیں اور خیالات کا عکس بھی ہے۔ جب اُن سے مجھ سے پہلی مرتبہ شناسائی ہوئی

تو اُسوقت وہ داڑھی بہت باریک اُترا تے تھے - ایرانی ٹوپی پہنتے تھے - پتلون نا گھٹنا پاؤں میں -
خیر دانی گلے میں - رنگ گندمی پیشانی بلند - ہونٹ کسی قدر گداز - دہانہ فراخ - قد بلند - دُہرا
ڈیل - بال کٹے ہوئے - مونچھیں گھنی اور بڑی بڑی - آنکھیں کسی قدر چھوٹی (نزدیک بیں) کلائیاں
چپکلی اور مضبوط قوی چنگال بال ایک بھی سفید نہ تھا اور دانت تو مرتے دم تک سالم و مضبوط
رہے - چہرے پر رعب و متانت - آواز باریک اور اُس پر ضیق النفس کا اثر - یہ اُنکا حلیہ تھا -
اُنکی طالب العلمی کا زمانہ کبھی ختم نہ ہوا - لیکن وہ بی اے پاس کر چکے تھے - اُس وقت لکہ زائی کے
امام باڑے کے سامنے گڑھیا تھی وہ پاٹی جا رہی تھی - ریڈ کرسچین کالج کا نقشہ تیار ہو چکا تھا -
اور یہ مشہور تھا کہ جناب مرزا کے خدمات کالج کھلتے ہی اسکول سے منتقل ہو جائینگے جناب مرزا کے رُڑکی
جانے اور سرحدی ملک میں سب اورسیر مقرر ہونے کا زمانہ میری شناسائی سے بہت پہلے کا ہے -
وہ فرماتے تھے کہ میں نے ریلوے کی نوکری فن کیمیا کے ذوق میں چھوڑی جنگلوں میں مارے مارے
پھرنا - زمین ناپنا مزدوروں اور ٹھیکیداروں سے گٹ پٹ کرنا مجھے بہت ناگوار تھا - دفعۃً ایک
کتاب ہشام بن الحکم (شاگرد امام جعفر صادق) کی فن کیمیا میں ہاتھ لگی یہ کتاب سرے سے آخر
تک چیستاں ہے اسکے حل کرنے کا شوق پیدا ہوا قبل ازیں شیخ بو علی بن سینا کا رسالہ کیمیا میں
دیکھ چکا تھا - ہشام کی کتاب نے تنبیہ کی کہ تم اس فن میں بالکل ناقص ہو - پھر ایک سرحدی مُلا سے
ایک کتاب عربی زبان میں ملی جو افلاطون کی طرف منسوب ہے - پس میں نے پہلے تو اپنی تنخواہ پر
تھوڑا سا بار ڈالا - کچھ آلات فراہم کیے فرصت کے اوقات میں نال کھال سے کام لیتا رہا -
تنخواہ لمبی چوڑی نہ تھی - دو سو مشاہرہ اور سواری کا خرچ پاتا تھا - تازہ شوق کے لوازم فرصت
کے طالب - گھبرا کے استعفا دیدیا - لکھنؤ چلا آیا مشن اسکول میں پرشین ٹیچری کر لی - دو ایک
ٹیوشن مل گئے - ایک لوہار کے بچے کو اس شرط پر پڑھانا منظور کیا کہ دھونکنی اور کوئلے شب کو میرے
تصرف میں رہیں گے - یہ ذوق مالی ہوس پر مبنی نہ تھا - مختلف نباتی اجزا کی روح کھینچنا کیمیائی
ترکیب و عمل سے اجساد و نباتات کا حیرت انگیز تغیر - مختلف دھاتوں کے گلانے پگھلانے میں
طرح طرح اور رنگ برنگ کی شعاعوں کا پیدا ہونا کچھ ایسا دلچسپ تھا کہ دنیا و مافیہا سے بیخبر
کر دیتا تھا - نخاس میں قیام کے باعث سید شہنشاہ حسین مرحوم وکیل سے بھی اکثر ملاقات ہو جاتی
تھی - یہ بی اے میں پڑھتے تھے علمی بحث کا اُنھیں بھی لپکا تھا - مگر جب میرے دلائل اُنھیں ساکت
کر دیتے تو وہ جھینپ مٹانے کے لیے مُنہ لٹکا کے طعنہ دیتے "بھئی مرزا یہ مسائل بغیر گریجویٹ ہوئے کسی کی

عـــہ تارٹ سائیڈ ۱۲

سمجھ میں نہیں آسکتے" چنانچہ میں اُن اشغال کے ساتھ ہی انٹرنس کے بعد کے درجے بطور خود طے کرنے لگا۔ اور بہت جلد بی اے کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کر لیا۔ وہ بیان کرتے تھے کہ جب میں دہلی امتحان دینے گیا تو شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ وہ "میبذی" پڑھا رہے تھے شاگرد اُلجھ رہا تھا۔ مولانا کی غضب آمیز تقریر بھی سلجھی ہوئی نہ تھی۔ میں نے آہستہ سے چند لفظوں میں کتاب کا مطلب بیان کیا تو مولانا بہت خوش ہوئے۔ نام اور دہلی آنے کا مقصد پوچھا۔ باتوں باتوں میں دہلی کے جنتر منتر (رصد خانہ) کا ذکر چھڑا اور میں نے اسکے دیکھنے کی تمنا ظاہر کی۔ مولانا ہی کے ساتھ آ کے دیکھا بعد ازاں آلاتِ رصدیہ کے نقشے تیار کیے۔ ایک مرتبہ جناب مرزا سے کاتب الحروف نے پوچھا کہ آپ کو تاریخ سے تو دلچسپی ہے نہیں اسے آپ نے ذلیل کر دیا۔ یہ سوال میں نے منشی سجاد حسین مرحوم سابق مالک اودھ پنچ کے سامنے کیا تھا جبکہ وہ اور میں دونوں ساتھ ہی جناب مرزا سے ملنے گئے تھے۔ مرزا نے ردی کی ٹوکری میں سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالا تو معلوم ہوا کہ تمام تاریخ انھوں نے نظم کر ڈالی تھی۔ وفات و ولادت یا ہر اہم واقعہ کی تاریخ بحساب جمل اس میں موجود تھی۔ منشی سجاد حسین مرحوم نے وہ مجموعہ اپنے پرچہ میں درج کرنے کے لیے اُن سے مانگ لیا۔ اس میں ابواب مناسب بھی تھے مگر وہ منتشر تھے اس وجہ سے مرتب نہ ہو سکے۔

مرزا مرحوم جب کسی فن پر عبور حاصل کرنے کا ارادہ کرتے تو قوتِ نظم سے بہت کام لیتے تھے۔ منطق پوری نظم، عربی کی صرف و نحو قلم بند، مصطلحاتِ مختلف علوم مثلاً فلسفہ و اخلاق، شاعری کے تعریفوں سمیت نظم۔ چند نمونے ان کے رسالہ اشراق میں پائے جاتے ہیں۔ جس کا تذکرہ میں اوپر کر چکا ہوں۔ جناب مرزا نے چند کتابیں افلاطون کی اردو میں ترجمہ کی تھیں جو نہ معلوم ... رسالے ہیں جن میں موجود ہیں افسوس یہ کیمیا اور ہیرا بے شوقی کی آندھی میں اُڑ گئیں۔

(۱) **معذرتِ سقراط** - یہ ایک تخمیناً پانچ جزو کا رسالہ ہے سقراط پر اسکے ہم وطن مفسدوں نے لامذہبی کا الزام لگایا اور یہ بھی کہ سقراط جوانانِ ایتھنز کو اپنے خیالات فاسدہ سنا کے گمراہ کرتا ہے۔ اس حکیم ربانی نے قاضیوں کے سامنے الزاموں سے براءت ظاہر کی اور دفاع میں ایسے مضبوط دلائل پیش کیے کہ تمام کچہری دنگ رہ گئی۔ خصوصاً خطاکاروں کے احتجاج کا ابطال دیکھنے کے قابل ہے اور حق یہ ہے کہ مرزا نے ایسے دقیق مسائل ایسی آسان زبان میں بیان کیے ہیں جسے تھوڑی سی استعداد رکھنے والا بھی سمجھ لے۔ یہ رسالہ "اشراق" میں کامل چھپ چکا ہے۔

(۲) **کرائیٹو** - سقراط نے کرائیٹو کو سمجھایا ہے کہ تمدن کیا ہے اور شہر کے باشندوں کے فرائض کیا ہیں

ہے جو سقراط اور کرائیٹو کے درمیان ہوا۔ اسکا حجم ۲ جزو ہوگا۔ یہ بھی اشراق میں چھپ گیا ہے۔
فیدو۔ جس روز سقراط شہید ہونے والا تھا اُس روز فیدو اُسکا شاگرد مجلس میں گیا اور بقائے نفس
الموت کے مسئلے کے ثبوت کی خواہش کی۔ یہ مسئلہ مجمل طور پر قانیوں کے سامنے بھی چھیڑا تھا۔ چونکہ
سے کا جزو نہ تھا لہذا کماحقہ سقراط کی زبان سے سمجھنا چاہتے تھے۔ اسکا حجم ڈھائی سو صفحے ہوگا
رنت ایک جزو چھپا۔

، گورجیاس۔ فن بلاغت پر دقیق بحث اور مفید بھی۔ اس میں افلاطون نے بہت سے خیالات
نے استاد سقراط کے بھی نقل کیے ہیں۔ موتیوں میں تولنے کے قابل کتاب ہے۔ افسوس کوئی ورق اسکا
سپ نہ سکا۔ حجم ۵ جزو کے قریب ہوگا ترجمہ کمل تھا۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں جبکہ جناب مرزا گولا گنج کے چوراہے
کوٹ پذیر تھے مولانا شبلی مرحوم۔ مولانا حبیب الرحمن علوی کاکوروی حال ناظر مدارس عربیہ مولانا ابوالکلام
اور مولانا خواجہ غلام الثقلین کی رات۔ مرزا کے یہاں اکثر رہا کرتی تھی۔ ایک سیاہ فام مصری عرب صاحب
وہ بھی عربی کے پروفیسر اور معتزلی المذہب آدمی تھے شریک صحبت تھے۔ اتفاقاً یہ ترجمہ جناب مرزا کی ردی
میں رکھا ہوا تھا۔ علامہ شبلی نے اسے اٹھا لیا اور فرمایا کہ چھاپنے کے قابل چیز ہے۔ اُن سے
با الحسن صاحب نے لیا اور مضمون الحسن صاحب سے مصری صاحب نے دیکھا ان کا نام تھا عبدالعلی شاید
یا۔ مصری صاحب نے ایک عمدہ تجویز پیش کی اور فرمایا کہ اگر اسکے حاشیہ پر قرآن کریم کی آیات
کی پیش کی جائیں تو یہ زیادہ مفید ہو جائے۔ ۔۔ الحسن صاحب نے تائید کی۔ غرض یہ کام راقم الحروف
کے سپرد ہوا میری نظر نہ فن بلاغت پر وسیع تھی قرآن پر اس وجہ سے دو برس محنت کرنا پڑی خواجہ
۔۔ علامہ شبلی نے وعدہ فرمایا تھا کہ دارالمصنفین کے کفیل ہونگے۔ مگر علامہ موصوف نے جناب مرزا
سے میری تحریر پر نظر کرنے کی فرمائش کی۔ مہلت جناب مرزا کو نہ ملی اواخر دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء میں ایک صاحب
سے جو لے گئے۔ یہ رسالہ ۴۰۰ صفحے کا ہو گیا تھا۔

(۵) سوفسطائی۔ اصول سوفسطائی کی غلطیاں دکھائی ہیں۔ اسکا ترجمہ بھی کمل تھا۔ کوئی دو سو صفحے ہونگے۔
مگر مسودہ مرتب کی اچاری کی گر پڑی تھی۔ کل ورق ایک دوسرے سے چپک کے رہ گئے تھے جناب مرزا
کو اپنی محنت کے ضائع ہونے پر میں نے کبھی متاسف نہیں دیکھا۔ جس کتاب مرتب کے شیرے میں پڑی
۔۔۔ وہ بنا دی جس نے عرض بھی کیا کہ آپ بتاتے جائیں میں لکھتا جاؤں نقل ہو جائے مگر کبھی اسکی نوبت
نہ آئی

(۶) مینو معارف کے بیان میں پانچ چھ جزو کا رسالہ ہے۔ کیا کہنا۔ ایسی کتابوں کے مطالعہ سے

اصل انسان بنتا ہے اور خدا کا نیک بندہ بنکے جانے کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ یہ مسودہ مدرسۃ الواعظین کو [illegible] کتنا نہ دکھایا ہے تو کتابوں کے ساتھ ملا گیا تھا۔ وہاں کی فہرست میں جو جیسی [illegible] کتاب مرزا نے مدرسۃ الواعظین سے بعض کتابیں پھر واپس لی تھیں۔ ممکن ہے کہ حیدرآباد میں ہو۔ میرے مطالعہ سے گزر چکا ہے۔

(۷) پرمانیدس۔ الہیات میں بڑے مرتبے کی کتاب ہے۔ مشہور مسئلہ مُثُل فلاطونیہ کا بیان اس میں ہے۔ میں نے جب سفر حیدرآباد کیا ہے تو مرزا کے کتب خانے میں دیکھی تھی۔ میں نے کہا بھی کہ دار الترجمۂ حیدرآباد کے نذر کر دیجیے۔ چھپ جائے۔ کہنے لگے تمہارا با خلوص مددگار ملتا تو بیطر حماسہ سے متفرق صفحات کو مرتب کرتا۔ ورق پریشاں میں۔ نا پادرقی ہے نہ ہندسہ۔ میں نے تین شبیں اس کی ترتیب میں صرف کیں۔ ڈھائی سو کے قریب صفحے تھے۔ ترتیب کے بعد جلد بندھنے کو دے دی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ اب ہے یا نہیں۔ جس روز یہ رسالہ جلد ساز کو دیا گیا اُسکے دوسرے روز مرزا نے انتقال فرمایا۔

اُنکا خط بااصول پختہ املا درست۔ لیکن خوشنما نہ تھا۔ مسودہ بہت صاف۔ عموماً کاغذ کے ایک ہی طرف لکھتے۔ دوسری طرف سادہ چھوڑتے۔ بین السطور کا فصل کافی۔ حاشیہ داہنی طرف چار انگل چوڑا۔ نہ بڑا۔ چھوٹے دونوں پر صرف یادداشت لکھتے تھے۔

مرحوم کی عادت تھی کہ لکھنے میں اکثر الفاظ (روابط) چھوڑ جاتے تھے۔ اول تو نظر ثانی کرتے ہی نہ تھے اور اگر ایسا اتفاق ہوا تو پھر بھی بھولے ہوئے الفاظ بڑھاتے نہ تھے۔ راقم الحروف کو اکثر مسودہ صاف کرنا پڑے۔ اُن کی خدمت میں کسی قدر گستاخ تھا۔ جب کبھی ان فرو گذاشتوں پر ہنستا تو خود بھی ہنس دیتے اور کہتے "بس تم کو تو اعتراض کرنا آتا ہے۔ مجھے تصحیح نہیں آتی۔ میں بھول گیا تو آخر تمھیں کس لیے سودہ دیا ہے"۔

جن مصنفاتِ افلاطون کا تذکرہ سطور بالا میں گزرا، یہ میری دیکھی ہوئی ہیں۔ مگر وہ فرماتے تھے کہ "میں نے کئی اور کتابوں کا بھی مکمل ترجمہ کیا تھا جو سلسل نقل مکان کی بدولت اور بعض دوستوں کی عنایت سے (مجھے اُن بعض کا نام معلوم ہے مگر وہ اب زندہ نہیں اس لیے چشم پوشی کرتا ہوں) تلف ہو گیا۔ منجملہ اُنکے کتاب النوامیس یعنی مجموعۂ قوانین ہے جو (۱۵۰۰) صفحات پر ختم ہوئی تھی۔ جب میں نے اسے ترجمہ کیا تھا تو جورس پروڈنس (انگریزی اصول قوانین) اور اسلامی اصولِ فقہ کو بھی سامنے رکھ لیا تھا۔ ارادہ تھا کہ وکالت کا امتحان بھی دے ڈالوں مگر یہ پیشہ صدق و حق سے بالکل علاقہ نہیں رکھتا۔ بعض باتوں کے واسطے بھی جھوٹے ثبوت بنانے پڑتے ہیں۔ اس وجہ سے دل نے قبول نہ کیا"۔

واقعی ایسی زبان کے واسطے جو باعتبار علمی زبان ہونے کے ابھی تک مدارج ابتدائی اچھی طرح طے نہیں کرچکی (اور اب کیا طے کرے گی جبکہ ملک علم کے مومن جہل کی اشاعت سے زیادہ خوش ہو رہا ہے ایسا دشمنِ علم ہے کہ آج ہندوستان بھر میں خادمِ علم ایک پرچہ بھی شایع نہیں ہوتا) یہی تدبیر ترقی تھی کہ عمدہ عمدہ کتابوں کے ترجمے کیے جائیں - قدما میں افلاطون کا مثیل کون ہے؟ جو ایک طرف فلسفہ اور حکمت کا بادشاہ ہے، دوسری جانب فصاحت و بلاغت کا پیر — جس کی طرز تحریر کا مقلد سیسرو کا سا خطیب تھا - سچ پوچھیے تو بنیاد اس کارِ خیر کی مرزا ممدوح نے ۱۸۹۰ء میں ڈالی -

مرزا مرحوم کو میتھالوجی (قصص الاصنام) اور تاریخ علماے قدیم پر بھی بڑا عبور تھا اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں انکا بہت بڑا حصہ انھوں نے اس لیے نظم کر ڈالا کہ یاد رہے -

۱۸۹۲ء میں مجھے طب کا شوق ہوا اور حکیم سید اکبر شاہ مرحوم شاگرد حکیم بقا مغفور سے درس لینے لگا اب جناب مرزا نے مشک گنج سے اٹھ کے وزیر گنج میں سکونت اختیار کرلی تھی مطب کے سامنے ہی مکان تھا - اسکے علاوہ استاد مرحوم جناب سید محمد ایرانی حاذق جو فارسی کے عالی مرتبت شاعر ہونے کے علاوہ فنونِ طبیہ میں کامل مہارت رکھتے تھے جناب مرزا کے احباب میں سے تھے - وہ اکثر ایسے اوقات میں عادتاً ملنے آتے کہ میرا سبق ناغہ ہو جاتا - الغرض اسی زمانے سے میری آمد و رفت شروع ہوئی اور پھر جاری رہی حتیٰ اتاہا ہادم اللذّات و مفرق الجماعات - جناب مرزا کا شوق کیمیا بہت زوروں پر تھا - استاد حاذق مرحوم کو بھی یہ شوق تھا - اسی محلے میں میرے ایک اور استاد مرزا مومن علی بھی رہتے تھے (یہ ایک فاضل جلیل القدر تلامذۂ سلطان العلماء رضواں مآب مولانا سید محمد مغفور سے تھے) کئی مرتبہ سو روپیہ ماہوار پر جون پور اور دوسرے علمی مدارس میں نوکر ہوئے مگر کیمیا کے شوق نے کسی مقام پر جمنے نہ دیا - حکیم اکبر شاہ مغفور کے مکان کے پچھواڑے ایک کچا مکان جو اثاثہ سے بالکل خالی تھا پڑے رہتے تھے - خلاصہ یہ کہ تینوں ہم ذوق ایک مقام پر جمع ہوگئے تھے - دھونکنی چلا کرتی - اور دھونکنے کی خدمت بسا اوقات راقم الحروف کو انجام دینی پڑتی تھی - مجھے اس فن شریف سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی - مگر مجھ سے استاد حاذق نے فرمایا کہ "ممتاز! واللہ قسم (یہ کہنے کی عادت تھی) تم کو طب کا شوق ہے اور طب کا بہت بڑا شعبہ دواؤں کی تقطیر و تصعید، تدبیر و تحریق و تحلیل، کشتوں کا بنانا اور انکا مزاج پہچاننا کیمیا سے تعلق رکھتا ہے - اس فن سے نہ گھبراؤ - یاد رکھو کہ یہ وقت پھر واپس نہ آنے گا" - چارہ کار ہی کیا تھا، سر جھکا دیا - حاصل محنت صرف چند گٹے ہاتھوں میں رہ گئے اور کچھ نہ آیا - پیاسا تھا پیاسا ہی رہا -

کیمیا پر بحث [illegible] دریافت

خدا جانے کس طرح سونا چاندی کا پارہ جلایا پھونکا غارت کیا۔ حاذق مرحوم مختلف دھاتوں کو ترکیب دینے کے بعد صد ابھی کر لیتے تھے۔ جناب مرزا اس پر تیار رہتے تھے گر بے پروا تھے۔ اصول کفایت اسکے نزدیک محال۔ مولانا عوض علی کو اتنا سلیقہ ہی نہ تھا۔ سونے کے رنگ کے کئی جوڑے بنے اور سناروں کے پاس بھیجے گئے۔ کسوٹی پر بھی پورے اترے۔ چرخ چڑھانے پر بھی چوکھے رہے۔ ایک پارسل بنیے میں علاوہ منتوری کو نسخہ سمیت بھیج لیا۔ انھوں نے بہت [illegible] کی ایک زیور بھی بنوایا سونا تو نہیں گر جناب مرزا اور جناب حاذق چاندی بابت آسانی سے [illegible] لیتے تھے۔ باقی اجزا سے شورا قائم [illegible] کیا جاتا اور یہی شورا سب کو صاف [illegible] میں بدل دیتا جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی مالی فائدہ اس سے اٹھانا [illegible] نہایت [illegible] کی بحث کی [illegible]

ایک واقعہ اور یاد آگیا۔ منشی [illegible] تاج [illegible] کے مالک نے جناب مرزا سے فرمائش کی کہ اگر آپ کوئی ایسا مرکب جسدی بنا دیں جو سونے سے [illegible] دیے اور وقت گزرنے پر نہ کالا پڑے نہ سبزی [illegible] زردی [illegible] رنگ [illegible] تو ہم ہزار روپیہ دینگے۔ جناب مرزا اس وقت کیمیا کی جانب سے التفات کم کر چکے تھے۔ مگر پانچ روپے پیشگی لائے [illegible] دھونکنی درست کی اور تیسرے دن آدھ پاؤ کا ڈلا اس عجیب و غریب چیز کا جس میں سونے کی [illegible] تک موجود تھی لے کے چلے۔ راہ میں کالکا سنگھ گھڑی ساز سنار [illegible] (گولہ گنج) جنکی عمر کچھ کم سو برس کی تھی۔ انھیں یہ ڈلا دکھایا۔ پہلے کسوٹی پر انھوں نے کس کیا۔ اسکے بعد تپایا۔ پھر کہنے لگے اٹھارہ روپیہ کے در کا تو میں خریدار ہوں۔ اگر منظور ہو تو روپیہ حاضر کروں۔ جناب مرزا ہنسے تو وہ سمجھے کہ راضی نہیں ہیں اور کہنے لگے کہ اچھا انیس لے لیجیے۔ (اُس زمانہ میں سونا انیس روپیہ بھری کے حساب سے بکتا تھا) جناب مرزا نے صاف کہدیا کہ سونا جعلی ہے اصلی نہیں آپ کو دھوکا ہوا۔ یقین مانیے کہ بیچارے کالکا سنگھ منہ کھول کے رہ گئے۔ اور اپنے بھتیجے دیبا دین سنگھ سے کہنے لگے ایک روپیہ کی مٹھائی تو لاؤ، میں مرزا صاحب کا شاگرد ہونگا۔ بات ہنسی میں ٹل گئی۔ جناب مرزا نے فرمایا کہ میں یہ نسخہ ہزار روپیہ پر بیچ چکا۔ اب کسی کو نہ بتاؤنگا

نمونہ مشین ورکس میں پیش ہوا۔ پانوں کی ایک ڈبیا ڈھالی گئی۔ ڈپٹی سانول داس (افسر [illegible] لکھنؤ) نے وہ ڈبیا پسند کی۔ آدھ سیر کے دام ایک روپیہ فی تولہ کے حساب سے بھیجے۔ شاید دوسرے ظروف ڈھلوانا تھے۔ آدھ سیر مرکب جناب مرزا نے بھیجا۔ تھوڑے دنوں بعد وہ کارخانہ ہی ٹوٹ گیا یہ معاملت بابو [illegible] ایڈیٹر [illegible] دل" لکھنؤ کی وساطت سے طے ہوئی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ نسخہ میں لے آیا ہوں۔ شاید واپس کردیا ہو۔ (باقی)

نصیر

(از مولوی شاہ عیسیٰ صاحب تنہائی اے ایل بی)

آپ کا نام نصیر الدین تھا، اور نصیر تخلص کرتے تھے۔ سیاہ فام تھے اس لیے گھرانے کے لوگ میاں کلّو کہتے تھے۔ آپ کے والد شاہ غریب تھے، جو غربت طبع اور خاکساری مزاج کی بدولت اسم باسمٰی تھے۔ بزرگوں کو چند گانوں دربار شاہی سے بطور معافی ملے ہوئے تھے۔

آپ کے والد بزرگوار نے اُستاد و ادیب رکھ کر آپ کو تعلیم دلائی تھی، لیکن آپ معمولی استعداد علمی سے آگے نہ بڑھ سکے۔ فن شعر میں شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے۔ اس طرح سلسلۂ تلمذ سودا اور درد تک پہونچتا ہے۔ کیونکہ مائل قیام الدین قائم کے شاگرد تھے، اور قائم نے میر درد اور مرزا سودا دونوں سے اصلاح سخن لی تھی۔ آپ نے دو بار لکھنؤ کا سفر کیا، اور حیدرآباد دکن بھی کئی مرتبہ گئے۔ آخری مرتبہ جو حیدرآباد گئے تو پھر دہلی واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ وہیں وفات پائی۔

حیدرآباد میں دیوان چندو لال نے آپ کی بہت قدر کی اور وہاں آپ نے نہ صرف دولت حاصل کی بلکہ شاعری میں بھی خوب نام پیدا کیا۔ اور دلّی میں جو تعداد تلامذہ تھی وہ دکن میں جاکر دوچند بلکہ سہ چند ہوگئی

۱۲۵۴ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ تاریخ پیدائش کسی تذکرہ میں نظر سے نہیں گزری۔ صحیح معلوم نہیں کہ دنیائے دوں سے کس عمر میں رحلت کی، تاہم اُس گفتگو سے جو شاہ صاحب اور آپ کے شاگرد ذوق سے چوتھی مرتبہ دکن جاتے ہوئے دہلی میں ہوئی، ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے کبر سنی میں اس جہان فانی سے رخت سفر باندھا۔ حضرت ذوق عالم تاسف میں اکثر کہا کرتے تھے کہ شاہ صاحب کا یہ مطلع اُنکے حسب حال ہوا

بیاباں مرگ ہے مجنونِ خاک آلودہ تن کیسکا سپے ہے سوزن خارِ مغیلاں تو کفن کیسکا

نیز اس امر سے کہ ساٹھ سال تک مشقِ سخن برابر جاری رکھی، ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ نصیر نے کافی عمر پائی۔

شاہ صاحب نہایت نفیس طبع اور لطیف مزاج اور خوش پوشاک تھے اور ہمیشہ ایک وضع کے پابند رہے۔ ظرافت اور زندہ دلی بھی آپ میں بہت تھی۔ یار باش تھے۔ بوڑھوں میں بوڑھے، بچوں میں بچے بن جاتے تھے

کلام پر تبصرہ آپ کا کلیات دستیاب نہیں ہوتا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ آپ کا مختصر دیوان بھی آسانی سے نہیں مل سکتا۔ میرٹھ میں حافظ محمد اکبر نام ایک بزرگ نے انتخاب کلیات شاہ نصیرؒ ۱۲۹۲ھ ہجری میں شایع کیا تھا۔ اُس کا ایک نسخہ میری نظر سے گزرا۔ اُنھوں نے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے :-

" ایک صحیح نسخہ کلیات شاہ نصیر صاحب کا ملا اور معلوم ہوا کہ علاوہ اسکے اور دیوان بھی شاہ صاحب کی تصنیفات سے ہیں۔ ان تمام دواوین و قصائد کے دیکھنے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ از روے ضخامت تصنیفات شاہ صاحب کی میر تقی کے کلیات سے کسی طرح کم نہیں "

آزاد لکھتے ہیں :-

" اُنھوں نے (سید عبدالرحمٰن خلف میر تسکین شاگرد مومن) بڑی محنت سے ایک مجموعہ ایسا جمع کیا کہ غالباً اُس سے زیادہ ایک جگہ شاہ صاحب کا کلام جمع نہ ہوگا نواب صاحب رامپور نے کہ نہایت قدردان سخن ہیں ایک رقم معقول دیکر وہ نسخہ منگا لیا غزلیں اکثر جگہ کثرت پائی جاتی ہیں مگر قصیدے نہیں ملتے کہ وہ کہیں بہت تھے "

شاید اس بات کا افسوس کیا جائے کہ ایسے شاعر کا کلام ضایع ہوگیا جو اُستادوں کا اُستاد تھا۔ لیکن میرے نزدیک یہ بات کچھ زیادہ رنج دہ نہیں ہے۔ جو کلام پیش نظر ہے اُس سے تو یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ شاہ نصیر کو اول درجہ کا شاعر بھی مانا جائے۔ یہ حُسن اتفاق ہے کہ آپ کو ذوق اور مومن کی اُستادی کا فخر حاصل ہے لیکن آپ کا شمار بلحاظ شاعری دوسرے درجہ کے شعرا میں ہونا چاہیے۔ آزاد نے ذوق کے اُستاد کو محض اس وجہ سے بڑھایا ہے کہ ذوق کی اُستادی میں شبہہ نہ پڑے۔ حالانکہ کسی نامور اُستاد کے شاگردوں میں شمار ہونا اُستادی کا جزو لاینفک نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آزاد کی رائے حقیقتاً یہی ہوگی جو اُنھوں نے آب حیات میں ظاہر کی ہے، تو ہم کو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ غالباً آزاد محض قافیہ پیمائی کو شاعری سمجھتے تھے۔ ورنہ سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرنے کے سوا شاہ نصیر نے اور کیا ہی کیا ہے۔ آزاد فرماتے ہیں :-

" نئی نئی زمینیں نہایت برجستہ اور پسندیدہ نکالتے تھے مگر ایسی سنگلاخ ہوتی تھیں جن میں بڑے بڑے شہسوار قدم نہ مار سکتے تھے "

یہ کوئی تعریف کی بات نہیں ہے کہ ایک شاعر سنگلاخ زمینوں میں کسی نہ کسی طرح قافیوں کو بٹھا دے اور

صرف مروجہ زمینوں میں قدم رکھے تو وہ کوئی بات شعر میں نہ پیدا کر سکے۔ واقعی جو شخص شہسوار سخن ہے وہ کبھی سنگلاخ زمینوں میں قدم نہ رکھے گا کیونکہ وہاں ہمیشہ کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق بننا پڑتا ہے۔ ایک شاہ نصیر پر کیا موقوف ہے، سودا، مصحفی، انشا، ناسخ، ذوق وغیرہم نے بھی سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے لیکن نتیجہ یہی برآمد ہوا کہ انھوں نے اپنے زورِ کلام کو بیجا صرف کیا۔ شاہ نصیر نے یہ غضب کیا ہے کہ ہمیشہ سنگلاخ زمینیں اختیار کیں اور معمولی طرحوں میں بہت کم کہا۔ اگر وہ دوسرے استادوں کی طرح بعض بعض غزلیں سنگلاخ زمینوں میں بھی کہہ لیتے تو مضائقہ نہ تھا لیکن انھوں نے تو اسی خاص بات کو اپنا طرۂ امتیاز سمجھا۔ لکھنؤ میں بھی اپنا علم استادی اسی قافیہ پیمائی کی بنا پر بلند کرنا چاہا اور حیدرآباد میں بھی یہی بات اُنکو مرغوبِ خاطر ہوئی۔ شاید اُس زمانہ میں اس قسم کی شاعری کو لوگ پسند کرتے ہوں مگر اب تو اس قسم کی طبع آزمائی فضول اور بیکار سمجھی جاتی ہے۔

یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ نواب شیفتہ نے گلشنِ بے خار میں آپ کی شاعری کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تعلقات کی بنا پر صاف صاف لکھنا گوارا نہیں کیا اور ادھر ادھر کی باتیں کہکر آپ کے کلام کا نمونہ دیدیا۔ اور اصل بات کو اُڑا دیا۔ چنانچہ شاہ نصیر کے حالات کے تحت میں فرماتے ہیں:۔

"نصیر تخلص شاہ نصیر الدین سجادہ نشین یکے از خلفائے شاہ صدر جہاں علیہ الرحمۃ والغفران است۔ از مدت شصت سال بر مشقِ ریختہ است۔ باکثر معمورہ ہائے مشہور مثل لکھنؤ و حیدرآباد وغیرہم گذرہ رفتہ و با شعرائے شہر ہر دیار برخوردہ و مطارحہ و مشاعرہ کردہ باستادی نام برآوردہ۔ ہنگام قیام جہان آباد بتاریخ پانزدہم و بست و نہم ہر ماہ محفلِ مشاعرہ منعقد می سازد۔ زمین ہائے سنگلاخ طرح می کند۔ با فقیر تعارف و شناسائی دارد، مردِ نیک و صاحب صفاتِ حسنہ است"

شاید کہا جائے کہ "باستادی نام برآوردہ" شاہ نصیر کی تعریف میں کافی ہے۔ لیکن یہ رائے شیفتہ کی نہیں بلکہ اُس وقت جیسا لوگ کہتے تھے انھوں نے وہی لکھ دیا ہے اور یہ کہیں نہیں لکھا کہ میں نے بھی ان کا کلام دیکھا فی الواقع ایسا ہی ہے۔ جن شعرا کو شیفتہ بلند پایہ سمجھتے تھے اُن کی تعریف صاف طور پر کی ہے، اور جن شعرا کو وہ اچھا نہیں خیال کرتے تھے اُن کی نسبت بھی صاف الفاظ میں رائے دی ہے شاہ نصیر کو اپنے تعارف و شناسائی کی بدولت یا اپنے اُستاد مومن کے اُستاد ہونے کی فضیلت میں بالاجمال چند سطور لکھ کر اپنی تنقید سے صاف کر دیا ہے۔ ورنہ درحقیقت شاہ صاحب کا کلام اس قابل نہیں ہے کہ کسی سخن فہم سے خراجِ تحسین وصول کرے۔

اس میں کلام نہیں کہ آپ نے چست تراکیب اور تشبیہات و استعارات کو بعض مقام پر خوب

ممن سے مانند بجائے تین سو ساٹھ ۔ رنگ بجائے رنگ کر ۔ ع کرتا ہے مجھکو قتل تو سنہری میں ہنس ساتھ بجائے سوا سے میرے ۔ دیکھ بجائے دیکھ کر ۔ نت مبنی ہمیشہ ۔ وار اکرتا بجائے تصدق کیا کرتا ۔ ذرا وغیرہ وغیرہ ۔

آپ کے انتخاب کلیات میں جو ہمارے پیش نظر ہے تقریباً دو ہزار اشعار غزلیات کے ہیں ۔ چار رباعیاں ہیں اور ایک قطعہ ہے اور چار قصیدے ہیں ۔ ناسخ غزل بہت پھیکا اور بے کیف ہے ۔ ہم نے بمشکل تمام بہتر اشعار کی تعداد جن کو بہتر کہا جا سکتا ہے پوری کی ہے :-

۱۔ دل کو اسے شاہد معنی جو معطا کرتا
تو اس آئینے میں صورت تری دیکھا کرتا

۲۔ کیا ہوا اگر چشم تر سے خوں ٹپک کر رہ گیا
بادۂ گلگوں کا ساغر تھا چھلک کر رہ گیا

۳۔ دیکھ تو یار بادہ کش میں نے یہ کام کیا کیا
نیکے کباب دل تجھے حق نمک ادا کیا

۴۔ زخم جگر سے دم بدم کب نہیں خوں بہا کیا
تو بھی مسیح نے آپ سے دعوے خوں بہا کیا

۵۔ آب میں سایۂ نخل گر رخ دلبر ہوتا
شاخ ہر موج سے پیدا گل احمر ہوتا

۶۔ دل میں گر تو ہو تو ہم آہ بھی کھینچیں ورنہ
شمع روشن کریں اس خانۂ ویران میں کیا

۷۔ کیا کوئی سر بلند کرے دعوے عروج
سایہ ہے پائمال سدا کوہسار کا

۸۔ اے جنگ مہ کہاں ہے حاجت گل کشاں کا
نالہ سے میرے شق ہے گنبد یہ آسماں کا

۹۔ خط کے لیجانے کو وہاں کوئی میسر نہ ہوا
دُر ہوا اشک صد افسوس کبو تر نہ ہوا

۱۰۔ یار دشمن اتنا مجھے قاتل نے ستایا
جتنا کہ مرے دشمن جاں دل نے ستایا

۱۱۔ تھا ایک تو صیاد دگر تنگ قفس میں
اور دوسرے آوازِ عنا دل نے ستایا

۱۲۔ برگشتہ بخت ہم وہ اس دور میں ہیں ساقی
لب تک کبھو ہمارے جام و سبو نہ آیا

۱۳۔ ہر دم نصیر رہ تو امید وارِ رحمت
تیری زباں پہ کس دن لا تقنطوا نہ آیا

۱۴۔ تلاش رزق بھی رکھتی ہے سب کو گردش میں
کہ پھرنے سے نہ کبھو سنگ آسیا ٹھہرا

۱۵۔ محیطِ ہستیٔ فانی میں ایک دم کے لیے
عبث حباب ہے تو بانسنے ہوا ٹھہرا

۱۶۔ شبنم و گل کی روش شادی و غم توام ہے
چشم گریاں ہے جہاں واں لب خنداں پیدا

۱۷۔ گو ہنسو تم تو پڑے آہ جہاں میں بجلی
میں اگر رودوں تو عالم میں ہو طوفاں پیدا

۱۸۔ فیض دریا ہو تنک مایہ سے کیونکر جاری
قطرہ کب آب گہر سے لب ساحل نکلا

۱۹۔ بچنے کے لیے جنبشِ لب کا ترے کشتہ
منت کش احسانِ مسیحا نہیں ہوتا

۲۰- پھرتا ہے وہاں خاک بسر قیس کہ جس جا نقشِ قدمِ ناقۂ لیلیٰ نہیں ہوتا
۲۱- کب سزاوار ہے بندے کو انا الحق کہنا مجھ سے گر پوچھو تو رتبہ میں بشر ہے نیچا
۲۲- اللہ ری شرارت تری اے نالۂ مجنوں ایک شعلہ بیاباں کے خس و خاشاک چمکا
۲۳- کر گئی جانِ حزیں تن سے سفر اچھا ہوا تھی امانت جسکی، پہنچی اُسکے گھر اچھا ہوا
۲۴- روز کی جانکاہی و محنت کشی سے چھٹ گیا مر گیا فرہاد تیشہ مار کر اچھا ہوا
۲۵- سامنے آنکھیں نہ کر سر در گریباں ہو تفسیر تجھے کیا دنیا میں کام ملے بے ہنر اچھا ہوا
۲۶- فسانہ گر کروں اظہار اپنی شامِ غربت کا گریباں تا بدامن چاک ہو صبحِ قیامت کا
۲۷- نہیں چھٹتا ہے داغِ معصیت اشکِ ندامت سے کہ ہر شست و شو ہوں منتظر بارانِ رحمت کا
۲۸- سر پہ افسر چاہیے نہ مسند زر زیرِ پا ہم گدا ہیں خاک کا کافی ہے بستر زیرِ پا
۲۹ خاک ہو کر بھی ہوئی اُنکی نہ پابوسی نصیب کاش سنگِ آستاں رہتا نہ بنکر زیرِ پا
۳۰- جائے عبرت ہے یہ دنیا عاقلو ڈرتے رہو آج تھا جس سر پہ ہے وہ کاسۂ سر زیرِ پا
۳۱- اے اشکِ رواں ساتھ لے آ جگری کو عاشق کہیں بے فوج و علم اُٹھ نہیں سکتا
۳۲- سر معرکۂ عشق میں آساں نہیں دینا گاڑے ہے جہاں تیغ قدم اُٹھ نہیں سکتا
۳۳- ہر جا متجلّی ہے وہی پردۂ غفلت اے معتکفِ دیر و حرم اُٹھ نہیں سکتا
۳۴- خیالِ زلفِ بتاں میں نصیر پیٹا کر گیا ہے سانپ نکل تو لکیر پیٹا کر
۳۵ نکلے تھی دمِ تیشہ رگِ سنگ سے آواز فرہاد یہ دشمن ہے تری جان کا لوہا
۳۶- قیامت آپ کا قد اُس کے دلپذیر ہوا چھڑی لے سروِ چمن ہوا فقیر ہوا
۳۷- کمان و تیر کا ربط تھا مجھے اُس سے جب اُس نے آپ کو کھینچا میں گوشہ گیر ہوا
۳۸- مجھکو بارش سے چمن میں نہیں کچھ کام سوا تو ہی بارش ہے گر اشکوں میں ترا نام شراب
۳۹- کیوں نہ کہیں بشر کو ہم آتش و آب و خاک و باد قدرتِ حق سے ہیں بہم آتش و آب و خاک و باد
۴۰- خود بخود طاق سے شیشہ جو گرا اے ساقی روح تھی کس کی یہ مینا سے کہ لب میں بند
۴۱- جو اپنے رُخ سے وہ خورشید رُو اُٹھائے نقاب تو شورِ حشر ہو برپا زمیں کے پردے پر
۴۲- چڑھائی چادرِ مہتاب شب جنگل نے جیوں پر کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گرد اس پر
۴۳- میں کیا کہوں ظاہر ہے زمانہ کی دو رنگی اس ابلق رہوار میں دن رات کا ہے فرق
۴۴- تھوڑی ہی سی بساط و آپس میں لڑتے ہیں بگڑا عجب زمانہ کی ہے کچھ ہوا کا رنگ

۴۰۔ کیا تماشا ہے وہ اللہ فرشتہ تو دہوں　　　محرم رازِ نہاں یہ خاک کا پتلا ہے

۴۱۔ کھلکھلا کام تو گل سے جو بن جاتے ہیں　　　تابِ برنائی پہ ہر اہل دو دل کی کھی

۴۲۔ کس کے دامن کی جھلک دیکھی ہے جو پھر　　　اے فلک چاک گریبانِ سحر کرتا ہے

دردِ جگر

(از جناب علی سکندر خاں صاحب جگرؔ مرادآبادی)

درد بڑھ کر فغاں نہ ہو جائے　　　یہ زمیں آسماں نہ ہو جائے

پھر کوئی مہرباں نہ ہو جائے　　　سعیِ غم رائیگاں نہ ہو جائے

موت سے ڈر نہیں مگر ہے یہ وہم　　　عشق بے خانماں نہ ہو جائے

دل میں ڈوبا ہوا ہے جو نشتر　　　میرے دل کی زباں نہ ہو جائے

دل کو لے لیجیے جو لینا ہے　　　پھر یہ سودا گراں نہ ہو جائے

دور ہے عرصۂ عدم آباد　　　گم کوئی ناتواں نہ ہو جائے

قسمتوں سے ملا ہے درد ہمیں　　　کہیں آرامِ جاں نہ ہو جائے

آسماں کو نہ دیکھیے تن کر　　　پھر یہ بوڑھا جواں نہ ہو جائے

اور بھی کچھ جو سوچ رکھا ہے　　　وہ بھی کیوں امتحاں نہ ہو جائے

حسن کا آئینہ تو دل ہے مگر　　　یہی خود درمیاں نہ ہو جائے

آہ کیجیے مگر لطیف ترین　　　لب تک آ کر دھواں نہ ہو جائے

عشق اپنی خوشی سے کون کرے　　　عشق اگر ناگہاں نہ ہو جائے

عشق کر ہی چکا تھا اپنا کام　　　دل اگر درمیاں نہ ہو جائے

آہ دل تیر ہی سہی لیکن　　　آشنائے کماں نہ ہو جائے

خاک سیرابیِ بہار اگر　　　شوق شبنم فشاں نہ ہو جائے

عشق میں جتنے بدگماں ہیں ہم　　　یوں کوئی بدگماں نہ ہو جائے

جس نے بے حال کر کے چھوڑا تھا　　　پھر وہی امتحاں نہ ہو جائے

تا کجا انتظار خلد جگرؔ

حور اک دن بہار نہ ہو جائے

قدیم مصریوں کا مذہب

(از جناب منشی سراج احمد صاحب علوی بی اے)

[ایلی ایم بروک نے "دی شائننگ ایسٹ" کے نام سے ایک مختصر کتاب مرتب کی ہے جس میں مشرق کی تہذیب کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ کتاب اگرچہ طلباء کے لیے لکھی گئی ہے اور اسی وجہ سے حالات بالتفصیل نہیں لکھے گئے ہیں مگر جو کچھ معلومات اس کے اندر فراہم کی گئی ہے کافی دلچسپ ہے۔ اور اس کا مطالعہ عام طور پر مفید اور سودمند ہوگا۔

مؤلف کتاب نے مصر قدیم - دجلہ و فرات - فارس فلسطین فنیشیا کے عنوانات سے تین ابواب قائم کیے ہیں - اور ہر باب کے ضمن میں مختلف سرخیاں دے کر ہر ملک کی تہذیب و تمدن کا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔

مصر قدیم کے ماتحت جو سرخیاں قائم کی ہیں اُن میں قدیم مصریوں کا مذہب بھی شامل ہے۔ شروع میں مؤلف نے اپنے نظریہ کے مطابق مذہب کی ابتدا اور ارتقا پر مختصر نوٹ لکھا ہے اور اسکے بعد مصری مذہب کے حالات دیے ہیں۔

ناظرین الناظر کی دلچسپی کے لیے اسی کا ترجمہ بتصرف پیش کیا جاتا ہے۔]

مذہب کے متعلق کسی قوم کے کیا خیالات تھے یا ہیں؟ اس کا تجسس اور علم ہمیشہ باعث تفریح ہوتا ہے۔ جب کبھی ہم ایسے لوگوں کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں جو تاریخ کے ابتدائی دور سے گزر رہے ہوں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شاہراہِ تہذیب پر زیادہ دور نہیں چلنے پاتے کہ اپنی حیات کی بھول بھلیاں اور دنیا کے حیرت زا طلسم میں پھنس جاتے ہیں۔ روزمرہ عجیب و غریب اتفاقات پیش آتے ہیں۔ کبھی انھیں مسرت حاصل ہوتی ہے کبھی غم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ ہر شے ان کے قبضۂ قدرت و اختیار سے باہر ہوتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں اور متحیر رہ جاتے ہیں رفتہ رفتہ ان کے دلوں میں یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ ضرور کہیں نہ کہیں کوئی قوت اس سے زیادہ جابر اور برتر موجود ہے جس کی خوشنودی حاصل کرنا لازمی ہے۔ اس وجہ سے کہ نظامِ حیاتِ انسانی کا دارومدار اُسکے رحم و کرم پر موقوف ہے۔ اس خیال کے ساتھ بعض فدائیوں کو محسوس ہوتی رہے کہ وہ ایسی تدابیر اختیار کریں اور اس طور سے زندگی بسر کریں جس سے وہ قوتِ عظیم

روشنی اور خوش رہے ۔ اس طرح سے مذہب کی داغ بیل پڑتی ہے ۔ بسا اوقات وہ یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ
وہ قوت مختلف اشکال میں رونما ہوتی ہے اور اسکے مظاہر میں بین فرق پایا جاتا ہے ایسی
حالت میں اس قوت کی وحدانیت میں شک و شبہہ پیدا ہونا لازمی ہے ۔ اور اس خیال کی اصلاح
وہ یوں کرتے ہیں کہ بیشمار جابر روحیں موجود ہیں جو ایک مرکزی جابر قوت کے ماتحت ہیں ۔ یہیں سے
لاتعداد دیوتاؤں اور دیویوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ۔

مصریوں سے زیادہ پیرو مذہب قوم نہ تاریخ کہن پیش کر سکتی ہے اور نہ تاریخ موجود کسی ایسی قوم کا پتہ دے
سکتی ہے ۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی مصر میں اتنی کثرت تھی ایک رومی مصنف نے لکھا ہے کہ مصر میں دیوتا
کا ایک انسان کے مقابلے میں میسر ہونا زیادہ آسان تھا ۔ ان دیوتاؤں کی تعداد دو ہزار سے زائد تھی مگر
یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون دیوی یا دیوتا سب سے زیادہ مقدس سمجھا جاتا تھا ۔

ہمارے کان جس دیوتا کے نام سے زیادہ آشنا ہیں وہ اوسیرس ہے ۔ وہ خیر کا دیوتا مانا گیا ہے ۔ اسکے
متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ انسانی لباس میں جنوب میں حکومت کرتا تھا اور صحیح معنوں میں بادشاہ تھا ۔ اسکے
ایک حاسد بھائی نے اُسے فریب سے قتل کر ڈالا ۔ لیکن اوسیرس عالم لاہوت میں پھر نمودار ہوا اور لازوال
اور غیر فانی عالم کا بادشاہ بن گیا ۔ وہیں سے وہ حیات انسانی کی حفاظت کرتا اور مرنے کے بعد جملہ
ارواح انسانی کو اپنے تصرف میں لے آتا تھا ۔ ہر روح اسکے کمرۂ عدالت میں وزن کی جاتی تھی اور
یا ی عمل کے مطابق اُسے صلہ دیا جاتا تھا ۔

اس بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مصری ایک ایسے خدا کے ضرور قائل تھے جو لباس انسانی
میں زمین پر آ چکا تھا ۔ نیز یہ کہ وہ روح کو غیر فانی سمجھتے اور جزا و سزا کے بھی قائل تھے ۔

آئی سس اوسیرس کی زوجہ تھی ۔ جو اسکے قتل کے بعد اُسکی نعش کی تلاش میں روتی پھرتی تھی اور
ایسے میں جو آنسو گرتے تھے وہ دریا میں طغیانی پیدا کر دیتے تھے اور چاروں طرف سیلاب
آ جاتا تھا ۔ ہر سال ماہ جون میں مصری آئی سس کے احترام میں "آنسوؤں کی رات" کے نام سے
تہوار منایا کرتے تھے جبکہ دریائے نیل طغیانی پر ہوتا تھا ۔

آئی سس کو آخر کار مقتول دیوتا کی نعش مل گئی اور اُس نے اپنے فرزند ہورس کی مدد سے جو مافوق
الانسانی قوتوں کا مالک تھا اوسیرس کو نجات دلائی ۔

سب سے بڑا کام جو ان دونوں نے مل کر انجام دیا وہ اوسیرس کی نعش کی ممی کا تیار کرنا تھا اور
ں مصری رسم کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے

بعض مصری علم و عقل کے دیوتا تھاتھ کو سب سے زیادہ مقدس سمجھتے ہیں اور اسکے پاس جس [illegible] سمجھتے تھے اس لیے کہ مصریوں کے نزدیک تمام اشیا کا خالق وہی سمجھا جاتا تھا۔ اُس نے اپنی [illegible] [illegible] پیدا کیا۔ آسمان کو زمین سے جدا کیا اور آسمان کو چار ستونوں پر نصب کیا۔

[illegible] فنون کا مرکز تھا، آئی سس اور ہورس کو سحر کی تعلیم اسی نے دی۔ فن کتابت اسی نے ایجاد کیا اور دیگر دیوتاؤں کا وہ منشی تھا۔ اوسیرس کے کمرۂ عدالت میں انسانی روحوں کے وزن کرنے کا کام بھی اسی سے متعلق تھا۔

عظمت و مرتبت میں را (سورج دیوتا) بھی تھاتھ کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ مصری بھی دوسری قوموں کی طرح سورج کی عظمت بحیثیت حیات بخشندہ کے بہت کرتے تھے۔

انسانی تخلیق کا تعلق را سے تھا۔ جو انسان اسکے آنسوؤں کے قطروں سے پیدا ہوتے تھے وہی دراصل انسان کے لقب کے مستحق سمجھے جاتے تھے اور یہ مصری ہوتے تھے۔

را نے بہت عرصہ تک خدائی کی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اُس کا نام بھی عزت کے ساتھ لینا چھوڑ دیا۔ اور ان کی سرکشی اس حد تک پہونچ گئی کہ را نے نسل انسانی کے فنا کر دینے کا حکم دیدیا۔

مصری دیوتاؤں کی نہ مکمل فہرست مرتب کرنا آسان ہے اور نہ انکے متعلق صحیح حالات فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اُن جانوروں کا ذکر نہ کرنا جو مصریوں کے نزدیک بمنزلہ دیوتا کے سمجھے جاتے تھے، مصریوں کی داستانِ مذہب کو نامکمل چھوڑ دینے کے مترادف ہے ان قابلِ پرستش جانوروں کی بھی ایک کثیر تعداد تھی۔ منجملہ انکے گرمچھ، بلی، اور گائے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اور ان میں دل الذکر دو جانوروں کی پرستش مصریوں کے لیے مخصوص ہے۔

گرمچھ بہتر کے زمانے سے متبرک سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ گرمچھ بلحاظ شکل و صورت کسی طرح بھی قابلِ احترام نہیں ہو سکتا، لیکن اسکی عجیب و غریب ہیئت اور صبا رت ہیبت طاری کرنے کے لیے کافی تھی۔ مصریوں کے خیال کے مطابق گرمچھ کا وطن دریائے نیل تھا۔ اور دیوی مقدسۂ نیل کو اسکے ساتھ خاص اُنس تھا۔ اسی خیال کی بنا پر مصر میں ایک بہت بڑی عمارت بنائی گئی تھی جو (Labyrinth) لیبرنتھ کے نام سے موسوم تھی۔ ایک وسیع میدان میں یہ عمارت قائم کی گئی تھی۔ اس میں پندرہ سو [1500] کمرے زمین دوز اور اسی تعداد میں زمین کے اوپر تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ عمارت گرمچھ دیوتاؤں کی طرف منسوب تھی۔ اور عمارت کے ایک مخصوص حصہ میں متبرک گرمچھوں کی کثیر تعداد دفن تھی۔

بلی بھی گرمچھ کی طرح قابلِ احترام تھی۔ اور سیاہ بلی زیادہ متبرک سمجھی جاتی تھی۔ [illegible] میں تیبوں کی [illegible]

بھی منسوب ہیں۔

قدیم مصری اپنے مذہبی رسوم اور اعتقادات میں اتنے مستقل مزاج تھے اور دیوتاؤں دیویوں کے ایسے سچے پرستار تھے کہ اُنکے مذہبی پیشواؤں کی جماعت بھی ایک خاص حیثیت اور وقار رکھتی تھی انھیں خاص قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہ علوم کے مقتدا سمجھے جاتے تھے۔ انکی طرز انشا جدا تھی۔ انکے مندر اور معابد بھی مصری عمارتوں میں ایک امتیازی شان رکھتے تھے۔ بادشاہ وقت مذہبی پیشواؤں کا سردار سمجھا جاتا تھا۔ حکومت کا کام صرف اتنا تھا کہ ان مذہبی پیشواؤں کا انتظام کرے، ملک کے کل عہدوں پر مذہبی پیشوا مامور کیے جاتے تھے۔ ان مذہبی پیشواؤں کا اقتدار اور تقدس اس حد تک بڑھا اور مصریوں نے انھیں اتنا واجب الاحترام بنا دیا کہ برتر انسانوں کا ایک الگ طبقہ قائم ہو گیا جو عامہ خلائق سے بزرگتر اور دیوتاؤں سے اُتر کر مقدس سمجھا جانے لگا۔

مصر ایسے مذہب پرست ملک میں مذہبی کتب کی کب کمی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ تمام لٹریچر مذہبی نعت سے پُر تھا۔ مصری ادب کا ایک حصہ صرف اُن کتابوں پر مشتمل تھا جن میں روزمرہ کے عبادات، نعت، دعائیں، جنتر منتر اور پیشواؤں کے خطبات مدون تھے۔ بعض کتب صرف مُردوں سے متعلق رسوم اور ممیوں کے متعلق احکامات سے پُر تھیں۔ ایک بہت بڑی تعداد اُن کتب کی بھی تھی جو سفر زندگی اور حیات مابعد کے تذکروں سے مملو تھیں۔ ان کتابوں میں زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق اتنی وضاحت اور تفصیل سے کام لیا گیا تھا کہ تزکیہ روح اور اصلاح نفس کے لیے وہ "رہبر کامل" کا کام دیتی تھیں۔

لیکن مذہبی لٹریچر میں تحریروں کا وہ ذخیرہ سب سے زیادہ عجیب و غریب تھا جو کتاب الممات کے نام سے موسوم تھا۔ اس کتاب کے سب سے قدیم حصہ میں وہ مذہبی تحریریں بھی شامل تھیں جو سکارا کے اہرام کی اندرونی دیواروں پر کندہ تھیں۔ اس اہرام کا زمانہ تعمیر ۳۰۰۰ سال قبل مسیح سے بھی کچھ پہلے خیال کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں کہ کتاب مذکور سے مصریوں کے مذہبی اعتقادات پر کافی روشنی پڑتی ہے اس میں اُن کثیر رسوم کا بھی مفصل حال تحریر ہے جو روح کی حیات بعد الممات سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً اسکے ایک سو پچیسویں باب میں قفس عنصری سے آزادی پانے والی ایک نئی روح کا طویل اعلان ہے۔ جس میں اُس نے بیان کیا ہے کہ اپنی دنیاوی زندگی میں وہ فلاں فلاں گناہوں کے پاس بھولے سے بھی نہیں بھٹکی اور ان سے قطعی محترز رہی۔ ہر وہ تحریر جو پیپرس کے اوپر پائی جاتی تھی۔ اس میں تصاویر بھی موجود ہوتی تھیں جن سے اُن مقامات کی مزید تشریح ہو جاتی تھی۔

مصریوں نے طرح طرح سے اپنے ادبیات کو مذہبی رنگ میں پیش کیا تھا اور بظاہر اُنکے دل میں

ان کی بہت منزلت تھی۔ برٹش میوزیم میں پیپرس پر لکھی ہوئی چند دستاویزیں موجود ہیں۔ جنکا مطالعہ خالی از لطف نہیں ہے۔

قطعاتِ محمود

(از جناب منشی محمود حسن خاں صاحب محمود اسرائیلی)

سزائے حق گوئی

اِس دورِ معصیت میں جو چاہے وہ بول لے — تھوڑا سا کذب صدق کے ساغر میں گھول لے
اہلِ ہوس کے کرتب پہ حیراں ہیں حق شناس — گر سچ کہے تو دشمنیِ خلق مول لے

قیدیوں کی اولاد

ہے بیگناہوں پہ ظلم و ستم تماشا ہے — یہ طرزِ عدل میں کیا نیا اضافہ ہے
گنہگار کو ملتی ہے قید میں خوراک — اور اُسکے بچے جو گھر میں ہیں اُنکو فاقہ ہے

شقاوتِ مستقل

جہاں میں حسنِ گل و رنگِ آب و گل بدلا — ہزار حیف کہ انسان کا نہ دل بدلا
ازل سے دیکھتے آئے ہیں اسکی فطرت کو — شقاوتوں میں نہ اب تک یہ ایک تل بدلا

فدایانِ علم

بامِ کلفت پہ رہِ شوق سے جو چڑھتے ہیں — وہی میدانِ ترقی میں یہاں بڑھتے ہیں
جستجو علم کی رکھتی ہے انھیں سرگرداں — جیتے ہیں پڑھنے کو جینے کے لیے پڑھتے ہیں

شانِ اولوالعزمی

لوگ جب رات کو بستر پہ پڑے رہتے ہیں — تارے پیشانیِ گردوں پہ جڑے رہتے ہیں
عرق آلود جبیں پونچھتے جاتے ہیں دلیر — اور سپاہی کی طرح ہر دم کھڑے رہتے ہیں

مراسلات

میرے محترم - سلام مسنون

براہ کرم مندرجۂ ذیل سطور کو اپنے وقیع رسالہ کے کسی گوشہ میں جگہ دیجیے :-

(۱)

بعض اصحاب (جنکے نام کی پردہ دری نہ ہو تو اچھا ہے) اُردو زبان میں ہندی الفاظ کی "ٹھوسم ٹھاس" سے برگشتہ خاطر نظر آتے ہیں۔ بے محل ہندی الفاظ کے استعمال تک اُن کا اعتراض قابل ستایش ہے۔ مگر یہ لکھنا کہ "بعض بگڑے شاعر رباعیات سرمد کی شدھی کرنے پر خواہ مخواہ تلے ہوے ہیں" کسی طرح قابل برداشت نہیں۔ چنانچہ اس قسم کے اعتراض کے جواب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اُردو زبان (جیسا کہ دنیا جانتی ہے) فارسی اور ہندی زبان کے شیر و شکر ہونے کا نتیجہ ہے۔ جس طرح اُردو رسائل میں فارسی قصائد و غزلیات شایع کرنا اُنکو وقیع بنانے کی کوشش کرنا ہے، اسی طرح اگر اسی خیال کو مدنظر رکھ کر کبھی کبھی کچھ ہندی کلام فارسی رسم الخط میں شایع ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ بہ نسبت فارسی کے ہندی زیادہ عام فہم ہے۔ چونکہ اُردو اور ہندی میں زیادہ بُعد نہیں، اس لیے ہندی کا حق اور بھی زیادہ مسلّم ہے۔ یوں اگر ہنود کی طرح اُردو زبان والوں کی جانب سے مندم مندا میں ہندی سے نفرت برتی گئی تو ہمارا ہی نقصان ہے کیونکہ اس طرح جیسے "ہندی" الفاظ کے اعتبار سے کم مایہ ہے "اُردو" بھی کم مایہ ہو جائیگی۔ اور بادی النظر میں یہ بات زیادہ قابل غور ہے کہ اُردو کے ماں باپ (فارسی) اور ہندی ہیں، اس لیے دونوں کا حق مسلّم ہے۔ ماں کو چھوڑکر باپ کا ہو رہنا یا باپ کو چھوڑکر ماں کا ہو رہنا بے انصافی ہی نہیں بلکہ ایک حد تک نالایقی ہے۔ لہذا ہمارا فتوےٰ تو یہ ہے کہ اُردو زبان کے وہ رسائل جو اُردو کے ساتھ صرف فارسی کلام شایع کرتے ہیں وہ بے انصاف اور ناحق شناس ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر رسالۂ الناظر کو اس قسم کی بے انصافی سے بچانے کے لیے سرمد کی دو رباعیاں مع ہندی ترجمہ ارسال کی جاتی ہیں۔

(۲)

رسالہ معلومات ماہ اگست سنہ ۳۳ء صفحہ ۴۶ کالم نمبر ۱ میں جناب ایڈیٹر صاحب—

یعنی حضرت قبلۂ عالی متعالی مولانا صہبا والی صاحب مدظلہٗ نے حقیر پُر تقصیر پرکُفر کا فتوےٰ کچھ ایسا انداز میں صادر فرمایا ہے کہ کفر سے کُفر اور اُدب سے اُدب (یہ والہی کی سوپرلیٹو SUPERLATIVE ڈگری ہے) مولوی بھی مولانا کی اس ادا پہ ہنسے بغیر نہیں رہ سکتے۔ محترمی و مکرمی جناب مولانا عبد الشکور مدظلہٗ تو مفت میں بدنام ہیں۔ وہ بیچارے تو محض شرعی مولوی ہیں۔ اِن فلسفی مولویوں تک انکی تخیل کو کہاں رسائی۔ واقعی اس انداز بیان پر انکو رشک ہو تو عجب نہیں۔ کاش انجم کا کوئی شہاب ثاقب ٹوٹ کر . . . . !!

المختصر مولانا سے فلسفی و مجتہد صوفی سے بعد ادب خاکسار کی صرف یہی ایک گزارش اُن کے اعتراض کا جواب ہے کہ پہلے وہ اس بات پر غور کریں کہ کہیں وہ خود تو خدا نہیں ہیں (جو اسقدر ناراض ہیں) اسکے بعد "خدا کے مذہب" والے مضمون کا مطالعہ دو ایک مرتبہ پھر کریں۔

خادم · مقبول حسین احمد پوری

[illegible]

دُور رہے دُنیا کی ناگن — دھیان رہے تیرا رات اور دن
دین اور مذہب اے پریشور — ہے جنجال ترے درشن بن!

[illegible]

دل کا چور بڑا اتیائی[1] — باہر بھیتر کرے ڈھٹائی
تیری ہٹ[2] پہ پکارے وہ بھی — رام دُہائی، رام دُہائی!

---

[1] اتیائی معنی ستمگار
[2] ہٹ معنی ضد

(۲)

محب مکرم جناب مولانا ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ ۔ الناظر کا اجرائے جدید باعث مسرت ہے۔ خدا کرے کہ اس کی حیات دراز ہو ۔ اپنے وقت کا زیادہ حصہ ادبی کام میں صرف کرنے کا اعلان جو جناب کے افتتاحیہ مضمون میں کیا گیا ہے بہت کچھ امید افزا ہے ۔ اللہ تعالیٰ ارادہ میں برکت عطا فرمائے
اگرچہ بیشتر اہل قلم حضرات کے مضامین سے موجودہ نمبر خالی ہے پھر بھی جتنے مضامین چھپے ہیں گرانقدر اور انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہیں، خصوصًا جناب کا افتتاحیہ مضمون "نئی زندگی" ایک خاص شان رکھتا ہے ۔ جناب تسنیم مینائی کا مزاحیہ افسانہ "سمجھ کا پھیر" بہت خوب ہے ۔

جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب کا مضمون جس کا ماخذ غالبًا گل رعنا ہے ۔ جہاں تک تسلیم کے حالات زندگی کا تعلق ہے درست ہے ۔ لیکن افسوس کہ کلام کا انتخاب جو پیش کیا گیا ہے وہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے "نظم دل افروز" سے صرف بھرتی کے اشعار چن لیے ہیں ۔ جو شاعر پانچ پانچ دواوین کا مصنف ہو اُس کی شاعری پر صرف ایک دیوان دیکھ کر رائے قائم کرنی درست نہیں ۔ مضمون زیر بحث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انتخاب میں عجلت سے کام لیا گیا ہے ۔ کیونکہ مبالغہ کی مثال میں اُنھوں نے یہ دو شعر پیش کیے ہیں ۔

ذرہ ذرہ پس کے جسم ناتواں ہو جائیگا — کاہ کا سایہ مجھے کوہ گراں ہو جائیگا
مجھ ناتواں کی گور پہ کیوں گلفشاں ہے دوست — کوہ گراں سے کم نہیں پتی گلاب کی

لیکن انتخاب میں یہ شعر پیش کرتے ہیں ۔

گردش بخت کہاں ایسی میسر اُن کو — ساتھ کیا دیں گے مجھے لے تیرے آوارہ کا
شبنم گری تو سمجھے دیا آسماں نے غسل — خاک اُڑ کے آ پڑی تو ہمارا کفن ہوا

حالانکہ گل رعنا میں کلام کا جو نمونہ دیا گیا ہے وہ کچھ اور ہی کہتا ہے ۔ مثلاً

(۱) وطن میں تازہ وارد ہوں طبیعت گھر میں کیا بہلے — ابھی پھرتا ہے آنکھوں میں مری نقشہ بیاباں کا
(۲) وہ ہوا خواہ اسیری تھے کہ آزادی کے بعد — رو دیے ہم دیکھ کر خالی قفس صیاد کا
(۳) اے کھینک نہیں گھبراؤ نگا اے دست جنوں — اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ جو الجھ جائیگا
(۴) نالہ کھینچا ہے دل ہے خفا شوق ہوا داس — تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا
(۵) محبت میں یہ بے رحمی کہ جینا ہو گیا مشکل — خدا نا کردہ کیا ہوتا جو وہ کافر عدو ہوتا
(۶) آنسو رہے اضطراب تمنا سے دید یار — اک فرصت نگاہ میں سو بار دیکھنا

(۷) خشک گل افسردہ سبزہ، شمع چپ، بالیں کہاں | جی بھر آیا عالم گور غریباں دیکھ کر
(۸) پارسائی کیسی اے زاہد بتوں کے عشق میں | میں اسی کا شکر کرتا ہوں کہ ایماں رہ گیا
(۹) بہلٹ اس کی، رہ گئی یہ بڑی بات سب مجھے | دل چیز کیا تھا ہاتھ سے اپنے گیا گیا
(۱۰) کیا خاک سنوں ناصح مشفق تری باتیں | کہنے میں نہیں میرے طبیعت کئی دن سے

میں نے اختصار کو مد نظر رکھ کر یہ ذیل اشعار نقل کر دیے ہیں جو اپنی خوبی خود بتا رہے ہیں۔ غالب کے متعلق یہ واقعہ مشہور ہے کہ مومن خاں کے ایک شعر کے بدلے میں اپنا سارا دیوان دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ اس نقطہ نظر سے کام لیکر اگر تسلیم کے دواوین میں کچھ بھرتی کے اشعار ہیں تو انکو شمار میں لاکر دیکھنا یہ چاہیے کہ جتنے اشعار اچھے ہیں وہ کتنے اچھے ہیں۔

میں نے اوپر جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے تنہا صاحب کی تنقیص مد نظر نہیں بلکہ اظہار خیال ہے۔

عنصری

۳

مکرمی۔ سلام مسنون۔ جولائی کے الناظر میں صفحہ ۴۶ پر حضرت رضی بدایونی کی غزل کے اس شعر پر میں چونک پڑا:-

صدہا مذاق حسن سے بیگانے ہو گئے | یہ اندیا زمعنی و صورت لیے ہوے

علاوہ اس امر کے کہ مصرعہ اولی میں جس محل پر "بیگانے" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس موقع پر لفظ "بیگانہ" زیادہ فصیح و برجستہ ہوتا یہ پورا شعر اصغر گونڈوی صاحب کے اس شعر کی صدائے بازگشت ہے

صدہا تو لطف سے بھی محروم ہو گئے | یہ اندیا ز ساغر و مینا لیے ہوے!

آپ نے دیکھا، نہ صرف مرکزی خیال ایک ہے، بلکہ الفاظ بھی کم و بیش وہی ہیں اور وہی انداز بیان۔ رضی صاحب ایک خوشگو شاعر کی حیثیت سے عرصہ سے غزلیں لکھتے ہیں مگر مجھے اُن کی اس صنعت کی خبر نہ تھی۔ کیا عجیب بات ہے! آجکل کے شعرا آخر پڑھنے والوں کو اندھا کیوں سمجھتے ہیں؟ رضی صاحب کو اپنے قصور کا اعتراف کرنا ہوگا۔ والسلام

خاکسار، جلیل قدوائی

بہترین انشا پرداز

رسالہ الناظر کی طرف سے انعامی مقابلہ اس موضوع پر کرایا گیا تھا کہ آزاد و نذیر احمد، حالی و شبلی میں بہترین انشا پرداز کون تھا اور کس نے اُردو کی سب سے زیادہ خدمت کی۔ اس موضوع پر جن اہل قلم نے طبع آزمائی کی اُن سب کے مضامین کا یہ لائق دید مجموعہ ہے۔ قیمت عہر

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

"پراگندہ دل"

(از جناب مولوی اسمٰعیل احمد صاحب تسنیم بنائی بی اے ایل ایل بی)

بساطِ غم میں کسی جا خوشی نہیں ملتی   "تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی"
گلی گلی بہ کفِ گل کی پھرا ہوں بو ہو کر   "وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی"

زمین اچھی ہے نہ آسمان اچھا ہے
مکین والوں سے تو یہ مکان اچھا ہے

"مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں   سوائے خونِ جگر اب جگر میں خاک نہیں"
وجودِ باغِ ارم نہ جزِ نیک و بد تسنیم   ارم کا باغ بھی اپنی نظر میں خاک نہیں

فلک کموں کا سبب کیا ہو جب زمیں نہیں
حیات کیا ہے مجھے عقبیٰ کا بھی یقین نہیں

سمجھ میں فلسفۂ زندگی نہیں آیا   مری سمجھ میں نہیں خیر کیا کہیں آیا
حیاتِ دہر کے سب رنج بے سکوں دیکھے   اسے سمجھ میں نہ آنا تھا یہ نہیں آیا

عجیب مسئلہ ہے جس میں جائے غور نہیں
خدا کو مان لیں بس چارہ کوئی اور نہیں

جدھر بھی اٹھتی ہے نظر ادھر دو رنگی ہے   بغور دیکھیے تو دو متوں میں تنگی ہے
ذرا سی فکر میں کھل جاتا ہے یہ شیرازہ   سمجھ کا جامہ پھٹا نہ تو خلق ننگی ہے

تغیرات مسلسل سے سب وجود ہے یہ
اگر نہ غور سے دیکھو تو بے نمود ہے یہ

دوامِ کلفتِ خاطر بھی عیشِ دنیا ہے   اور عیش بن چمنِ زندگی بھی صحرا ہے
خوشی گناہ بھی ہے رازِ زندگانی بھی   غرض کہ عالمِ امکاں عجب تماشا ہے

یہ آدمی نہ تو خلوت نہ انجمن میں رہے
تمہیں بتاؤ کہ پھر کون سے چمن میں رہے

بہارِ باغ کی آرائشیں نہ دیکھ سکیں   جبینِ حسن کی زیبائشیں نہ دیکھ سکیں

...تاں کہ قدرتِ صانع کو ادر تو دیکھیں — ہم اپنے قلب کی گنجائشیں نہ دیکھ سکیں

اُنھیں فلک بھی سمجھ لیں اُنھیں زمیں جانیں
نہ جانے کوئی تو انسان ہی نہیں جانے

...ب خاص کے پردوں کی باتیں راز میں بھی — گرو ہی ہیں کہ دنیا کے سوز و ساز میں بھی
ستم ہے وسعتِ رنگینیِ فریبِ خیال — جبینِ عجز میں بھی اور حریمِ ناز میں بھی

پلک کے غنچہ تو تبلائے ہم کو حال ترا
ہمیں وہ ہیں کہ نہ دیکھیں کبھی جمال ترا

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش — وفورِ بادہ سے مستِ شراب ہیں میکش
تو ہی تو ساقی ہے تو نے انھیں پلائے جام — تری ہی نظروں میں خانہ خراب ہیں میکش

یہ کیا طلسم ہے کیا شعبدہ ہے ہستی کا
ہمیں پلائی بھی اور ہم پہ جرم مستی کا

حیاتِ دہر کے بدلے ہے وعدۂ جنت — ستم یہ ہے کہ نہ دنیا سے ہو سکے الفت
اُٹھائے کس طرح دل لطفِ جلوۂ معنی — جب آنکھ کو نہ میسر ہو دید کی طاقت

ستم ظریفیاں مذہب سے منہ کو موڑ نہ دیں
مجھے یہ ڈر ہے کہ ایمان لوگ چھوڑ نہ دیں

رہے نہ دامنِ انساں پہ داغ عصیاں کا — گناہوں سے بھی مرکب خمیر انساں کا
اُسے بھی ناز رہے اپنی بے گناہی پر — تجھے بھی لطف ملے بخششِ نمایاں کا

بڑھا کے ذوقِ گنہ جوششِ کرم نے کیا
ہمیں زمانے میں رسوا ترے ستم نے کیا

گلوں کو حسن دیا وہ کہ قلب ہو بیکار — ہزار جان سے ہو عارضِ چمن پہ نثار
اسی کے ساتھ گلوں کو یہ چال سکھلائی — بجا ہے گر نہ سنیں نالہائے بلبلِ زار

عجیب تیرے تغافل کی شان ہوتی ہے
ترا تو کھیل ہے یاں ختم جان ہوتی ہے

جو نیک ہیں وہی رسوا ہوئے ذلیل رہے — ہمیشہ آگ میں جلتے ترے خلیل رہے
ہے جائے شکوہ کہ پیاسے رہے تو آلِ رسول — لعینوں کے لیے دریاؤں کی سبیل رہے

حسینؓ ابن علیؓ کو تو یوں اجل آئے
تری جبیں پہ نہ ابرو پہ ایک بل آئے

نہ دیکھ لے کہیں دل بزم عشرتِ دنیا　　ہمیں نہ بھائے کبھی کیفِ لذتِ دنیا
بنا دیا ہمیں نیرنگ صحبتِ دنیا　　کسی سے ملے بھی نہیں رنج بھی خوشی بھی ہی

غضب تو یہ ہے محبت سے کام ہوتا ہے
بُرا کہیں بھی ہو بندوں کا نام ہوتا ہے

نظر سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے　　ہمیں بھی کہنے کو ذوقِ نظر ہے کیا کہیے
کہ بن کے ہی ہمیں سب خبر ہے کیا سکھیے"　　یہ کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب

زباں دہن میں ہے جب تک تو بدگماں نہیں
گمانِ بد کا کھلا راز تو زباں نہیں

یہی ہے دہر تو جینے کا کچھ حساب نہیں　　ہمیں اجل سے بھی امیدِ انقلاب نہیں
حجاب ناز یہی ہے کہ کچھ حجاب نہیں　　کسی سے اُٹھ نہ سکیں پڑے ایسے چھوڑ ہیں

خرام ناز نے تھوڑی قیامتیں کی ہیں
جنوں نے عقل نے لاکھوں ملامتیں کی ہیں

گنہ سے بچنے ہی والے گناہگار ہوئے　　جنوں نے عجز کیا تھا وہ شرمسار ہوئے
جو خاکسار رہے وہ اور خاکسار ہوئے　　ستم تو یہ ہے تکبر تو برقرار رہا

کوئی نہیں ہے کہ پرساں ہو پائمالوں کا
عجیب حال دگرگوں ہے باکمالوں کا

ہمیں دیا ہے جو یہ عز و جاہ کیا کہنا　　تیرے تلطف و رحمت کا واہ کیا کہنا
فلک پہ انجم و خورشید و ماہ کیا کہنا　　زمیں پہ لالہ و گل کی بہار کیا اچھی

مگر فریب تماشا ملال کرتا ہے
یہ لازوال نہ ہونا کمال کرتا ہے

بھرے نہ ہوں اگر آنسو نگاہیں تیز نہ ہوں　　بغیر غم کے اسرار جلوہ ریز نہ ہوں
نہ ہو جو سوز تو نغمے بھی قلب خیز نہ ہوں　　کمندِ غم کی رسائی کی وسعتیں دیکھو

وفا نہیں نہ سہی شیوۂ جفا تو سہی

ترا اصول ستم ہی سہی بتا تو سہی

جو نیک طبع ہیں عالم میں ہیں وہ سرگرداں ہمیشہ رہتے ہیں گدڑی ہی میں گُھسے پنہاں
کبھی نہ ان میں سر رشتۂ وفا کا خیال یہی تو سب ہیں جو ہیں قاتلِ ایماں

انہیں اداؤں نے سب فلسفہ تمام کیا
ترے ستم نے زمانے میں خوب نام کیا

رکھی ہے حشر پہ موقوف داستاں میری بھلا نہ کس لیے باطن ہو پھر فغاں میری
ہزار بار کہے پر نہ جب کھلے عقدے کھلے نہ کس لیے پھر نالوں پر زباں میری

ذرا بھی قدر نہیں ہے مرے سوالوں کی
یہ چھیڑ ہے کہ سنے جاؤں کہنے والوں کی

ملا نہ لیلیٰ کو مجنوں نہ شیریں کو فرہاد یوں ہی بس انکی تمنائیں ہو گئیں برباد
ستم تو یہ ہے شکایت کو گر زباں کھولیں تو حکم ہوتا ہے جائز تمھیں نہیں فریاد

بیاں زبان سے حالِ تباہ بھی نہ کریں
اُٹھے جو درد جگر میں تو آہ بھی نہ کریں

ترے ستم کی حقیقت تجھی سے پوچھتے ہیں گماں نہ کر کہ یہ سب کچھ ہنسی سے پوچھتے ہیں
ذرا بھی دخل نہیں اس میں ناگواری کو جو کچھ بھی پوچھتے ہیں ہم خوشی سے پوچھتے ہیں

دلوں کو روح کی گہرائیوں کا ساز بنا
ترا جو راز ہے اُسکو ہمارا راز بنا

اصلاحِ سخن

منشی عبد العلی شوق سندیلوی نے اپنی چند غزلیات سند شعرائے نامدار کے پاس بغرض اصلاح بھیجیں اور اُن سب اصلاحوں کا مجموعہ مع شعراء کے خطوط کے شائع کیا ہے۔ کتاب کے شروع میں نیاز فتحپوری کی تقریب، مولانا شرر کا دیباچہ اور مسٹر سلطان حیدر جوش کا مقدمہ درج ہے۔ اور آخر میں ڈاکٹر عبد الستار صدیقی و منشی امیر احمد علوی کے تبصرے۔ غرضکہ سارا مجموعہ بہترین ادبی دلچسپیوں کا مرقع ہے۔ قیمت ۸؍

مراٰۃ الشعر

شعر کی حقیقت و ماہیت اسکے اقسام اسکے اجزائے ترکیبی اسکے علوم معانی و بیان وغیرہ اور اسکے محاسن و معائب پر اردو میں اسی قسم کی پہلی و بے مثال بلند کتاب۔ از پروفیسر عبد الرحمن۔ قیمت ۲؍

منیجر الناظر بکڈپو لکھنؤ

قطعۂ تاریخ

وفات حسرت آیات خیام العصر حضرت ریاضؔ خیرآبادی مرحوم

(طبعزاد جناب مولوی محمد عبد الشاہد خاں صاحب شاہدؔ شروانی ناظم انجمن اشاعت الدین مظہر العلوم مدرسۂ عربیہ نیازیہ خیرآباد (اودھ))

نہ کیوں حشر ہو آج شاہد بپا — شہنشاہِ ملکِ سخن اُٹھ گیا
ہُوا راہیِ خُلد سحبانِ ہند — زمانے کو جس پر بجا ناز تھا
اُٹھا آج دنیا سے خیامِ عصر — ہوا دَور سے ختم، وا حسرتا
نہ ساقی رہا اب نہ بادہ پرست — نہ پیالا سا وہ میکدہ، میکدا
صد افسوس ہم سے چھنی ایسی ذات — زمانہ جسے مدتوں روئے گا
تھی ذاتِ ریاضؔ آپ اپنی نظیر — نہ تھا اُس کا ہمسر کوئی دوسرا
ہوا خیرآباد ویران آہ — نہ اب اہلِ فن کوئی باقی رہا
ریاضؔ اک نہ ہونے سے آج آپ کے — ہے دُنیا کا نقشہ ہی بدلا ہوا
زباں داں سخن سنج شیریں بیاں — نہ تھا ہند میں کوئی بھی آپ سا
ہوا بند بابِ ریاضِ ادب — نہیں کوئی اب جانشیں آپ کا
جہانِ سخن میں ہے کس کو نصیب — وہ فکرِ بلند اور طبعِ رسا
سخنگو ہیں دنیا میں لاکھوں مگر — کسی کو ملی آپ کی کب ہوا
تھے جب فخرِ اُستاد شاگردِ آپ — بڑھے مرتبہ کیوں نہ اُستاد کا
حقیقت میں تھے جانشینِ امیرؔ — نہ تھا ماہرِ فن کوئی آپ سا
چھپے آپ بن کر جو ماہِ سخن — ہیں بے نور "ضو۔ نجم۔ انجم۔ ضیا"
جنابِ نیازؔ و رئیسؔ و عقیلؔ — شب و روز کرتے ہیں آہ و بکا

---

۱ حضرت ریاضؔ کے پوتوں کے عرفی نام۔

۲ برادرِ حضرت ریاضؔ مرحوم۔

۳ نبیرۂ حضرت نیازؔ برادر حضرت ریاضؔ جو خلافت اخبار بمبئی کے ایڈیٹر ہیں۔

۴ نبیرۂ ثانی حضرت نیازؔ۔

شاگرد اثیمؔ و شمیمؔ و سلیمؔ | اسی غم میں ہیں وقارؔ بھی مبتلا
ہیں واقفؔ و معروفؔ و عالمؔ | کدھر اُدھر غم سے ہے بلبل فضاؔ
ہے وحیدؔ غم ہجر عارفؔ کامل | نثارؔ آپ پر تھے جو صبح و مسا
و خستہ جگر شاہدؔ دلفگار | ہے کس حال میں دیکھیے تو ذرا
زباں پہ ہے ذکر آپ کا ہر گھڑی | یہی اب ہے دن رات کا مشغلا
سبھی فکر میں تھے ایسی تاریخ ہو | کہ جس میں نہ ہو تعمیہ تخرجا
پریشان تھا شاہدؔ خستہ حال | یکایک فلک سے یہ آئی صدا

لکھو سال فوتِ جناب ریاضؔ
چراغ ادب ہند کا گل ہوا
سنہ ۱۳۵۳ھ

؎ صاحبزادگان آغائے حسن حضرت وسیمؔ خیرآبادی مرحوم برادر حضرت ریاضؔ مرحوم۔
؎ حکیم سید انوار حسین صاحب خیرآبادی شاگرد حضرت ریاضؔ مرحوم
؎ جہاں شاہ صاحب شاگرد حضرت ریاضؔ مرحوم
؎ سلطان احمد صاحب واقفؔ سیوانی شاگرد حضرت ریاضؔ مرحوم
؎ سید ولی محمد صاحب فضاؔ جالندھری شاگرد حضرت ریاضؔ مرحوم
؎ جناب مولوی نثار احمد صاحب فاروقی عارفؔ رئیس خیرآباد

نویدِ حیات

خبرِ رشک عید آتی ہے | زندگی کی نوید آتی ہے
حسنِ تجویزِ جشن ہے درپیش | جائے گفت و شنید آتی ہے
سامنے دل کے راہِ مہر و وفا | پھر برسمِ جدید آتی ہے
پھر چمکنے لگے ہیں داغِ جگر | پھر ضیائے امید آتی ہے
شامِ فرقت ہے چاند نکلا ہے | شبِ جشن مزید آتی ہے
پھر پسِ پردۂ شبِ تاباں | صبح روزِ سعید آتی ہے
بصد انداز و ناز و شرم و حجاب | کیا دلھن بن کے عید آتی ہے

[illegible]

نغمۂ سرخوش گزشتے

ہندوستانی اکیڈمی کے "تماہی" رسالہ ہندستانی کے جولائی نمبر میں مولوی محمد احسن صاحب بلگرامی ایل ٹی (علیگ) کا ایک مضمون شایع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "اردو کا پہلا رسالہ" - اس مضمون میں صاحب ممدوح نے پہلے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آیا "خیرخواہ ہند" اردو کا پہلا رسالہ تھا یا اس سے قبل کوئی اور رسالہ بھی جاری ہو چکا تھا :

پھر گارساں دتاسی کے ایک خطبہ اور انعام الحق حقی دہلوی بی اے کے ایک مضمون مطبوعۂ مخزن کو اپنے خیال کی تائید میں پیش کرکے یہ رائے بطور قول فیصل ظاہر فرمائی ہے کہ

> "اردو کا پہلا ماہانہ رسالہ پروفیسر رام چندر نے مولوی محمد باقر کے مکان سے شایع کیا . . . . .
> اس رسالہ کا پہلا نام "خیرخواہِ ہند" تھا - پھر اس کا نام بدل کر "محبِ ہند" رکھا گیا - پہلی جلد اس رسالہ کی ماہ ستمبر ۱۸۴۷ء کی تھی"

لکھنؤ میں ایک صاحب اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف نقوی گزرے ہیں جو مطبع اختری اور اخبار اختر ہند کے مالک تھے اور اپنے زمانہ کی ایک "انجمن علمی" کے آنریری سکریٹری بھی - انھوں نے "اختر شاہنشاہی" کے نام سے تقریباً تین سو صفحے کی ایک کتاب تصنیف کرکے جون ۱۸۸۸ء میں اپنے مطبع میں طبع کی تھی - اس کتاب کا دوسرا نام ہے "سوانحمری اخبارات" - مصنف کی محنت و جانفشانی قابل داد ہے کہ ان کو ہندوستان بھر کے جس قدر مطابع، اخبارات و رسائل کا حال معلوم ہو سکا سب کو بلحاظ حروف تہجی اس کتاب میں درج کر دیا -

یہ کتاب کسی نہج سے بھی مکمل نہیں کہی جا سکتی - چنانچہ مولانا عبد الحلیم شرر، اڈیٹر دلگداز کی جو تقریظ اسکے آخر میں درج ہے اس میں ہے کہ

> "مصنف صاحب کی میں اسی قدر داد دیتا ہوں کہ نہایت عمدہ اور بالکل اچھوتا خیال انکے دل میں پیدا ہوا جسنے ان سے یہ کتاب تصنیف کرائی - اگرچہ اس تصنیف پر مجھے افسوس بھی ہے - میرے نزدیک یہ بیا مرہ خیال حضرت اختر کے ہاتھ لگا تھا اُنکے مناسب اُنھوں نے اسکی قدر نہ کی - میں خیال کرتا ہوں کہ مطبع (کی) ناقدری یا بیدستے کی بدولت جو انھوں نے اس کتاب کو [illegible] مکمل نہ ہونے دیا"

نقوشِ [illegible] گزرے

[illegible] کہ ماسٹر رام چندر کے رسالہ خیرخواہ ہند مجریہ ستمبر ۱۸۴۲ء سے قبل اسی نام
[illegible] کے دو مقامات سے شائع ہو چکے تھے۔

(۱) [illegible] سے ۲۰ ورق کا ایک ماہواری رسالہ ۱۸۳۶ء میں نکلا جسکے مالک پادری [illegible]
تھے اور جو بیپٹسٹ مشن پریس کلکتہ میں لوہے کے حروف یعنی ٹائپ میں چھپتا تھا۔ سالانہ چندہ [illegible] تھا۔

(۲) مرزاپور سے ۲۰ ورق کا ایک ماہوار رسالہ کم اگست ۱۸۳۷ء کو جاری ہوا۔ جسکے مالک پادری
[illegible] ایڈیٹر صاحب تھے۔ یہ آرفن پریس مرزاپور میں چھپتا تھا سالانہ چندہ [illegible] تھا۔
خیرخواہ ہند کے نام سے صرف یہی دو رسالے اس کتاب میں مذکور ہیں اور "خیرخواہ ہند" کا اس میں کوئی
ذکر نہیں ہے غالباً ماسٹر رام چندر کا رسالہ مصنف کے علم میں نہیں آیا۔ اس لیے بے محل نہ ہوگا اگر یہ توقع
کی جائے کہ تلاش سے ۱۸۳۶ء سے بھی قبل کے بعض رسائل کا پتہ چل جائیگا۔

دہلی اور صوبۂ متحدہ میں انگریزی تسلط ۱۸۰۳ء کو ہوا ہے۔ مدراس، بمبئی اور کلکتہ میں بہت پیشتر سے تھا
اس لیے مطابع، اخبارات و رسائل کی ابتدا کرنے کا شرف بھی انھی مقامات میں سے کسی کو حاصل ہوگا
فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی بدولت گمان غالب ہے کہ کلکتہ نے اس راہ میں بھی پیشقدمی کی ہو
وہاں کے قدیم کتب خانوں کی چھان بین کرنا چاہیے۔

انجمن ترقی اردو جب قائم ہوئی ہے تو مولانا شبلی اسکے سکرٹری مقرر ہوئے تھے اور انکی تحریک پر مولوی سجاد مرزا
بیگ دہلوی نے اردو کتابوں کی ایک فہرست ترتیب دی تھی جو ۱۹۲۳ء میں الفہرست کے نام سے شائع
ہوئی۔ یہ کتاب اصل ناقص و ناتمام ہے مکررات کو خارج کر دیا جائے تو اس میں ۷-۸ ہزار سے زائد
کتابیں نہ نکلیں گی۔ پھر کتابوں کے متعلق ضروری تفصیلات کے جو خانے رکھے گئے ہیں اُن کی خانہ پری
بھی ٹھیک طور سے نہیں ہو سکی۔ اور کہیں کہیں ترتیب میں بھی غلطی ہے۔ حالانکہ اردو کتابوں کی تعداد
پچاس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ چند سال ہوئے اس صوبہ کا ایک پرانا کتب خانہ دیکھنے کا موقع ملا تو صرف
اس ایک کتب خانہ میں دو ہزار سے اوپر ایسی کتابیں موجود تھیں جو بازار میں فروخت نہیں ہوتیں۔ اور
بازار میں فروخت ہونے والی کتابوں کی تعداد تو یقیناً چالیس ہزار سے کم نہیں ہے۔
ضرورت اس کی ہے کہ یہ فہرست از سر نو مدون کی جائے۔ اس قسم کے کام انفرادی طور پر انجام پانے
[illegible] ہیں بلکہ کوئی ادارہ اس کام کو اپنے اہتمام اور نگرانی میں کرا لے تو بڑی حد تک مکمل اور با معلومات

فہرست ترتیب دی جا سکتی ہے۔ جس کے مطالعے سے بیک نگاہ معلوم ہو جائے گا کہ اُردو زبان میں ہر قسم کا کتنا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔

= جو کچھ لکھا گیا اس کی ضرورت یوں لاحق ہوئی کہ بہت سے بہی خواہانِ اُردو غالباً ناواقفیت کی بنا پر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اُردو زبان میں شعر و سخن یا قصے کہانی کے سوا جو کچھ سنجیدہ کام ہوا ہے وہ سب زمانۂ حال کا رہینِ منت ہے۔ پچیس تیس سال قبل اُردو کا دامن علوم و فنون سے خالی تھا۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو جیسے بزرگ نے رسالہ ہندستانی بابت جولائی میں تحریر فرمایا کہ

"پچیس تیس برس پیشتر تک جب کوئی شخص اُردو کا تذکرہ کرتا تھا تو اُس سے مراد زیادہ تر اُردو شاعری ہوتی تھی لیکن ان پچیس برس میں شاعری کے علاوہ ادبیات میں بھی اُردو نے خاصی ترقی ہوئی ہے اب کچھ کتابیں تاریخ یا فلسفہ یا اور مضامین پر اُردو میں لکھی گئی ہیں اور انکو پڑھ کر اُردو کی وسعت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔"

حالانکہ اگر الفہرست ہی جیسی نامکمل و ناقص کتاب کی ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان چند علوم کے سوا جو خود یورپ میں بھی حال ہی میں مدون ہوئے ہیں اکثر و بیشتر علوم مروجہ کی کتابیں اس صدی کے شروع ہونے سے پیشتر ہی اُردو میں لکھی جا چکی تھیں۔

یہ غلط فہمی زیادہ تر اس سبب سے پیدا ہوئی کہ ایک طرف نئی نسل کے لوگوں کو زبانِ انگریزی کی تحصیل میں انہماک کی وجہ سے اپنی مادری زبان کے مطالعہ کی مہلت نہ ملی اور دوسری طرف ملک میں ایسے کتب خانے مفقود تھے جہاں اُردو کتابوں کا معقول ذخیرہ جمع ہو اور لوگ بے تکلف اُن سے مستفید ہو سکیں۔

اب بھی سارے ملک میں کوئی ایک مرکزی کتب خانہ ایسا نہیں جہاں اُردو کی تمام مطبوعہ کتابیں مل سکیں۔ اور شاید بہت سی کتابوں کا تو اب فراہم ہونا بھی مشکل ہے۔ گو ناممکن نہیں۔ اس کے مقابلہ میں فہرست کی تدوین نسبتاً آسان ہے۔ بشرطیکہ اس کی اہمیت کا احساس ہو جائے اور ضروری سرمایہ اور کارکن فراہم کر لیے جائیں۔

مولوی عزیز مرزا مرحوم (خدا اُن کو غریقِ رحمت کرے) جب لکھنؤ میں تھے تو اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہندوؤں کو اُردو سے جو بے تعلقی ہوتی جاتی ہے اُس کو رفع کرنے کے لیے اُردو کا وہ نام جو انگریزوں نے رکھا ہے یعنی "ہندوستانی" کلمۃً استعمال کیا جائے۔ معارف کے اگست نمبر سے معلوم ہوا کہ علامہ

نقد سخن گو[illegible]

[illegible] ہندی ہے
حال ہی میں [illegible] ایک کی تھی کہ آئندہ زبان اُردو کے غیر معروف لیکن صحیح نام ہندوستانی کو فروغ
[illegible] اس نام سے اس کے عام ملکی زبان ہونے کا دعویٰ ظاہر و ثابت ہو
[illegible] اس سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے کہ
[illegible] دل کے بہلانے کے لیے بہت سے وغیرہ اختیار کیا ہے کہ جب اُردو اور ہندی کا تذکرہ ہو تب
تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں زبانیں ایک ہی ہیں اور ہم کو بجائے اُردو اور ہندی کے لفظ ہندوستانی
استعمال کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ چالیس پچاس برس پیشتر اس لفظ ہندوستانی کا استعمال جائز ہوتا
لیکن اس وقت تو میرے خیال میں اس لفظ کے استعمال سے یا تو اپنے دل کو بہلانا مقصود ہے یا
ایک دوسرے کو دھوکا دینا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اُردو اور ہندی دو مختلف زبانیں بنتی
چلی جا رہی ہیں۔ اُردو کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اُردو میں فارسی و عربی کے غیر مانوس
الفاظ کی بھرمار کر دیں۔ اسی طرح ہندی کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ ہندی میں بھی
غیر مروج اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ بھر دیے جائیں۔ بس ہر سے لیے یہ مان لینا غیر ممکن ہے
کہ ایسی اُردو یا ایسی ہندی کو ہم ہندوستانی کا لقب دے سکتے ہیں۔" (ہندوستانی۔ بابت جولائی)

ڈاکٹر سپرو کی یہ رائے کہ اُردو اور ہندی دو مختلف زبانیں بنتی چلی جا رہی ہیں بظاہر اس خیال پر مبنی ہے کہ
کہ اُن کے نزدیک کوئی زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب اُردو اور ہندی بالکل ایک تھیں حالانکہ اُردو نام ہی
اُس زبان کا رکھا گیا جو ہندی اور فارسی کے امتزاج سے پیدا ہوئی۔ اور اس بنا پر یہ کہنا درست ہوگا کہ
کہ شروع ہی سے ہندی اور اُردو الگ الگ زبانیں تھیں۔ بے شبہ ابتدا میں اساتذۂ قدیم نے اُردو کو
عرصے تک ہندی کے نام سے یاد کیا مگر جس اُردو کو وہ ہندی کہتے تھے اُس میں اور زمانۂ حال کی اُردو
میں بعض الفاظ کے ترک و اختیار کے سوا فرق ہی کیا ہے۔ عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ کا داخلہ بھی
کچھ آج کل کے ادیبوں کی جدت نہیں۔ اردو نظم و نثر کی پرانی کتابوں میں بھی ایسے بہت سے الفاظ
ملیں گے جو ٹھیٹ ہندی دانوں کے فہم سے بالاتر ہیں۔ منشی رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب یا پنڈت
دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم کو ایسے ہندی داں جو فارسی سے ناآشنا ہوں ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔

اصل یہ ہے کہ ہندوستان ایک براعظم ہے اور جس طرح ایک خطہ کو چھوڑ کر بقیہ کل یورپ میں باوجود
[illegible] ایک [illegible] کے مثل [illegible] کے اختلافات نہیں مٹ سکے اسی طرح اس کی توقع کرنا فضول ہے
[illegible] ہندوستان سے [illegible] ہو جائے گی۔ [illegible] اُردو کو اس سبب [illegible]

[illegible] کہ اب اُس کی [illegible]

[illegible] وہ کسی [illegible] ہے۔ اور اگر ان [illegible]

[illegible] الفاظ کی تعداد کا کوئی دوسری ہندوستانی زبان مقابلہ نہیں کرسکتی ۔۔۔۔۔۔

[illegible] خیال ادا کرنے کی جو قوت اور قدرت ہے کسی دوسری زبان کو یہ [illegible]

نہیں حاصل ہے ۔۔۔۔۔۔

اُردو زبان میں قدر جاذب الفاظ اور جاذبِ خیال ہے دوسری زبان میں ۔۔۔۔۔۔۔

لطافت اور شیرینی جو اُردو زبان میں ہے دنیا کی کسی زبان کو نصیب نہیں" ۔۔۔۔۔۔۔

(معلومات ۔ اپٹ گست)

[illegible] بعید نہیں کہ اُردو ایک دن اس عالم میں وہی قدر و منزلت نہ حاصل کرلے جو فرانسیسی زبان کو یورپ میں حاصل ہوئی۔

لیکن اُردو کی ترقی و توسیع یا اُسے دلکش و نافع بنانے کے لیے محض لفاظی، اشتہار بازی اور الجمن آرائی سے کام نہ چلے گا۔ خصوصاً ایسے تماشوں سے جیسا کہ چند ماہ ہوئے دہلی میں خواجہ حسن نظامی نے دکھایا۔ کسی نفع کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ اس سے خواہ مخواہ ہندو مسلمانوں کے تفرقہ میں اضافہ ہوتا اور حامیانِ ہندی کے دلوں میں اُردو سے نفرت بڑھتی ہے۔

ٹھوس علمی کاموں کی اہلیت اگر ہم سے سلب ہوگئی ہے تو کیا اتنا بھی نہیں ہوسکتا کہ اُردو میں ترقی کی جو فطری صلاحیتیں موجود ہیں اُن کا نشو و نما ہونے دیں اور اپنی نادانیوں سے مزاحمتوں اور مخالفتوں کو دعوت دے کر قدرتی مواقع کو ضائع نہ کریں۔

بحمد اللہ کہ الناظر کے لیے فراہمی مضامین کی کوششیں بارآور ہو رہی ہیں۔ چنانچہ اس دفعہ چند صفحے بڑھائے گئے ہیں۔ اور غالباً آیندہ نمبر سے ۸ صفحے زیادہ کیے جائیں گے۔ جنوری ۱۹۳۵ء سے ماہانہ [illegible] رسالہ کا حجم ۶۴ صفحے کردیا جائے گا۔

الناظر جب ۱۹۳۳ء میں بند کیا گیا تھا تو جن خریداروں کا چندہ باقی تھا اُن کا حساب بناکر [illegible] گیا تھا اور ان تمام خریداروں کی رقم ادا کردی گئی جنھوں نے نقد یا ٹکٹوں کی صورت میں [illegible]

[illegible] صاحب ایسے تھے جنھوں نے اپنی رقم [illegible]

[illegible]

[illegible] ہو!

...ں ہے کہ آپ کا چہرہ چھائیوں اور سیاہی سے بدشکل ہو گیا ہے

پری جمال صابن (رجسٹرڈ)

...ال کریں یہ حسن کی کان اور خوبصورتی کا مخزن ہے۔ چہرے
...تمام میل اور چھائیاں مہاسے دور کر کے چہرے کو
...گلاب کی پتی کی مانند سرخ و سپید اور ریشم کی طرح ملائم
...تا ہے۔ طبی اصول سے تیار ہوتا ہے۔ مرد اس کے
...لق، لڑکے اس کے متوالے اور لڑکیاں اس کی فدائی ہیں
...بکس میں ٹکیہ ہے ایک صابن دانی ایک روپیہ عہ؍

زنانہ سنگھار بکس (رجسٹرڈ)

یہ بکس عورتوں کی زینت بڑھانے اور بناؤ سنگھار کے لیے تیار
کیا گیا ہے۔ اس دسل کے خوشنما بکس میں آئینہ بھی لگا ہے۔
اس میں پانچ چیزیں اور انعام ہے (۱) پری جمال صابن ایک
ٹکیہ (۲) پری بہار آگل شیشی ۲ تولہ (۳) پان کی بہار ایک ڈبیہ
(۴) خوشبودار مسی ایک تولہ (۵) بال صفا صابن ایک ڈبیہ
اور ۶ ماشہ سرمہ نور نظر مفت۔ فی بکس ایک روپیہ

پیرس پوڈر

یہ کتنا مغنیس کریم گالوں کی سرخی یہ تینوں چیزیں عورتوں کی
خوبصورتی اور حسن کو قائم اور خوب نکھار کر مثل حور کے بنا دیتی ہیں
سنیس کریم صبح لگاؤ چہرہ ملائم ہو گا۔ پیرس پوڈر پھول سے
چہرے پر لگانے سے چہرہ چاند سا ہو جائے گا اور گالوں
کی سرخی گالوں پر ایسی بہار دیتی ہے کہ مزہ
آجاتا ہے۔ فی سٹ ایک روپیہ پتہ

حکیم محمد یعقوب خاں مالک دواخانہ نورتن محلہ فراشخانہ

دماغی ہیر آئل

یہ خوشبودار روغن یونانی دواؤں سے تیار کیا ہوا بالوں کو
بڑھاتا ہے۔ جڑیں اگر کمزور ہو گئی ہوں اور بال گرتے ہوں یا
سفید ہونے شروع ہو گئے ہوں۔ آنکھوں کی روشنی میں کمی ہو۔
سر میں درد رہتا ہو تو اس کا استعمال کیجیے۔ دماغی کام کرنے
والوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا ہے فی شیشی ۱۲؍
فی سیر چھ روپیہ

خضاب مازو

خضاب مازو بہت مشہور و معروف ہے مگر ہم نے اس کو ایسی ترکیب
دی ہے کہ ممکن نہیں ایک مرتبہ لگائیے اور دو بار دیکھے لیے دو پا
گر رویہ وہ نبالے۔ قیمت فی سیر پانچ روپیہ عہ؍

ترکیب استعمال: ہے کہ آملہ خطمی بھگو دیجیے اگر جلدی ہو تو جوش دے کر اسکے پانی میں گاڑھا گاڑھا
حاجت اسپر وغیرہ کی نہیں ہے کسی قسم کا پتہ رکھ کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ
تک بندش رہے بعد خشک ہونے کے کھول ڈالیے۔ کھلی خواہ بیسن
سے دھو کر کسی قدر خوشبودار روغن لگا دیجیے بال ملائم مثل ریشم
اصلی رنگ کے ہو جائیں گے کوئی داغ دھبہ یا سیاہی جلد پر
نہ آئیگی۔

حسن افزا

نہایت اعلیٰ درجہ کا ابٹنہ ہے جس کی خوبی صرف ایک ہفتہ
لگانے سے معلوم ہو جائے گی۔ رنگ کو صاف کرتا ہے،
حسن کو نکھارتا ہے مہاسوں کا دشمن ہے۔ صابن یا بیسن
کے بجائے اس سے منہ دھونا چاہیے۔ قیمت فی سیر للعہ پتہ

منیجر کارخانہ کاظم علی نمبر ۵۳ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

نمبر ۴ | اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء | جلد ۲۸

فہرست

قیمت فی پرچہ (ادارات ایڈیشن : صرف عہ سالانہ) ایک روپیہ

تصانیف قاضی محمد سلیمان منصورپوری

اصحاب بدر۔ اسلام کی سب سے پہلی لڑائی یعنی جنگ بدر کا نقشہ مصنف رحمۃ للعالمین کے قلم سے۔ اور ساتھ ہی اُن ۳۱۳ اصحاب رسول کے حالات جو اس جنگ میں شریک تھے اور جن کے وسیلے دعا قبول ہوتی ہے۔ قیمت ؏

تاریخ المشاہیر

امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام حنبل، امام ابو یوسف، امام رازی، امام غزالی اور حضرت غوث الاعظم وغیرہ پچاس بزرگوں کی سوانحعمریاں قیمت ؏

رہبر کامل

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مختصر سوانح عمری میں دکھایا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے کس کس شعبہ میں حضور نے ہماری رہنمائی فرمائی۔ از مولانا عبد المجید صاحب خادم ایڈیٹر مسلمان قیمت ۱۲ار

سفر سعادت

ادیب شہیر فاضل لبیر احمد صاحب علوی بی اے کا روزنامچہ [illegible]

تنظیم الحیات

لکھنؤ کے مشہور شاعر مولانا صفی نے کئی سال ہوئے انگریزی کی مشہور اخلاقی کتاب اکانومی آف ہیومن لائف کا ترجمہ نظم میں کیا تھا اور ہندوستانی اکیڈمی نے اس پر پانچ سو روپیہ کا انعام بھی مصنف کو دیا تھا۔ مگر اتفاقی اسباب کی بنا پر کتاب پوری طرح مشتہر نہ ہو سکی اور ہمارے ذخیرہ میں حال ہی میں شامل ہوئی ہے۔

نوجوانوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اور ادبی کتابوں کے شائقین کے لیے تو یہ کتاب بہترین تحفہ ہے۔ قیمت قسم اول مجلد ؏ قسم دوم غیر مجلد عار

شرح اسماء الحسنیٰ

مصنف کی آخری تصنیف۔ جس میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ ناموں کی تشریح و تفصیل علمی، لغوی اور تاریخی حیثیت سے اور اسماء الٰہی کے خواص اثرات صوفیانہ طرز پر بیان ہوئے ہیں۔ قیمت عار

عشرہ مبشرہ

جن دس جلیل القدر اصحاب رسول کو زندگی ہی میں نجات اخروی کا پروانہ مل گیا اُن کی سوانحعمریاں اس مجموعہ میں یکجا درج ہیں۔ قیمت ۱۲ار

حیات حافظ رحمت خاں

روہیلکھنڈ کے مشہور حکمراں حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی یہ مفصل سوانحعمری سید الطاف علی بی اے بریلوی نے بڑی محنت سے مرتب کی اور [illegible]

سلطنتِ داؤد

(از جناب الحاج منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے ڈپٹی کلکٹر)
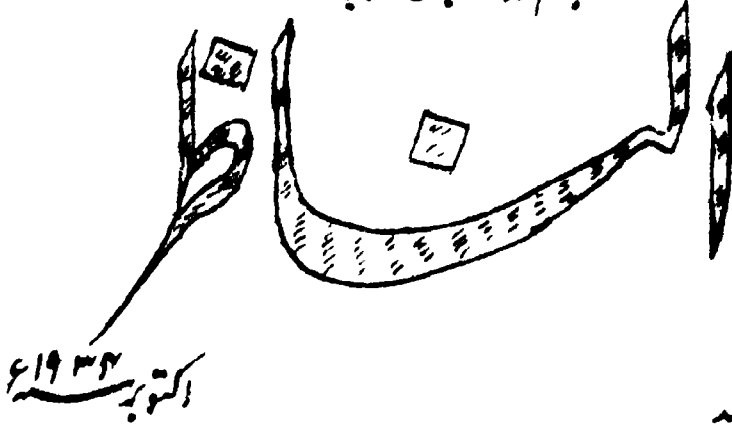
عہد صولتِ داؤدی بنی اسرائیل کے شباب کا نقطۂ کمال تھا۔ اندرونی سازشوں کو فرو کرنے، خانہ جنگیوں سے فراغت پانے کے بعد، یروشلم کے پاک شہر میں دارالسلطنت بنایا گیا۔ ہمسایہ حکومتیں مغلوب کی گئیں۔ عمالقہ۔ بنی عمون۔ آرامی۔ اور فلستیوں کی قوت توڑ دی گئی۔ اور دمشق کو فلسطین کا باجگزار بنا کر فرزندان یعقوب کا رقبۂ حکومت لبنان کی پہاڑیوں سے ایدوم تک اور جزیرہ نمائے عرب کے مغربی ریگستان سے بحر قلزم کے ساحل تک وسیع کیا گیا۔ یعنی ملک شام کا کل جنوبی حصہ عبرانیوں کے زیر نگیں ہوا اور یہی انتہائی وسعت تھی جو اس صفحاتِ تواریخ پر زندہ قوم کی حکومت کو نصیب ہوئی۔

لڑائیوں کی تفصیل دلچسپ نہیں۔ صرف اُن واقعات کو دہرانا ہے جن سے فتوحاتِ داؤدی کی عظمت ظاہر ہو۔ بنی اسرائیل کی جنگجوئی۔ شجاعت اور خون آشامی کا اندازہ ہو اور اُسی کے ساتھ کنعان کے رسم و رواج کا کچھ نقشہ ان سے

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

بنی اسرائیل کا پہلا بادشاہ ساؤل عمالقہ کی لڑائی میں جلبوعہ کی پہاڑی پر قتل ہوا تھا

اس کے تین بیٹے بھی اس جنگ میں مارے گئے۔ صرف ایک لڑکا اشبوست نام جو اس وقت جوان تھا اور ایک پوتا مفیبوست جو طفل پنج سالہ تھا قتل عام سے محفوظ رہے۔ دایہ اس بدنصیب بچے کو لیکر بھاگی۔ وہ راستے میں گر گیا۔ اور زندگی بھر کے لیے لنگڑا ہو گیا۔ اشبوست.... تاج و تخت کے قابل تھا۔ ساؤل کے سپہ سالار ابنیر نے اپنے ولی نعمت کے گھرانے میں حکومت کا دبدبہ قائم رکھنے کے لیے فوج کے مشورے سے اشبوست کو بادشاہ بنایا۔ اُدھر بنی یہودا نے جن کا اولاد اسرائیل میں زبردست پایہ تھا سلطنت کا تاج حضرت داؤد کے نذر کیا۔ دو بادشاہ دو اقلیم یکنند۔ خانہ جنگی لازمی نتیجہ تھا۔ جنگ شروع ہوئی اور حضرت داؤد کی طرف ان کا بھانجا یوآب سالار لشکر تھا اور ادھر ابنیر نمونۂ کل۔

جبعون کے تالاب پر دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ ابنیر نے مصلحت اندیش اور عاقبت بین تھا سمجھا کر باہمی جنگ جدال سے قوم کی طاقت کو زوال ہوگا اور ہمسائے دندانِ آز تیز کریں گے۔ لہٰذا فیصل خونریزی ٹالنا چاہی۔ تجویز کی کہ فریقین کے بارہ بارہ نوجوان میدان میں آئیں اور تیغ زنی۔ نیزہ بازی کلوخ اندازی کے کرتب دکھائیں۔ تماشہ کھیل کی طرح شروع ہوا مگر انجام کار سچ مچ کی لڑائی ہونے لگی۔ کھلاڑیوں نے ایک دوسرے کو تلواروں سے قتل کر دیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ داؤدی عسکر ظفریاب ہوا ابنیر نے راہ فرار اختیار کی یوآب اور اُس کے بھائیوں نے تعاقب کیا عساہیل سب پیچھا کرنے والوں کے آگے تھا۔ وہ یوآب کا بھائی تھا اور جنگلی ہرن کے مانند سبک پا سمجھا جاتا تھا۔ ابنیر نے تعاقب سے منع کیا مگر عساہیل کے سر پر قضا کھیل رہی تھی وہ باز نہ آیا۔ ابنیر نے پلٹ کر برچھی کی انی سے اُس کا کلیجہ چھید دیا اور تڑپتی ہوئی لاش میدان میں چھوڑ کر آگے بھاگا۔

یوآب غم و غصہ سے بدحواس ہو گیا۔ تیزی سے بڑھا اور ابنیر کے نزدیک آیا۔ ابنیر نے پکار کر کہا "کیا تلوار ابد تک ہلاک کرتی رہے گی؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اس کا انجام قوم کے لیے دردناک ہوگا" یوآب تعاقب سے باز آیا اور اپنے مقتول بھائی کی لاش بیت لحم میں دفن کر کے بادشاہ کی خدمت میں بمقام حبرون حاضر ہو گیا مگر اس کے دل میں کینہ کی آگ سلگتی رہی اور اس خون کا عوض لینے کے لیے موقع و محل کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑے تھوڑے وقفے سے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں فریقین کے سپاہیوں میں ہوتی رہیں لیکن فیصلہ نہ ہو سکا۔ ابنیر نے جان لیا کہ وہ اقبال داؤدی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اور تھا بھی

سے ملک تباہ ہوا جاتا ہے۔ اس فساد کو ختم کرنے کے لیے بہانہ ڈھونڈنے لگا۔ اتفاقاً اسی زمانے میں اشبوست نے سپہ سالار پر اعتراض کیا کہ وہ ساؤل مرحوم کی حرم رصفاہ کے پاس بےجھجک جاتا ہے۔ اس الزام نے آگ پر تیل چھڑکا۔ وہ آزردہ ہوکر اکابرینِ بنی اسرائیل کے پاس گیا۔ ان سب کی صلاح سے صرف ۲۰ جوان ہمراہ لے کر سلطانِ حریف کی خدمتِ با سعادت میں آیا۔ یہاں اس کی خوب خاطر مدارات ہوئی۔ اور اس سے عہد و پیمان لیا گیا کہ وہ تمام بنی اسرائیل کو ایک حکومت پر متفق کر دے۔ تاکہ اندرونی سازشوں کا سلسلہ ختم ہو اور ملک کی فلاح رعایا کی رفاہ کی تدبیریں سوچنے کا وقت ملے۔

یوآب اس وقت کسی فوجی مہم پر حبرون سے دور تھا۔ مہمان کے رخصت ہونے کے بعد شہر میں پہونچا۔ دشمن کی عزت و تکریم کا احوال سن کر تن بدن میں آگ لگ گئی۔ پہلے بادشاہ سے شکایت کی۔ ابنیر پر جاسوسی کا الزام لگایا۔ مگر سرکار میں شنوائی نہ ہوئی۔ تب بغیر اجازت قاصد بھیج کر ابنیر کو حبرون واپس بلایا۔ وہ شاہینِ قضا کے سرپنجہ سے غافل، قاصد کے پیام پر اعتبار کر کے چلا آیا۔ یوآب گفتگو کے بہانے اس کو ایک بند مکان میں لے گیا اور دھوکے سے بھائی کے قاتل کو مار کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔

بادشاہ کو اس دغابازی سے سخت صدمہ ہوا۔ یوآب کا رسوخ و اقتدار اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس پر حد قصاص جاری کرنے کا بس نہ۔ کہتے تھے روتے ہوئے ابنیر کی لاش مدفن تک لے گئے اور اس کی حسرتناک موت پر ایک دردانگیز مرثیہ کہا۔

اشبوست کی بادشاہی ابنیر کے دم سے تھی۔ وہ نہ رہی تو قالب بےجان ہوگیا۔ وہ دوپہر کے وقت قیلولہ میں مصروف تھا کہ دو سردار محل میں گھس آئے اور اس کا کام تمام کر دیا۔ مقتول کا سر لے کر خلعت و انعام کے لالچ میں حبرون آئے۔ اقبال مند بادشاہ حریف کی عبرت انگیز موت سے مغموم ہوا۔ بے رحم قاتلوں کو قصاص میں قتل کیا اور اشبوست کا سر اسی تربت میں دفن کیا جس میں ابنیر کا جسم سپرد کیا گیا تھا۔

اب کوئی دعویدارِ سلطنت باقی نہ رہا۔ تمام اکابر و سرداران بنی اسرائیل نے متفق ہو کر تاجِ داودی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا اور وفاداری کا حلف اٹھایا۔ بادشاہ کی عمر اس وقت ۳۷ برس چھ مہینے کی تھی۔

کوہستان کے وسط میں یبوس نام ایک دلکش شہر رونق فزائے عالم تھا۔ بلند کوہستانی علاقے سب طرف سے اس شہر و سواد خطہ کو گھیرے ہوئے تھے اور عمیق گھاٹیاں دشمنوں سے حفاظت کی ضامن تھیں۔ ندی قیدرون شمال مشرق میں بہتی تھی اور دوامی سرچشمے شہر کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھتے تھے۔ پانی کی قلت شہر میں کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ ہزارہا سال کے انقلابات رد و بدل میں اس بستی کے محاصرین کو پیاس کی تکلیف سے متعدد بار تباہی ہوئی مگر محصورین پانی کے محتاج نہیں ہوئے۔ جنوب و مغرب کی پہاڑیاں بلند تھیں اور ان کے نیچے "ہنوم" کی مشہور خطرناک وادی تھی۔ تین طرف سے ڈھلواں چٹانوں نے شہر کو ناقابلِ تسخیر بنا دیا تھا اور عہد قدیم کے بزدلانہ آلاتِ جنگ سے اس علاقہ کا فتح کرنا محال تصور کیا جاتا تھا۔

فصیل کے گرد کوہستان کے نشیب میں بنی اسرائیل آباد تھے لیکن یہ جنت کا ٹکڑا یبوسیوں کے تصرف میں تھا، جو عمالقۂ قدیم کی ایک شاخ تھے کہتے ہیں کہ اسرائیلیوں کے جدِ اعلیٰ حضرت ابراہیم نے یبوسیوں سے ایک معاہدہ کیا تھا کہ وہ ان کی زمین بغیر قیمت ادا کیے کبھی نہ لیں گے۔ باشندگان شہر نے فرزندانِ یعقوب کے اقبال کی دھوپ چڑھتی دیکھ کر وہ اقرارنامہ پیتل کی لوحوں پر نقش کرا کے بازار کے چوک میں نصب کر دیا تھا اور شہر پناہ کی نگرانی پر صرف مفلوج نابینا اور اپاہج تعینات کیے تھے۔ اولادِ ابراہیم سے معاہدہ کی خلاف ورزی کا اندیشہ نہ تھا۔ اور اس کے علاوہ شہر کی فصیل خود حفاظت کو کافی و وافی تھی کسی دوسرے محافظ کی احتیاج ہی نہ تھی۔

بنی اسرائیل کو خانہ جنگی سے فرصت ہوئی اور ان کی حکومت کو استقلال نصیب ہوا تو دارالسلطنت کے لیے اس قدرتی قلعہ سے بہتر کوئی مقام نہ تھا۔ یبوسیوں نے پرانا عہدنامہ یاد دلایا اور بادشاہ بنی اسرائیل کے پاس یہ پیام بھیجا کہ "جب تک تو اندھوں اور لنگڑوں کو نہ لیجائے یہاں آنے نہ پائے گا" اس چیستان کا سمجھنا دشوار تھا اور آج تک دنیا کے عقلاء اس کو حل نہ کر سکے۔ اسرائیلیوں کے تفکر میں اضافہ ہوا۔ اول تو چٹانوں سے عبور دشوار۔ اس پر طرہ بزرگوں کا قول و قرار۔ اس بستی کا خیال چھوڑ دیں تو رقبۂ حکومت کے مرکز میں غیر قوم کا مستحکم مقام جس سے ساری سلطنت ہر وقت زد میں! نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن!!

اقبالِ داؤدی پشت پناہ ہوا۔ چٹانوں پر آہستہ آہستہ چڑھ کر فصیل کے نیچے پہنچے۔ سرو کا ایک پرانا تناور درخت دیوار کے قریب استادہ تھا۔ جب بادشاہ نے تمامی اور ان کے [illegible] کھڑے ہو کر یوآب نے درخت کا بالائی حصہ مضبوط پکڑا۔ تاریکی اور غفلت میں درخت آہستہ آہستہ

فصیل پر گرا دیا گیا۔ اور یوآب جست کر کے شہر پناہ کی دیوار پر جا پہنچا۔ اس سے کا ایک شہر میں لنگڑے لولوں کی
مورتوں کو توڑ ڈالا اور معاہدہ کی یادگار فنا کر دی۔ اب جاں نثار شجاعوں کے لیے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔
بنی اسرائیل شہر میں داخل ہو گئے۔ اور قلعہ تسخیر کر لیا۔

بادشاہ نے اپنے عہد الٰہی کا وعدہ پورا کیا۔ زمین کی قیمت یبوسیوں کو ادا کی اور انھوں نے
منظور کر لی۔ اُسی دن سے وہ قلعہ "داؤد کا شہر" مشہور ہوا اور اس وقت تک دنیا کے جغرافیہ میں
یروشلیم کے مقدس اسم مبارک سے زندہ ہے

یہود کا "مقدس صندوق" جس میں اُن کے اولوالعزم اجداد کی یادگاریں تھیں اور جو
"اسرائیلیات" میں تابوتِ سکینہ کے نام سے مشہور ہے بنی اسرائیل کی نظر میں ویسا ہی معزز اور واجب التعظیم
تھا جیسا کہ ایرانیوں کی نگاہ میں درفشِ کاویانی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ مریض اُسکو مس کرنے
سے شفا پاتے تھے باراںِ رحمت اُس کے تصدق اور وسیلہ سے نازل ہوتا تھا۔ جس لڑائی میں یہ
برکت کا خزانہ فوج کے ساتھ ہو اسرائیلیوں کو ہزیمت محال سمجھی جاتی تھی۔ ایک مدت تک وہ جنگل
میں گم رہا اور عمالقہ اسرائیلیوں پر غالب ہو گئے ساؤل اس سرچشمۂ عظمت و اقتدار کو دشمنوں سے
چھین کر لایا اور بنی اسرائیل کی بادشاہی سے سرلبند ہوا۔ اُس کے عہد حکومت میں یہ مقدس امانت
قریۂ یعریم میں جو سبط یہودا کی ایک بستی تھی رونق افروز رہی۔ نئے بادشاہ نے اس تبرک کو یروشلیم
میں منتقل کرنے کی نیت کی تاکہ تمام اسباطِ یعقوب کے قلوب میں جدید دارالسلطنت کی عظمت راسخ ہو۔
وہ تیس ہزار اکابر بنی اسرائیل کو ہمراہ لیکر قریہ گئے اور صندوق کو گاڑی پر بار کر کے یروشلیم کی
طرف گاتے بجاتے لانے لگے۔ اتفاقاً بیلوں نے ٹھوکر کھائی۔ کسی جاں فروش نے تھامنے کے لیے
صندوق میں ہاتھ لگا دیا وہ بدقسمتی سے فوراً ہلاک ہو گیا۔ بادشاہ نے خوف زدہ ہو کر تابوت
اُسی جگہ ایک مکان میں رکھوا دیا اور تین مہینے کی عبادت و ریاضت کے بعد پرہیزگاروں کے
کندھوں پر بار کرا کے دارالسلطنت کی طرف کوچ کیا۔ صندوق کے اُٹھانے والے چھ قدم چلے
تو قربانی کی گئی۔ صنوبر کی لکڑی کے بنے ہوئے ساز۔ ستار۔ بربط۔ دف۔ اور جھانجھ بجاتے
خدا کی حمد گاتے ہوئے اس سرچشمۂ جاہ و جلال کو یروشلیم لائے۔ ایک بیش قیمت خیمہ پہلے سے استادہ
کر دیا گیا تھا۔ اُسکے پردوں کے اندر یہ نعمت بے بہا رکھی گئی اور تمام اولادِ اسرائیل کو ایک ایک روٹی،
ایک ایک ٹکڑا گوشت کا اور ایک ایک ٹکیا کشمش کی بارگاہِ سلطانی سے

[illegible]

فتوحاتِ داؤدی کا سیلاب تلاطم خیز ہوا۔ سب سے پہلے اسرائیلیوں کے جاہل ترین دشمن فلستی ورطۂ ہلاکت میں آئے۔ اُن کا مضبوط مقام جات مع تمام قصبات متعلقہ کے بنی اسرائیل کے زیرنگیں ہوا۔

موآبی۔ فلستیوں کے بعد موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ بیشتر خون کی ندی میں ڈوبے جو بچے غلامی کی زنجیر میں جکڑے گئے۔

ملک شام کی ریاست ضوباہ کا فرماں روا جس کی سلطنت کا رقبہ دریائے فرات تک وسیع تھا مقابلہ پر آیا اور تباہی کے سمندر میں ڈوبا۔ ایک ہزار رتھ۔ سات ہزار سوار اور پیادے مالِ غنیمت میں آئے۔

دمشق کے ارامی ضوباہ کی مدد کو نکلے شکست پائی اور ان کے دارالحکومت میں بنی اسرائیل کی چوکی قائم ہوگئی۔ غنائم میں سونے کی ڈھالیں۔ پیتل کی بڑی مقدار پایۂ تخت یروشلیم پہنچیں جو بعد کو معبد خانے کی تعمیر میں کام آئیں۔

ادومی۔ عمالقہ۔ یکے بعد دیگرے صولتِ داؤدی کے شکار ہوئے۔ سونے۔ چاندی۔ پیتل کے برتن ہر طرف سے نذر و خراج میں آنے لگے اور یروشلم کا قلعہ پرستاں کا شہر زرنگار بن گیا۔

اسی اثنا میں بنی عمون کا بادشاہ فوت ہوا۔ اُسکے لڑکے کے پاس تعزیت کے لیے اسرائیلیوں کی طرف سے قاصد بھیجے گئے۔ نوعمر رئیس کو درباریوں نے بھڑکایا۔ اور قاصدوں پر جاسوسی کا الزام لگایا۔ لڑکا صلاح کاروں کے کہنے میں آگیا۔ ایلچیوں کی داڑھی مونچھیں منڈوا کر اُن کی آدھی پوشاک کٹوائی۔

محال تھا کہ بنی اسرائیل کا اقبال مند بادشاہ اپنے پیامبروں کی ذلت و رسوائی برداشت کرے ضرب الکلام اہانت المولیٰ۔ سپہ سالار زبردست فوج لیکر نکلا۔

عمونیوں نے شام کے اضلاع سے ارامی سپاہی اپنی اعانت کو بلائے۔ وہ ایک دھاوے کی بھی تاب نہ لاسکے اور فرار ہوگئے۔ عمونی شہروں اور قلعوں میں پناہ گزیں ہوئے۔ یوآب نے قسم کھائی کہ وہ جب تک عمونیوں کو بالکل تباہ نہ کرلے ہتھیار نہ کھولے گا۔ دشمن کے علاقے کو تاخت کرتا ہوا اُن کے دارالسلطنت ربہ تک پہنچا اور اُسکا محاصرہ شروع کردیا۔

قدیم آثارات حب سے متکلم مقامات کی تسخیر بہت دشوار ہو رہی تھی۔ محاصرے کو طول ہوا اور کئی جگہ عمرانیوں کا بہادر افسر اُوریاہ مارا گیا جس کی خوبصورت بیوہ بیت سبع حرم داؤدی میں داخل ہوئی اور ساؤل کے طرفداروں کو نئے بادشاہ کے بدنام کرنے کے لیے ایک شگوفہ ہاتھ آیا۔
کہنے لگے کہ بادشاہ نے بیت سبع کو اُوریاہ کی حیات ہی میں نظر پسندیدگی سے دیکھا تھا اور اس خطرناک مہم پر اُسکی تعیناتی میں یہ مصلحت مضمر تھی کہ وہ دشمنوں کے ہاتھ سے قتل ہو اور اُس کی بیوہ محل شاہی کی زینت بنے۔ اتفاق سے ایسا ہی واقع ہوا اور سوگ کے دن گزرنے کے بعد "جس کی مدت غالباً ایک ماہ تھی وہ حرم میں داخل ہو گئی بادشاہ کو متنبہ کرنے کے لیے خداوند کا ایک رسول اُس کے حضور میں آکر عرض پرداز ہوا کہ
"کسی شہر میں دو شخص تھے۔ ایک امیر اور دوسرا غریب۔ اُس امیر کے پاس بہت ریوڑ اور گلے تھے پر اُس غریب کے پاس بھیڑ کی ایک ٹھیا کے سوا کچھ نہ تھا۔ اُس امیر کے یہاں کوئی مہمان آیا۔ اُسکی تواضع کے لیے امیر نے اپنے ریوڑ اور گلے سے کچھ نہ لیا بلکہ اُس غریب کی بھیڑی پکا کر مہمان کو کھلا دی"۔ بادشاہ نے فیصلہ کیا "خداوند کی حیات کی قسم وہ شخص جس نے یہ کام کیا واجب القتل ہے"۔ رسول نے جواب دیا "وہ شخص تو ہی ہے۔ خدا نے تجھے ساؤل کے ہاتھ سے چھڑایا۔ تیرے آقا کا گھر تجھے دیا۔ مگر تو نے اُسکے حضور بدی کی۔ اُوریاہ کی بیوی لی تاکہ وہ تیری بیوی بنے اور اُسکو بنی عمون کی تلواروں سے قتل کرایا۔ سو اب تیرے گھر سے تلوار کبھی الگ نہ ہوگی اور تیرے ہی گھر سے تیرے خلاف شر اُٹھیگا"۔
یہ داستان صحیفۂ شموئیل کے مولف نے بہت رنگ آمیزی سے خلاف قیاس مبالغوں کے ساتھ بیان کی ہے لیکن صحیفۂ "تواریخ" میں اس قصہ کا بالکل تذکرہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ صحیفۂ شموئیل کی تدوین کے . . . . وقت ساؤل کے طرفداروں کا بنایا ہوا قصہ زبان زد عام ہو اور کتاب میں درج ہو گیا ہو لیکن زمانۂ مابعد میں اسکی دروغ بافی آشکارا ہو گئی اور مولف "تواریخ" نے اس کو غلط جان کر اپنی تالیف میں شامل نہیں کیا۔
تالمود، صحیفۂ تواریخ کے مدت بعد مدون ہوئی۔ اُس میں ایک روایت ہے کہ اُوریاہ جہاد کو روانہ ہونے سے پہلے اپنی بیوی کو طلاق دے گیا تھا۔ اگر یہ حکایت صحیح ہو تو ساؤلی افسانہ کے سب تار و پود بکھرے جاتے ہیں کسی مطلقہ یا بیوہ سے عقد کرنا نیک طینت بادشاہ کے شایان شان شاید نہ ہو لیکن کوئی اخلاقی جرم ہرگز نہ تھا۔ البتہ یہ مسلم ہے کہ خدا ترس سلطان کو اس فعل پر ندامت

فتوحات [illegible] -

فتوحات داؤدی کا سیلاب تلاطم خیز ہوا۔ سب سے پہلے اسرائیلیوں کے جاہل ترین دشمن فلستی ورطۂ ہلاکت میں آئے۔ اُن کا مضبوط مقام جات مع تمام قصبات متعلقہ کے بنی اسرائیل کے زیر نگیں ہوا۔

موآبی۔ فلستیوں کے بعد موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ بیشتر خون کی ندی میں ڈوبے۔ جو بچے غلامی کی زنجیر میں جکڑے گئے۔

ملک شام کی ریاست ضوبا کا فرماں روا جس کی سلطنت کا رقبہ دریائے فرات تک وسیع تھا مقابلہ پر آیا اور تباہی کے سمندر میں ڈوبا۔ ایک ہزار رتھ۔ سات ہزار سوار اور پیادے مال غنیمت میں آئے۔

دمشق کے [illegible] ضوبا کی مدد کو نکلے شکست پائی اور ان کے دارالحکومت میں بنی اسرائیل کی چوکی قائم ہوگئی۔ غنائم میں سونے کی ڈھالیں اور پیتل کی بیشمار ہتھیار یروشلم پہنچیں جو بعد کو عبادت خانے کی تعمیر میں کام آئیں۔

ادومی۔ عمالقہ یکے بعد دیگرے صولت داؤدی کے شکار ہوتے گئے۔ چاندی۔ پیتل کے برتن ہر طرف سے نذر و خراج میں آنے لگے اور یروشلم کا قلعہ پرستان کا شہر زرنگار بن گیا۔

اسی اثنا میں بنی عمون کا بادشاہ فوت ہوا۔ اُسکے لڑکے کے پاس تعزیت کے لیے اسرائیلیوں کی طرف سے قاصد بھیجے گئے۔ نو عمر رئیس کو درباریوں نے بھڑکایا اور قاصدوں پر جاسوسی کا الزام لگایا۔ لڑکا مصلاح کاروں کے کہنے میں آگیا۔ ایلچیوں کی داڑھی مونچھیں منڈوا کر اُن کی آدھی پوشاک کٹوائی۔

محال تھا کہ بنی اسرائیل کا اقبال مند بادشاہ اپنے پیامبروں کی ذلت و رسوائی برداشت کرے ضرب الکلام الامانت المولی۔ سپہ سالار زبردست فوج لیکر نکلا۔

عمونیوں نے شام کے اضلاع سے ارامی سپاہی اپنی اعانت کو بلائے۔ وہ ایک دھاوے کی بھی تاب نہ لاسکے اور فرار ہوگئے۔ عمونی شہروں اور قلعوں میں پناہ گزیں ہوئے۔ یوآب نے قسم کھائی کہ وہ جب تک عمونیوں کو بالکل تباہ نہ کرے ہتھیار نہ کھولے گا۔ دشمن کے علاقے کو تاخت و تاراج کرتا ہوا اُن کے دارالسلطنت ربہ تک پہنچا اور اُسکا محاصرہ شروع کردیا۔

قدیم آلات حرب سے مستحکم مقامات کی تسخیر بہت دشوار ہوتی تھی۔ محاصرے کے دوران [illegible] جگہ عیرانیوں کا بہادر افسر آریا مارا گیا جس کی خوبصورت بیوہ بیت سبع حرم داؤدی میں داخل ہوئی اور ساؤل کے طرفداروں کو نئے بادشاہ کو بدنام کرنے کے لیے ایک شگوفہ ہاتھ آیا۔

کہنے لگے کہ بادشاہ نے بیت سبع کو آریا کی حیات ہی میں نظر پسندیدگی سے دیکھا تھا اور اس خطرناک مہم پر اُسکی تعیناتی میں یہ مصلحت مضمر تھی کہ وہ دشمنوں کے ہاتھ سے قتل ہو اور اُس کی بیوہ محل شاہی کی زینت بنے۔ اتفاق سے ایسا ہی واقع ہوا اور سوگ کے دن گزرنے کے بعد جس کی مدت غالباً ایک ماہ تھی وہ حرم میں داخل ہوگئی بادشاہ کو متنبہ کرنے کے لیے خداوند کا ایک رسول اُس کے حضور میں آکر عرض پرداز ہوا کہ

"کسی شہر میں دو شخص تھے۔ ایک امیر اور دوسرا غریب۔ اُس امیر کے پاس بہت ریوڑ اور گلے تھے پر اُس غریب کے پاس بھیڑ کی ایک پٹھیا کے سوا کچھ نہ تھا۔ اُس امیر کے یہاں کوئی مہمان آیا۔ اُسکی تواضع کے لیے امیر نے اپنے ریوڑ اور گلے سے کچھ نہ لیا بلکہ اُس غریب کی بھیڑی پکا کر مہمان کو کھلا دی"۔ بادشاہ نے فیصلہ کیا "خداوند کی حیات کی قسم وہ شخص جس نے یہ کام کیا واجب القتل ہے"۔ رسول نے جواب دیا "وہ شخص تو ہی ہے۔ خدا نے تجھے ساؤل کے ہاتھ سے چھڑایا۔ تیرے آقا کا گھر تجھے دیا۔ مگر تو نے اُسکے حضور بدی کی۔ آوریا کی بیوی لی تاکہ وہ تیری بیوی بنے اور اُسکو بنی عمون کی تلواروں سے قتل کرایا۔ سو اب تیرے گھر سے تلوار کبھی الگ نہ ہوگی اور تیرے ہی گھر سے تیرے خلاف شر اٹھیگا"۔

یہ داستان صحیفۂ شموئیل کے مولف نے بہت رنگ آمیزی سے خلاف قیاس مبالغوں کے ساتھ بیان کی ہے لیکن صحیفۂ "تواریخ" میں اس قصہ کا بالکل تذکرہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ صحیفۂ شموئیل کی تدوین کے . . . . وقت ساؤل کے طرفداروں کا بنایا ہوا قصہ زبان زد عام ہوا اور کتاب میں درج ہو گیا ہو لیکن زمانہ مابعد میں اسکی دروغ بافی آشکارا ہوگئی اور مولف "تواریخ" نے اس کو غلط جان کر اپنی تالیف میں شامل نہیں کیا۔

تالمود، صحیفۂ تواریخ کے مدت بعد مدون ہوئی۔ اُس میں ایک روایت ہے کہ آوریا جہاد کو روانہ ہونے سے پہلے اپنی بیوی کو طلاق دے گیا تھا۔ اگر یہ حکایت صحیح ہو تو ساؤلی افسانہ کے سب تار و پود بکھرے جاتے ہیں کسی مطلقہ یا بیوہ سے عقد کرنا نیک طینت بادشاہ کے شایان شان شاید نہ ہو لیکن کوئی اخلاقی جرم ہرگز نہ تھا۔ البتہ یہ مسلم ہے کہ خداترس سلطان کو اس فعل پر ندامت

[illegible] بہت تک خطا بخش و خطا پوش ہرکا ہے استغنا رکھتے رہے۔ سچ ہے عوام کی جماعت [illegible] حیثیت کے بدلتا ہے۔ جیسے نتیجے ہی ہوا اُنکو یہ اشکل ہے۔

[illegible] شہر عمونیوں کا دارالسلطنت ربۃ محاصرے کی سختیوں سے عاجز ہوا۔ شہر کی فصیل میں رخنے پڑنے لگے۔ بعض استحکامات منہدم ہوگئے تو سپہ سالار کی درخواست پر بادشاہ بنفس نفیس یہاں تشریف لے گئے اور دشمنوں کا آخری ملجا و مامن مسخر ہوا۔ اُنکے معبود انجام ہے عقل حاکم کا تاج جسکا وزن ایک قنطار سونا تھا اور بیش بہا جواہرات سے مزین و مکلل تھا، اسرائیلی بادشاہ کے سر پر رکھا گیا اور تمام صوبہ کنعان میں اولاد یعقوب کا کوئی حریف مقابل باقی نہ رہا۔ صوبہ دان سے بیر شیبہ تک بنی اسرائیل کا شمار کیا گیا تو آٹھ لاکھ فرزندان یعقوب تلوار چلانے کے قابل موجود تھے جن میں سے پانچ لاکھ صرف ایک سبط یعنی یہودا کی اولاد میں تھے۔

مولف صحیفہ "تواریخ" کے قول کے مطابق "جہاں کہیں داؤد جاتا خداوند اُسے فتح بخشتا تھا اور وہ اپنی ساری رعیت کے ساتھ عدل و انصاف کرتا تھا"۔

صور کے بادشاہ حیرام نے بنی اسرائیل سے دوستانہ تعلقات پیدا کیے۔ شاہی محل کی تعمیر کے لیے دیودار کی لکڑی، نجار، اور معمار روانہ کیے جنہوں نے فنون تعمیرات عبرانیوں کو سکھائے۔ گیہوں، شراب، تیل اور شہد کی کنعان میں افراط تھی۔ ان اجناس کا تبادلہ صور سے شروع ہوا اور اُس عالمگیر تجارت کی بنیاد قائم ہوئی جسکے لیے قوم یہود آج تک دنیا میں مشہور ہے۔

اس جلیل القدر بادشاہ کا دورِ حکومت چالیس سال تک رہا۔ سپہ سالار یوآب کی شجاعت و دلیری، استقلال و تہور کا تمام فلسطین میں ڈنکا بجا۔ اور اُسکی بہادری و وفاداری کے قصے گھر گھر بیان ہونے لگے۔ اُن میں سے ایک کہانی سننے کے قابل ہے۔

بنی اسرائیل کو عمالقہ کے شہر کینانی کا محاصرہ کیے ہوئے کچھ مہینے گزر چکے تھے اور شہر فتح نہ ہوتا تھا۔ سرداران لشکر نے باہم صلاح کرکے سپہ سالار سے عرض کی کہ زیادہ عرصہ تک اہل و عیال سے دور رہنا مناسب نہیں ہے۔ وطن کو واپس چلیے اور اس شہر کی تسخیر آیندہ سال کے لیے ملتوی رکھیے۔

یوآب نے جواب دیا کہ بے نیل مرام واپسی سے بادشاہ ناراض ہونگے اور ہماری سلطنت [illegible] کی تحقیر ہوگی لہذا قرین مصلحت یہ ہے کہ تم فلاخن میں رکھکر مجھے شہر میں پھینک دو۔

جو شہر میں داخل ہو کر کسی حکمت سے اس علاقہ کو زیر کر دوں گا۔ اگر چالیس دن کے اندر [illegible]
سے خون بہتا ہوا نظر آئے تو سمجھ لینا کہ میں زندہ ہوں ورنہ مجھ کو مردہ گمان کر کے بغیر لڑے [illegible] اپنے دیس
کو واپس جانا۔

سرداروں نے سر اطاعت خم کیا۔ یوآب نے تلوار ہاتھ میں لی۔ ایک ہزار چاندی کے درہم کمر سے
باندھے اور حکم کے مطابق سنگِ فلاخن کی طرح دشمنوں کے شہر میں یکہ و تنہا ڈال دیا گیا۔

اتفاقاتِ قضا و قدر نے ایک بیوہ عورت کے صحن میں گرایا۔ اس کی بیٹی نے دیکھا کہ ایک
اجنبی آنگن میں بیہوش پڑا ہے۔ دوڑ کر اپنی ماں کو خبر کی۔ ناخواندہ مہمان چھت کے نیچے لایا گیا۔ وہ
ہوشیار ہوا تو حسب نسب آمد کا سبب دریافت کیا گیا۔ یوآب نے کہا کہ وہ عملیقی ہے۔ اسرائیلیوں
کی قید میں گرفتار تھا۔ انھوں نے بے رحمی سے ہلاک کرنے کے لیے فلاخن میں رکھ کر پھینک دیا
سخت جان تھا اس لیے معذوری کے مصائب جھیلنے کو زندہ رہا۔ عورتوں کو ترس آیا۔ یوآب نے
دس درہم کمر سے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھے۔ عورت کی غیرت چاندی سے زرد چیز ہو جاتی ہے زر بر
فولاد نہی نرم شود۔ سب ملکے دل پر مہربان ہو گئیں۔

دس دن تک عزت و حرمت سے مہمان رہا۔ بعد ازاں گھر سے باہر نکلنے کی اجازت طلب کی۔
عالقہ کا لباس عورتوں سے عاریت لیا۔ زیب تن کیا اور دشمنوں کے دارالسلطنت میں بے خوف و
ہراس چہل قدمی کرنے لگا۔ بازار میں ایک سلح ساز کی دکان پر گیا اور اپنی شکستہ شمشیر دکھا کر اسی
نمونہ کی دوسری تلوار بنانے کی فرمائش کی۔ حکم کی تعمیل ہوئی تو اس نے تلوار کا لوہا مرود کر دو ٹکڑے کر دیا۔
اور اس سے بہتر تلوار مانگی۔ مکرر تعمیل فرمائش ہوئی۔ یوآب نے پھر وہی کرتب دکھایا۔ دوکاندار نے
متعجب ہو کر ایک بیش قیمت دولاجواب تلوار نذر کی۔ یوآب نے پوچھا کہ وہ اس تیغ کو کس کی گردن پر
آزمائے۔ اجل نصیب سلاح ساز کی زبان سے نکلا کہ اسکا بہترین محلِ استعمال اسرائیلیوں کے سپہ سالار
یوآب کی گردن ہے۔ یوآب بولا "فرض کرو کہ میں ہی وہ شخص ہوں۔ دیکھو تمھاری پشت کی طرف
کیا ہے؟" سلح ساز نے منہ پھیرا تو ایک وار میں اس کا سر جسم سے الگ تھا۔

وہاں سے ہٹ کر دوسرے محلہ میں گیا اور دو ناقریب سے اس دن میں پانچ سو سپاہی قتل
کر کے شام کو اپنے فرودگاہ پر واپس آیا۔

ایک محلہ میں چند ساعت کے اندر پانچ سو موتیں ہوئیں تو سارے شہر میں تہلکہ پڑ گیا اور یہ
افواہ پھیل گئی کہ بھوتوں کے راجہ اشمیدی نے دشمنوں سے ساز کر کے یہ سفاکی دکھائی ہے۔

...بیت نیز ساتھ اُس نے بھی سُنا یا نہیں۔ یوآب نے لاعلمی ظاہر کی۔
...دن پھر باہر نکلا اور دوبارہ پانچسو جوان ہلاک کیے۔ شام کو واپس آیا تو سارا بدن
...کا ہمارا کا تعجب ہاتھ میں جم گیا تھا میزبان سے ہاتھ دھونے اور تلوار چھڑانے کو گرم پانی مانگا۔
...کو شک ہوگیا کہ بیٹیا ہوں کا قاتل یہی ہے وہ مل مچانے لگی۔ یوآب نے "سر چشمہ باید گرفتن
...پہ عمل کیا اور اُن میزبانوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔
اس مکان کو شہر خموشاں بنا کر باہر نکلا تو سنا کہ بادشاہ کے ایلچی منادی کرتے پھرتے ہیں کہ کسی پردیسی
شہر میں پناہ نہ دی جائے اور اگر کسی گھر میں کوئی اجنبی مقیم ہو تو فوراً دربار میں حاضر کیا جائے۔ یوآب نے
...ایلچیوں کو قتل کیا اور رات کی تاریکی میں جو سامنے آیا اس کو عدم آباد کا راستہ بتایا۔ سر کٹ کٹ کر
...تھے اور قاتل کا نشان نہ ملتا تھا اسی طرح قتل عام کرتا ہوا شہر پناہ کے دروازہ تک پہونچا اور
...بانوں کو ہلاک کر کے شہر پناہ کا پھاٹک کھول دیا۔ خون کی ندی بہتی ہوئی فصیل کے باہر پہونچی۔
اسرائیلیوں کا طلایہ اپنے سردار کی زندگی سے مایوس گشت میں تھا کہ فصیل کے قریب بہتا ہوا خون نظر
آیا۔ محاصرین نے حیات تازہ پائی۔ اور یکدم شہر پر دھاوا کر دیا۔ تمام رعایا قتل کی گئی۔ اُنکے عبادت
...کدے صاف کیے گئے اور عمالقہ کا بادشاہ زندہ گرفتار ہو کر یروشلم کے دربار میں پابجولاں پیش ہوا۔

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے

دولت و بدکاری۔ ثروت و عیاشی میں قریبی رشتہ داری ہے۔ جس قوم کو ایک گلے لگاتی ہے،
دوسری بھی اُسکے گلے کا ہار ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل کو فراغت و جمعیت نصیب ہوئی تو سیہ کاری ہو جیا
یار بالیں پہ جب آیا تو قضا بھی آئی۔
اسرائیلیوں کا شاہزادہ امنون اپنی سوتیلی بہن تمر پر جو حسن و جمال میں بے مثال تھی فریفتہ
ہوگیا۔ بیماری کے بہانے سے بہن کو بلایا کہ "وہ پوریاں بنائے تاکہ میں اُسکے ہاتھ سے کھاؤں"۔
تمر فرشتۂ تقدیر سے بے خبر امنون کے گھر آئی وہاں اُس کی توہین ہوئی اور بعد کو دروازہ کے باہر نکال
دی گئی۔ وہ رنگین شاہانہ لباس پہنے تھی اُس جوڑے کو چاک کیا سر پر خاک ڈالی اور روتی ہوئی
روانہ ہوئی۔ اُس کا حقیقی بھائی ابی سلوم اس ذلت سے برافروختہ ہوا۔ باپ کو بھی طیش آیا۔ مگر امنون
...چھوڑ دیا اور ہاتھ نہ آیا۔

چند روز میں دنیا اس حسرت ناک فسانے کو بھول گئی مگر ابی سلوم کے دل میں [illegible] اُس سے [illegible] نصیحت یاد رکھی۔ دو برس کے بعد تمام اعزہ و اقربا کی کسی تقریب سے دعوت [illegible] اصرار کرکے بلوایا اور اپنے خادموں کو حکم دیا کہ جب امنون شراب کے نشہ میں مست ہو تو اُسکی گردن اڑا دینا۔ جس وقت اس وحشیانہ حکم کی تعمیل ہوئی سب مہمان بدحواس و سراسیمہ ہو کر بھاگ گئے اور ابی سلوم سے کسی نے باز پرس نہ کی۔ بادشاہ کو اس دردناک خبر سے سخت صدمہ ہوا۔ ابی سلوم روپوش ہو گیا اور تین برس تک جلا وطن رہا۔

علماء یہود کہتے ہیں کہ باپ بیٹے کی یاد کبھی فراموش نہیں کرتا۔ اُس کی شفقت ماں سے بھی زیادہ دیرپا ہوتی ہے اور اس کی تائید میں ایک کہانی بیان کرتے ہیں کہ یوآب ایک دن شہر کا سیر و تماشا کر رہا تھا اور اس سوچ میں تھا کہ بیٹے کے ساتھ الفت ماں کو زیادہ ہوتی ہے یا باپ کو۔ راستہ میں ایک غریب پیرمرد سے ملاقات ہوئی جس کے بارہ لڑکے تھے اور وہ اُنکی پرورش کا کفیل تھا۔ دن بھر محنت مزدوری کرتا اور شام کو بازار سے روٹی خرید کر کے لاتا جسکے ۱۴ حصے کیے جاتے تھے۔ دو حصے وہ اپنے اور بیوی کے لیے رکھتا اور ۱۲ حصے لڑکوں کو تقسیم کر دیتا تھا۔

یوآب نے اس غریب سے کہا "آپ اس قدر ضعیف و سن رسیدہ ہو کر عیال و اطفال کی پرورش کے لیے اس قدر مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں۔ مقتضائے انصاف یہ ہے کہ لڑکے محنت کر کے آپ کی خدمت کریں نہ کہ آپ تکلیف مالایطاق اُٹھا کر اُنکی کفالت کے ذمہ دار رہیں۔ اگر آپ ایک لڑکا بادشاہ کے ہاتھ فروخت کر دیں تو آپ کا بار کسی قدر ہلکا ہو جائیگا اور اُسکی قیمت ایک مدت تک دوسرے لڑکوں کی پرورش میں صرف ہو سکیگی۔"

"بڈھا بہت ناراض ہوا اور یوآب کو بُرا بھلا کہتا چلا گیا۔

دوسرے دن شوہر کی غیر حاضری میں یوآب اُسکی بیوی کے پاس گیا اور سمجھانے لگا کہ "تم میاں بی بی بہت کمزور ہو اور تمھارے لڑکے محنت کے قابل ہیں۔ اُن سے کام لو اور خود آرام کرو۔"

عورت نے کہا کہ "دنیا کا دستور یہی ہے کہ ماں باپ محنت کر کے بچوں کو پالتے ہیں اور اس عام قاعدہ کے خلاف عمل کرنے کی اُنکو کوئی وجہ نہیں ہے"

یوآب بولا "میں ایک آسان ترکیب بتاتا ہوں۔ تم مجھ سے ایک سو دینار لو اور اپنا ایک لڑکا مجھکو دے دو۔ ایک خوراک کا بار تمھارے سر سے الگ ہو جائیگا اور اس روپیے سے تم زندگی [illegible] آرام بسر کرو گے۔"

ابی سلوم حسن و جمال میں شہر کا جواب تھا۔ موسیٰ صحیفہ سموئیل کہتا ہے کہ پاؤں کے تلوے سے سر کی چاند تک اس میں کوئی عیب نہ تھا۔ وہ شیریں گفتاری سے رعایا کے قلوب اپنے ہاتھ میں لیکر ڈھائی سال کے بعد کارنامے سے سلطنت کا دعویدار ہوا۔ بنی اسرائیل کا سواد اعظم اس کی لسانی اور خوبصورتی پر فریفتہ تھا۔ دو برس کی کوشش میں اپنا رسوخ و اقتدار قائم کر کے جبرون گیا جو اسکے والد عالی مرتبت کا پہلا دارالحکومت تھا اور علم بغاوت بلند کر دیا۔

ضعیف العمر پدر گرامی قدر کو عزیز فرزند سے جنگ منظور نہ تھی۔ منتخب جان نثار ساتھ لیکر یروشلیم سے چلے گئے اور پایہ تخت نافرمان بیٹے کے لیے چھوڑ دیا۔

ابی سلوم شان و شوکت سے دار السلطنت میں داخل ہوا اور محبت کرنے والے باپ نے بادیہ نوردی اور جلاوطنی کی مصیبتیں جھیلیں۔

باپ اور بیٹے کے بہی خواہوں نے ایک دوسرے سے لڑنا شروع کیا۔ افرائیم کے جنگل میں لعیاتی جنگ ہوئی۔ "اسرائیلیوں نے داؤد کے خادموں سے شکست کھائی اور اس دن ایسی بڑی خونریزی ہوئی کہ بیس ہزار آدمی کھیت آئے۔ اس دن ساری مملکت میں جنگ تھی اور اتنے لوگ تلوار کا لقمہ نہیں بنے جتنے جنگل کی مصیبتوں کا شکار ہوئے۔"

ابی سلوم بھاگا۔ خچر پر سوار شاہ بلوط کی گھنی ڈالیوں کے نیچے سے گزرا۔ اسکے لانبے بال بوطے میں الجھ گئے۔ خچر ران سے نکل گیا اور وہ آسمان زمین کے بیچ میں لٹکا رہ گیا۔ یوآب کو خبر ملی۔ وہ موقع پر پہنچا اور ابی سلوم کا دل تیروں سے چھید کر بدنصیب شہزادے کی بادشاہ کے صریح حکم کے خلاف جان لی۔ بادشاہ کو اس حادثہ جانفرسا کی خبر پہنچی تو دنیا نظر میں تاریک ہو گئی۔ وہ کمرے کو جاتے روتے ہوئے چلے اور یہ کہتے جاتے تھے "اے میرے بیٹے ابی سلوم! میرے بیٹے! میرے بیٹے! ابی سلوم! کاش میں تیرے بدلے مر جاتا! اے ابی سلوم! میرے بیٹے! میرے بیٹے!!"

بغاوت ختم ہو گئی۔ تخت سلطنت پر اقبال داؤدی دوبارہ سایہ فگن ہوا لیکن بوڑھے باپ کے دل سے ابی سلوم کی یاد نہ گئی۔ آخر زمانہ میں وارث تاج و تخت کو وصیت کی کہ ابنیر اور ابی سلوم کے قاتل یوآب قتل کیا جائے۔ جس دن نئے بادشاہ کی تخت نشینی کے شادیانے بجنا شروع ہوئے یوآب کی زندگی کے لمحے گنے جانے لگے اور یہ بہادر سپہ سالار اپنے محبوب بادشاہ کی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ بعد قتل کر دیا گیا۔

رستم رہا زمیں پہ نہ بہرام رہ گیا　　فردوس کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

زبور (باب ۳۹) میں ہے کہ اس حقیقت و معرفت کے نکات کھلنے والے نے خداوند دو جہاں سے عاقبت کا وقت دریافت کیا :-

اے خداوند! ایسا کر کہ میں انجام سے واقف ہو جاؤں

اور اس سے بھی کہ میری عمر کی میعاد کیا ہے

دیکھ تو نے میری عمر بالشت بھر کی رکھی ہے

اور میری زندگی تیرے حضور بے حقیقت ہے

درحقیقت انسان سایہ کی طرح چلتا پھرتا ہے

وہ ذخیرہ کرتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ اسے کون لے گا

یقیناً ہر انسان بے ثبات ہے -

الہام ہوا کہ موت سبت کے دن واقع ہوگی - عرض کی کہ ایک روز بڑھا کر، اتوار کے دن معین کیا جائے - حکم آیا کہ جدید شاہ ذی حکومت کے آغاز کے لیے سبت کا مبارک دن ازل سے مقرر ہے اور اس میں ترمیم نہیں ہو سکتی - دوبارہ عرض کی کہ سبت سے ایک روز پہلے جمعہ کا دن سفر آخرت کے لیے پسندیدہ تھے مگر یہ استدعا بھی قبول نہ ہوئی - مشہور تھا کہ توریت کی اثنائے تلاوت میں فرشتۂ اجل ہلاک نہیں کر سکتا ہے لہذا آپ سبت کے دن صبح سے شام تک کلام الٰہی کی تلاوت میں مصروف رہتے تھے - جب مقررہ ساعت آئی اور موت کا فرشتہ قبض روح کے لیے حاضر ہوا - آپ کو تلاوت میں مشغول پا کر محلسرائے شاہی کے باغ میں گیا - وہاں درختوں کو زور سے ہلایا اور ایک زہرہ شگاف نعرہ مارا - بادشاہ متحیر ہو کر اٹھے اور آواز کی طرف چلے - زینے سے اترتے تھے کہ پائے مبارک کو لغزش ہوئی - گرے اور روح مقدس اعلیٰ علیین کو پرواز کر گئی - انا للہ وانا الیہ راجعون -

---

ملل قدیمہ

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ - جس میں بعض قدیم اقوام، سلطنت کلدانی، آشوری، بابل، بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت، عقائد اور صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ دیے ہیں - اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے قدیم اقوام کے حالات صحیح طور پر معلوم ہو سکیں - حالات کی وضاحت کے لیے جا بجا تصویریں دی ہیں - صفحات ۲۰۲ - قیمت ۱۲؍ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مسلمانوں کی صنعتِ پارچہ بافی

یورپ کے مشہور مستشرق، فان کریمر کا گوشۂ چشم مسلمانوں پر زیادہ مبذول رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے متعلق اچھی اچھی تحقیقاتیں کی ہیں۔ اُن کی کتاب "زیرِ سایۂ خلفاء مشرق کی تہذیب" اب تک واقعی لاجواب چلی آرہی ہے؛ افسوس یہ ہے کہ اُس کا انگریزی ترجمہ نہیں ہوا۔ مولوی محمد جمیل الرحمٰن صاحب پروفیسر تاریخِ اسلامی، عثمانیہ یونیورسٹی نے جرمن زبان سے اس کا ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اُس کا ایک جزو "مسلمانوں کی صنعت و حرفت و تجارت و زراعت" کتابستان، الہ آباد، عن قریب شایع کرنے والا ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب واقعی قابلِ دید ہے۔ مسلمانوں کی صنعتِ پارچہ بافی کے متعلق پروفیسر فان کریمر نے جو کچھ لکھا ہے اُس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

یہ امر تحقیق طلب ہے کہ جو کپڑا چین کو درآمد ہوتا تھا، وہ صرف سوتی ہی ہوتا تھا یا اونی بھی۔ جو ذرائع معلومات اس وقت ہمارے سامنے ہیں، اُن سے سوتی، اونی، ریشمی، کتانی اور سوتی اور ریشمی ملے جُلے کپڑوں کا الگ الگ حال نہیں معلوم ہو سکتا۔ پہلے زمانے کے ایشیائی مورخ اس کو تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا کرتے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ صورت میں اس کو بیان کرنا ہمارے لیے بالکل ناممکن ہے۔ بہرحال، اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ عراق میں، روئی کی صنعت بہت جلد فروغ پا گئی تھی۔ اس صوبے میں نہ صرف بڑی مقدار میں، روئی پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ اس سے سوت بھی اُسی مقدار میں تیار ہوتا تھا۔

عباسیوں کے عہد میں پارچہ بافی کی صنعت خلافت کے ہر بڑے صوبے میں پورے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ کپڑا اتنا تیار ہوتا تھا کہ مقامی ضروریات پوری کرکے بڑی مقدار میں منڈیوں میں بھیجا جاتا تھا۔ اس مال کی کھپت بہت تھی، اور اس کی تجارت میں نفع بھی بہت زیادہ تھا۔ اُون، سُوت اور اُونٹ کی پشم سے طرح طرح کے، صرف [illegible] رنگ، یا بہت موٹے کپڑے بھی بُنے جاتے تھے .....

جیسے جیسے روئی کی پیداوار بڑھتی اور ممالک محروسہ خلافت میں پھیلتی گئی، اُسی طرح پارچہ بافی کی صنعت میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ خلافت کے ہر صوبے کا کسی نہ کسی طرح کا خاص کپڑا مشہور تھا۔ ایک زمانے میں جنوبی عرب کی چادریں بہت مشہور تھیں، اور یہی چادریں زمانۂ ما بعد میں "عدنی" کہلانے لگیں؛ کیوں کہ یہ عدن میں بنائی جاتی تھیں اور وہیں سے وساور کی جاتی تھیں ۱۔

ہرات کے بنے ہوئے کپڑوں نے بھی بہت جلد ایسی ہی شہرت حاصل کر لی تھی ۲۔

ان کے علاوہ سُوتی کپڑے عراق، ایران، نیز اور افریقہ میں بھی بُنے جاتے تھے، اور بہ کثرت وساور ہوتے تھے۔ ان کی تجارت نے بھی فروغ حاصل کر لیا تھا ۳۔ کرمان اور بم میں بھی اس صنعت کی خوب گرم بازاری تھی۔ بم میں خاص طور پر بہت نفیس کپڑا بُنا جاتا تھا، اور ہر جگہ کو وساور ہوتا تھا۔ اس شہر کے بنے ہوئے نقابوں (طیالسہ) کی خاص طور پر شہرت تھی۔ ان نقابوں کے حاشیے بہت خوب صورت بنائے جاتے تھے۔ یہ یہاں سے وساور ہو کر خراسان، عراق اور مصر تک پہنچتے تھے۔ ان کی قیمت تیس دینار تک اُٹھتی تھی۔ بم کے عمامے بھی بہت مشہور تھے، اور مذکورۂ بالا ممالک میں بڑے شوق سے خریدے جاتے تھے۔ یہاں کے کپڑوں کی ایک یہ خصوصیت تھی کہ وہ بہت پائدار ہوتے تھے؛ عدن اور صنعا کے کپڑوں کی طرح یہ کپڑے بھی کم از کم پانچ، اور اکثر بیس بیس برس تک کام دیتے تھے ۴۔

صوبۂ فارس اس صنعت کے لحاظ سے اور صوبوں سے کم نہ تھا۔ پہننے کے کپڑے اور مندیل اس صوبے میں خوب تیار ہوتے تھے۔ چنانچہ کے مندیل تو خاص طور پر مشہور تھے۔ توّاج اور فسا کے بُنے ہوئے کپڑے دُنیا بھر میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے ۵ اور بہ کثرت وساور ہوتے تھے۔ اسی طرح فارستان سے ملحق، خوزستان، کے صوبے میں بھی پارچہ بافی کی صنعت زوروں پر تھی۔ یہاں خاص طور پر ریشم اور روئی کا کام کیا جاتا تھا ۶۔

عراق میں بھی پارچہ بافی کو دوسرے مقامات کے مقابلے میں کچھ ترقی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکے گا کہ بغداد کے بُنے ہوئے کپڑوں کی مانگ اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ دوسرے مقامات میں اُن کی نقلیں کی جاتی تھیں، اور اُنھیں اصلی بتلا کر فروخت کیا جاتا تھا ۷۔ اُن صوبوں

---

۱ ابن حمدون، و۔ق ۸۲
۲ کامل، ص ۲۵۶
۳ ابن حوقل، ص ۲۱۴
۴ معجم ۳ ا، ص ۴۷۶ - ابن حوقل، ص ۲۲۴
۵ ابن حوقل، ص ۲۱۲
۶ اصطخری، ص ۹۱
۷ اصطخری، ص ۹۲

جہاں اُس زمانے کے بعد صنعت و حرفت کا خاتمہ ہو گیا تھا، پارچہ بافی نہایت ارتقاء پر جاری تھی؛ مثلاً عراق کا شمالی حصہ اور ارمینیہ[1]۔

طبرستان کی اُون اور ریشم کی صنعت بالخصوص مشہور تھی۔ وہاں قالین اور چادریں خوب تیار ہوتی تھیں[2]۔

جنوبی عرب آخری زمانے تک زربفت، نیز سوتی اور ریشمی کپڑوں کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا تھا۔ یہی حال عُمان، اور خاص کر قطر کا تھا۔ یہ صنعت یہاں اِس وقت تک زندہ ہے۔

خالص کتان[3] اور سوت اور ریشم ملے کپڑے اکثر استعمال ہوتے تھے۔

ایشیا کے باریک کپڑے ہمیشہ سے مشہور چلے آتے ہیں۔ دمشق کے کپڑے "وشی" کا ذِکر کیا جا چکا ہے۔ اسی شہر کے نام پر وہ نفیس کپڑا مشہور ہے، جسے آج کل یوروپ میں "ڈمسک" کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں یمن، عراق اور مصر کے شہروں؛ مثلاً کوفہ اور اسکندریہ میں اسی طرح کے مضبوط کپڑے بُنے جاتے تھے[4]۔ باریک اور نفیس کپڑوں کی صنعت، چوں کہ بہت ہی قدیم زمانے سے جاری تھی، اس لیے اُس میں اور بھی خاص طور پر ترقی ہوئی تھی، تنیس کے شہر میں بالخصوص طرح طرح کے بیش قیمت کپڑے؛ مثلاً وشی، کتان کا کپڑا، دیبقی، زربفت (قصب) مخمل اور خراسانی وغیرہ، اور ان کے علاوہ اور مختلف قسم کے کپڑے تیار ہوتے تھے[5]۔ اسی طرح کی صنعت دِمیاط میں بھی زوروں پر تھی[6]۔ دِمیاط اور تنیس، دونوں شہروں میں یہ تجارت ذِمّی عیسائیوں، یعنی قبطیوں، کے ہاتھ میں تھی۔ تنیس میں عمدہ باریک تن زیب (شرب) تیار ہوتی تھی؛ لیکن دِمیاط کا مخصوص نفیس کپڑا زربفت تھا۔ تنیس میں سفید اور دمیاط میں رنگین کپڑا بُنا جاتا تھا۔ سفید کپڑے کا ایک تھان، جس پر زری کا کام ہوتا تھا، تنیس میں تین سو دینار تک قیمت پاتا تھا۔ دمیاط میں ان کپڑوں کے علاوہ مختلف قسم کے شوخ رنگ فرشوں کے کپڑے (الفرودش القلمونی) زردوزی کے کپڑے اور سندل بنائے جاتے تھے۔

---

[1] ابن حوقل ص ۲۴۶

[2] ابن حوقل ص ۲۶۲ - یعقوبی ص ۵۴

[3] ابن خلدون مطبوعہ یورپ - مقدمہ ج ۲ ص ۳۶۶

[4] امراء، فقہا اور نفاست پسند لوگ اپنا لباس ہمیشہ اسی نفیس کپڑے کا بنواتے تھے۔ یہ کپڑا بہترین کتان کا تیار ہوتا تھا اور اُس پر عجیب و غریب رنگ؛ مثلاً عنابی دیبقی وغیرہ دیے جاتے تھے (الآب الوطنی۔ ورق ۱۲۱، صفحہ ۲)

* معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ غفج ہے جس کے معنی وہی ہیں جو نفیس کے لیے جاتے ہیں (مترجم)

[5] مسعودی ج ۵ ص ... مقریزی ج ۱، ص ۲۱۷۔ بالائی مصر کے شہر سیوط میں کتان کے کپڑے بُننے کی صنعت بڑھی ہوئی تھی۔

[6] یعقوبی، ص ۱۲۶ [7] معجم، دیکھو دمیاط

کے مونے پہنتے تھے۔ اس کپڑے میں ارغوانی زمین پر تلا بتلا یہ منظر دکھایا گیا تھا کہ ایک شیر (یا چیتا) ایک
اونٹ پر حملہ آور ہو کر اُسے چیر پھاڑ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہ صنعت انتہائے عروج پر
پہنچ چکی تھی۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں اُس زمانے کے وحشی اہل یورپ نے ایشیائی لباس کی
شان و شوکت کو سب سے پہلے دیکھا، اور اُس وقت سے ایشیا کے بیش قیمت کپڑوں اور سامان تکلف و
تعیش کی طرف میلان بڑھنے لگا؛ اور اس قدر بڑھا کہ بعض ملکوں، خصوصاً فرانس میں، عوام الناس تک
پہنچ کر ہر شخص کی آنکھوں کو چوندھیا دیا، اور سب کے دل و دماغ پر حاوی ہو گیا۔ ان کی مانگ اتنی
بڑھی کہ اُن کی نقل اتارنا ایک سودمند پیشہ ہو گیا؛ چنانچہ شمالی اطالیہ میں ان کپڑوں کی نقلیں تیار کرنے
کا فن نہایت زور و شور کے ساتھ جاری ہو گیا۔ یہ نقلی کپڑے بڑی مقدار میں بنائے جانے لگے[1]۔
لطف یہ ہے کہ نہ صرف کپڑوں ہی کی نقلیں اُتاری جاتی تھیں، اور اُتاری جا رہی ہیں، بلکہ وہ عربی
زبان کی عبارتیں بھی، جن سے یہ کپڑے مزین ہوتے تھے، بعینہٖ کاڑھ دی جاتی ہیں۔ ان نقلی
کپڑوں کو اصلی ایشیائی مصنوعات کہہ کر یورپ کے مختلف ملکوں میں فروخت کیا جاتا تھا۔

کپڑوں کو مزین کرنے اور بھڑکیلے بنانے کی صنعت ایشیا میں اتنے انتہائے کمال کو پہنچی ہوئی تھی
کہ اُس کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔ مصر، شام، عراق، ایران اور خراسان کے صناع اس معاملہ میں ایک
دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ زمانۂ ابعد میں صقلیہ اور اندلس میں بھی جب تک
اسلامی حکومت وہاں باقی رہی، اس صنعت کو کمال پر پہنچا دیا گیا۔ اصل یہ ہے کہ اس کے روز افزوں
فروغ کا باعث عوام الناس کے اوضاع و اطوار اور رسم و رواج ہوا۔ ایسے بیش قیمت اور بھڑکیلے لباس
پہننا، جن سے عظمت و جلالت کا اظہار ہو، ایک قدیم ایشیائی رسم ہے۔ عربوں نے جہاں بیرونی اور
مفتوحہ اقوام کی دوسری رسوم اختیار کیں، وہاں اُنھوں نے ایرانیوں سے ظاہری طمطراق کو بھی سیکھا،
اور اُس کی طرف اُن کا میلان بڑھتا گیا، یہاں تک کہ رنگین اور طلائی لباسوں کا اُن میں عام
رواج ہو گیا۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ صرف یہی میلان اس صنعت کی غیر معمولی ترقی کے لیے کافی تھا۔
جس چیز نے سب سے زیادہ اسے ترقی دی وہ شاہی درباروں کی عیش و عشرت تھی۔ اس کے علاوہ
ایشیائی حکمرانوں میں قدیم سے یہ رسم چلی آتی ہے کہ وہ خاص خاص موقعوں پر دربار کے عمائد اور عام
ملازموں کو خلعت عطا کیا کرتے تھے۔ ان خلعتوں میں زیادہ حصہ کپڑے کا ہوتا تھا؛ اور وہ کپڑا،
عطا کنندہ بادشاہ کے شایان شان ہوتا تھا[2]۔ نہ صرف بادشاہی خلعتوں میں قیمتی کپڑے عطا

---

[1] یورپ میں اب تک یہی ہو رہا ہے۔

[2] یا اسکے برعکس؟ (مترجم)

[illegible] صوبوں کے والی اور دیگر عمائد سلطنت بھی جن میں سے ہر ایک کا چھوٹا سا دربار ہوتا [illegible] والے تھے۔ یوں نہ تنہا ارکین سلطنت، بلکہ اہلِ حرم، خواص، حتیٰ کہ کنیزیں بھی اس صنعت کو ترقی دینے میں بادشاہ کے برابر کے حصہ دار تھے۔ یہ واقعہ اس قدر نمایاں ہے اس کا ثبوت پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جیسے جیسے بیش قیمت کپڑوں کا رواج زیادہ ہوتا گیا، اس کی مانگ بڑھتی چلی گئی، اور اسی نسبت سے اس صنعت میں ترقی ہوتی گئی ؎

ان شان دار اور پرتجمل کپڑوں کے ساتھ ہی ساتھ زردوزی کی صنعت بھی شروع ہوئی، اور وہ یہاں تک بڑھی کہ جواہرات اور موتیوں سے کپڑے مرصع کیے جانے لگے۔ ایسے کپڑوں کا رواج بھی بڑھتا چلا گیا، بہت جلد یہ رسم پھیل گئی کہ اُن تمام لباسوں اور کپڑوں پر، جو عطیۂ سلطانی ہوتے تھے، خلیفۂ وقت کا نام اور لقب یا تو سونے کے تاروں سے کاڑھا جاتا تھا، یا بناوٹ میں بُن دیا جاتا تھا۔ اس سنہری عبارت کو "طراز" کہتے تھے۔ اسی قسم کا کپڑا آج کل بھی ویانا کے اس شاہی نوادر خانے میں محفوظ ہے۔ یہ لباس مقدس رومی سلطنت کے قیصر تاج پوشی کے وقت پہنا کرتے تھے۔ طراز کے متعلق مسلمانوں کے ایک نہایت مستند مورخ نے بیان کیا ہے کہ: "یہ حکومت سطوت کا نشانِ امتیاز سمجھا جاتا تھا کہ حکم راں بادشاہ اپنا نام، یا نقش خاتم، اُن کپڑوں پر، جو خاص شاہی استعمال کے لیے ہوں، دیباج، یا ریشمیں لباسوں پر لکھواتا تھا۔ یہ عبارت یا تو زری سے، یا ایسے رنگ بہ رنگ ریشمیں تاروں سے لکھی جاتی تھی، جو کپڑے کے رنگ سے مختلف ہوں۔ طراز حکومت کا نشانِ امتیاز تھا، اور شاہی لباس کے لیے ایسا مخصوص کہ وہ اُسی سے پہچانے جاتے تھے۔ بعض وقت یہی لباس بادشاہ بہ طور خلعت اُن کو عطا کرتا تھا، جن کی وہ خاص طور پر عزت افزائی کرنا چاہتا تھا۔ دراصل یہ رسم عجمی بادشاہوں کی تھی؛ بعد کو اُسے مسلمان بادشاہوں نے اختیار کر لیا۔ بنی امیہ اور بنی عباس، دونوں خاندان شاہی کے خلفاء طراز کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اس کی تیاری کے لیے شاہی محلوں میں متعدد کارخانے ہوتے تھے، جو "دُورُ الطراز" کہلاتے تھے، اور ان کے نگراں کو "صاحب الطراز" کہتے تھے۔ خلفاء کے دربار میں یہ عہدہ، اور [illegible] کے مقابلے میں، سب سے زیادہ معزز سمجھا جاتا تھا، اور اس پر بڑے بڑے عمائد، یا ایسے لوگ مقرر ہوتے تھے، جو خلیفہ کے خاص مقرب، بلکہ ندیم ہوتے[1]۔ قاہرہ کے فاطمی خلفاء کے دربار میں بھی

---

[1] ابن خلدون، ج ۲، ص ۶۶ -

صاحب الطراز کی خدمت دربار کی اہم ترین خدمتوں میں شمار ہوتی تھی[1]۔ عراق، خوزستان اور فارس[2] کے بڑے بڑے کارخانوں میں طراز بنانے کے کارخانے تھے۔ حقیقت میں اس رواج نے آخر میں بڑا زور پکڑا، اور اس کی اتنی نقل اتاری جانے لگی کہ مورخین نے لکھا ہے کہ خوزستان کے والی راسبی (المتوفی ۳۰۱ ہجری) کے یہاں طراز بنانے کے اسی کارخانے تھے۔ ان کارخانوں سے مراد دراصل کرگھے ہیں، جہاں اس کے لیے اس قسم کے لباس تیار کیے جاتے تھے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ کارخانے صرف وہی کپڑے بناتے تھے، جو راسبی اور اس کے اہل خاندان کے لیے مخصوص ہوں، بلکہ ان میں وہ خلعت بھی شامل تھے، جو وہ لوگوں کو دیا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ وہ بیش قیمت کپڑے بھی ہوتے تھے، جو دوسرے بادشاہوں کو تحفوں میں دیے جایا کرتے تھے۔ یہ یاد رہے کہ اُس زمانے میں جب اور بادشاہوں کے درباروں میں سفارتیں بھیجی جاتی تھیں، تو بالعموم خاص ملکوں کی صنعتوں کی بہترین اور بیش قیمت ترین چیزیں تحفوں کے لیے منتخب کی جاتی تھیں۔ حدودِ خلافت میں جس طرح کے قیمتی اور اعلیٰ قسم کے کپڑے تیار کیے جاتے تھے، اُن کا مقابلہ دُنیا کا کوئی حصہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی وجہ سے ان موقعوں پر دوسرے نوادر کے مقابلے میں بھی کپڑے زیادہ تر انتخاب کیے جاتے تھے۔ یہ ایک نا قابل تردید تاریخی واقعہ ہے کہ ان کپڑوں کو درآمد کرنے کی تجارت بے انتہا زوروں پر تھی۔ بندرگاہ اسکندریہ سے یہ مال یورپ پہنچتا تھا۔ پہلے یہ اطالیہ کی منڈیوں میں منتقل کیا جاتا تھا، اور وہاں سے یورپ میں فروخت کے لیے تقسیم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے یہ تجارت تمام تر اطالویوں کے ہاتھ میں تھی۔ جب تک ممکن ہوا اطالیہ نے اس اجارے کے برقرار رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ اُس زمانے میں اس

---

[1] مقریزی، ج ۱، ص ۴۶۹

[2] ابن حوقل، ص ۲۱۳، ۲۱۴ وغیرہ۔ زردوزی کپڑے بڑی مقدار میں ایران سے خراسان میں درآمد ہوتے تھے (ابجم، ج ۱، ص ۸۹۰) ایسے کپڑے، جن کا رواج اب تک ایشیا میں چلا آتا ہے، اور جن کا رواج نہایت شاندار ہے سمجھ میں آ سکتا ہے، صرف لباس اور فرش وغیرہ کے لیے مستعمل نہ تھے، بلکہ مسجدوں اور مقبروں کے بھی کام آتے تھے۔ عیش و تکلف کے سامان میں زریں کام کے زین، زری کی جھول اور مطلا یراق بھی شامل تھے۔ قیمتی زین مخمل یا ریشم یا زربفت کے ہوتے تھے، جن پر زری کا کام ہوتا تھا۔ باوجود ایشیائی خلیفوں کی یہ چیزیں بڑی حد تک آجکل بھی مستعمل ہیں اور امیرانہ زندگی کی انتہائی شان سمجھی جاتی ہیں۔

[3] ابن تغری بردی ج ۲ ص ۱۹۲

مال کو پنّا الکزینڈرینا[1] کہتے تھے، اور اس کو بے انتہا قیمتی سمجھتے تھے۔ زمانۂ وسطیٰ کے یورپ میں بنوز ایک دور ہر جگہ اس کا رواج تھا۔ وینیس اور جنیوا کے رہنے والے صرف یہی کپڑا ملک شام اور فلسطین کے بندرگاہوں سے لاتے تھے، بلکہ اس کے علاوہ زرتار اور خصوصاً مطرز و زری کے لیے ریشم اور کلابتون بھی درآمد کرتے تھے؛ کیونکہ اُس وقت اہل یورپ ریشم اور کلابتون تیار کرنے کی صنعت سے بالکل ناواقف تھے، اور یہ چیزیں بلا استثنا، مشرق سے لائی جاتی تھیں، جہاں صنعت زردوزی کے رواج کی وجہ سے یہ فن بہت عام اور ترقی یافتہ تھا۔

کلابتون کے متعلق خواہ وہ چپک دار تھا یا کسی اور طرح کا، آج کل صحیح صحیح تحقیق کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا ہے کہ یہ اس طرح بنایا جاتا تھا کہ جو مویشی ذبح کیے جاتے تھے اُن کی رگوں کو خشک کرکے اُن پر سونے کا رنگ چڑھا دیا جاتا تھا۔ ایک زمانے میں ان مطلّا رگوں کی ایک بڑی تعداد ایشیا میں تیار ہوتی تھی؛ اور زمانۂ وسطیٰ کے آخر تک یہ چیز کپڑا بُننے کی غرض سے ایشیا سے یورپ میں درآمد کی جاتی تھی[2]۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ صنعت عراق میں عام طور پر مروّج تھی۔ جہاں مقریزی نے فاطمی خلفاء کے شاندار اور بیش قیمت لباسوں کا حال بیان کیا ہے، وہاں وہ ہمیشہ عراقی مطلّا کپڑوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اُنھوں نے ان لباسوں کے متعلق اتنی تفصیل سے کام لیا ہے کہ کپڑے میں سونے کے تاروں کی تعداد بھی بیان کردی ہے؛ مثلاً ایک عمامے (شاشیہ) کے متعلق، جو زری کا تھا، اُنھوں نے لکھا ہے کہ اس میں عراقی زری کے ستر تار (قصبہ) لگائے گئے تھے[3]، اور ایک مثقال سونے کی تارکشی کی مزدوری ایک دینار تھی۔

جیسے جیسے یہ قیمتی کپڑے زیادہ عام پسند ہوتے گئے، ویسے ہی ویسے ان کی پیداوار میں زیادتی ہوتی گئی؛ اور مختلف مذاق و مزاج کے خریداروں کو خوش کرنے کے لیے اس صنعت میں ترقی کے نئے نئے مدارج اور نئے نئے نمونے ایجاد ہوتے چلے گئے۔

---

[1] Panna Alexandrina

[2] دیکھو بلاک کی کتاب موسومہ "کلیساوی لباسوں کی تاریخ" ج ۱، ص ۲۰۹۔ جزیرۂ قبرص میں اس تجارت کی سب سے بڑی منڈی تھی جہاں ریشمیں کپڑوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

[3] دیکھو کتاب، ایک کا مضمون "ڈوئگ کے کلیسا اور حرم کے مذہبی رسوم کے کپڑے"۔

[4] مقریزی، ج ۱، ص ۴۱۰۔

پردے اور فرش ہم آگے چل کر قالین بافی کی صنعت کا ذکر تفصیل سے کریں گے، یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ قیمتی کپڑوں سے لوگ اپنے مکانوں اور ایوانوں کو سجانے اور آراستہ کرنے کا کام لیتے تھے۔

آگے ہی چل کر کسی موقعے پر ہم بتلائیں گے کہ اس زمانے میں بالعموم، دیواروں پر قیمتی کپڑے لٹکائے جاتے تھے۔ یہ کپڑے زیادہ تر دمشقی، یا زربفت، یا مشجر ہوتے تھے۔ اس صنعت کی ابتداء بھی ایشیا ہی میں ہوئی؛ اور اس میں بھی شروع زمانے سے بڑے ہنر اور بڑی صناعی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے بیش قیمت مشجر بہت جلد فاطمی خلفاء کے دارالخلافہ، قاہرہ، کے محلوں کی زیب و زینت بن گئے۔ اسی وجہ سے اس صنعت میں ترقی بھی ہوئی۔ مشجروں پر ہر طرح کی تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ انسانوں اور جانداروں کی بھی۔ ایک مشجر پر عجیب و غریب صنعت کے ساتھ تمام دنیا کا نقشہ بنایا گیا تھا، جس میں بڑے شہر کا نقشہ مختلف رنگوں سے کھینچا گیا تھا۔ حرمین شریفین، خصوصاً، بہت صاف اور صحیح تھے۔ نقشوں کے نیچے بناوٹ ہی میں سنہرے یا روپہلے حروف سے شہروں کے مختلف حالات کاڑھے گئے تھے۔ حاشیے پر ایک عبارت تھی، جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مشجر فاطمی خلیفہ، المعز، کے حکم سے ۳۵۳ ہجری (۹۶۴ء) میں بنایا گیا تھا، اور بائیس ہزار دینار اس پر لاگت آئی تھی[1]۔

ایک طرف اگر دولت مندوں کے محلوں کی دیواریں ایسے بیش قیمت مشجروں سے ڈھکی رہتی تھیں تو دوسری طرف ان محلوں کے دیوان خانوں میں مسندیں اور فرش بھی اسی قسم کے شاندار قالینوں کے ہوتے تھے۔ ان کے بنانے میں بھی ایشیا کی صناعی ہمیشہ سے بڑے اوج پر رہی تھی، اور ان کی نقل اتارنے کو یورپ والے اپنا سب سے بڑا کمال سمجھتے تھے۔

کاغذ سازی کی طرح پارچہ بافی کی ترقی بھی عربوں کی رہین منت ہے۔

---

[1] مقریزی، ج ۱، ص ۴۱۷ | [2] ایضاً

موازنۂ ہلال و صلیب

از عبدالسمیع خاں بی اے گوہر شاہجہان پوری۔ جس میں یورپین مصنفین کے بیانات کی مدد سے عہد اسلامی کے ترقی تعلیمی کارناموں کا عہد مسیحی کے تمدن و تعلیم سے موازنہ کر کے مسلمانوں کی فوقیت دکھائی گئی ہے۔ قیمت ۱۲/ — الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

غیر مطبوعہ قطعات

(از حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ)

کبھی تو رحم کر اے روزگار نا انصاف — شکستہ خاطر و مایوس و دل فگار ہوں میں
ہوا شکست میں مجھ دل شکستہ کے کیا ہے — نہ ہارِ یار ہوں نے تو بہار ہوں میں

تیری بے صبری سے ہے سارا فساد — مفت ملزم گردشِ افلاک ہے
رزق تیرا تجھ پہ عاشق ہے امیر — دیکھ لے گندم کا سینہ چاک ہے

اک روز کہا پیرِ خرد سے میں نے — کیا بات جہاں میں آدمی رکھتا ہو
جس بات سے مقبولِ جہاں ہو جائے — آیا ہنر و طبعِ ذکی رکھتا ہو
کام اپنی ہی ذات کے صفات آتے ہیں — یا سلسلۂ نسب قوی رکھتا ہو
بولا کہ یہ سب عبث ہے سنتا ہے امیر — ان سب کے عوض زر آدمی رکھتا ہو
حیوان سے بدتر ہے جو مفلس ہو بشر — گو لاکھ صفاتِ ملکی رکھتا ہو
مقدور ہے ساری قدر ہے کوئی ہو — اشراف وہ ہے جو اشرفی رکھتا ہو

قطعہ در وصفِ قلیان

کمر خم آہ بر لب داغ بر سر جوش سینے میں — سراپا یہ بھی مجھ دلسوختہ کی طرح جلتا ہے
بجا ہے شوقِ قلیاں میرے شاہِ حسن کو ہمدم — وہ اس پردے میں بھی مظلوم کی فریاد سنتا ہے

متفرق اشعارِ اردو

نکالی تیغ قاتل نے تڑپ کر ناکہ دل پر — شتاب آئی اٹھا دستِ کرم فریاد و سائل پر
مسافر سے جھگڑتے ہیں فرشتوں سے نہ کر سمجھے — گھڑی بھر چپ پڑا رہنے نہیں دیتے ہیں منزل پر

نقطہ ہے منہ دیکھنے پہ اے دل مدار دونوں کی دوستی کا
جہاں ہوئی آنکھ بند قاتل نہ کوئی تیرا نہ تو کسی کا

اصطلاحات فلسفہ پر تنقید

(از جناب محمد اجمل خاں صاحب ایم اے ایل ایل بی وکیل سابق کچرار اردو الہ آباد یونیورسٹی)

یہ تنقیدی مضمون معہ اُس مراسلہ کے جو مضمون کے ساتھ بغرض اشاعت وصول ہوا ہے نہایت مسرت کے ساتھ درج کیا جاتا ہے مضمون طولانی ہے اس لیے کئی قسطوں میں شایع ہوگا۔ صاحب تنقید کی شکایت اگر صحیح ہے تو ہندوستانی اکیڈمی کا طرز عمل صد درجہ قابل ملامت ٹھہرتا ہے۔ جو اصطلاحات غلط قرار دی گئی ہیں بالکل ممکن ہے کہ رسالہ ہندستانی کے اڈیٹوریل بورڈ یا اکیڈمی کے ارکان عمل و عقد کی رائے میں صحیح ہوں اور تنقید نگار نے جو ترمیمات تجویز کی ہیں وہ نا قابل قبول ہوں لیکن تنقید کی اشاعت سے پہلو تہی کرنا دانائی کہی جا سکتی ہے نہ ادب دوستی۔ اگر یہ مضمون ہندستانی میں شایع ہو جاتا تو غالباً ہندستانی اکیڈمی کا دفتر زلزلہ سے نہ ڈھہ جاتا۔ ملک میں کتنے نوجوان ہیں جو ایسے خشک علمی مباحث پر قلم اُٹھاتے ہیں اور اُن کی ہمت افزائی کرنے کے بجائے اس طرح کا مستبدانہ سلوک اگر روا رکھا جائے تو سوائے قصہ کہانی لکھنے کے کسی سنجیدہ اور ٹھوس علمی کام کی طرف اُنھیں کیا رغبت ہوگی۔

لائق مضمون نگار نے اپنے مراسلہ میں مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق جس بدگمانی کا اظہار کیا ہے وہ غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے وہ خط نہیں دیکھا جس کا ذکر کیا گیا ہے، مگر مولوی صاحب نے جو راے ظاہر کی ہے وہ غالب یہی ہے کہ اُن کی حقیقی راے ہوگی۔ جو لوگ خود سہ ماہی لکھنے کے عادی نہیں ضروری نہیں کہ تماہی کو غلط نہیں جانتے ہوں۔ تمام ماہرین زبان کے خلاف راے ظاہر کرنا بھی چنداں تعجب انگیز نہیں

اکیڈمی کی طرف سے زر کثیر صرف کرکے کئی جلدوں میں انتخاب کلام شعرا مرتب ہوا ہے اُس کی پہلی جلد پر جولائی کے رسالہ اردو میں جو بے لاگ تنقید شایع ہوئی ہے اگر راقم مضمون کی نظر سے گزری ہوتی تو وہ مولوی صاحب پر اکیڈمی کی جانبداری کا الزام نہ لگاتے۔ اس تنقید کے چند جملے یہاں درج کیے جاتے ہیں:—

"ان تمام انتظامات کے باوجود افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اکیڈمی کو اپنے مقاصد میں قطعاً ناکامی ہوئی"

سب سے پہلے ہماری نظر کتاب کی بنیادی ترتیب و تبویب پر پڑتی ہے جو غیر اصولی

اور غیر علمی ہے۔ اس کا لمبا سبب ادب کی تاریخ اور اُس کے ارتقائی رجحانات سے
ناواقفیت ہے:

"مرتب عجیب و غریب پیچیدہ غلطیوں کے شکار ہو گئے ہیں اور قدم قدم پر لغزش کھائی ہے۔
مجموعہ کا پہلا حصہ دکنی شعرا پر مشتمل ہے۔ مرتب نے ان کی ترتیب میں کوئی زمانی و مکانی
التزام رکھا اور نہ دکن کے مختلف صوبوں کے لسانی فروق کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان کی نظر
میں گجرات، بیجاپور، گولکنڈہ اور اورنگ آباد سب برابر ہیں۔"

"پھر مرتب نے بڑا ستم یہ کیا کہ ایک مرکز کے شعرا کو دوسرے مرکز کے تحت درج کر دیا
مثلاً شعرائے احاطہ مدراس و بیجاپور میں صبائی گجراتی اور محمود گجراتی کو بھی شامل کر دیا۔
حالانکہ مدراس اور گجرات میں ہر لحاظ سے بعد المشرقین ہے۔"

"کتاب کی غیر اصولی ترتیب و تبویب اور انتخاب کے بعد ہماری نظر فاضل مرتب کی ان
آزادانہ اور بے لگام آرا و تنقیدوں پر پڑتی ہے جو بعض بنیادی مسائل کے حق میں صادر
ہوئی ہیں .... ایسی حالت میں فاضل مرتب کی رائے کیا وزن رکھتی ہے۔"

"مرتب نے شعرا کے حالات وغیرہ اور ان کے اسما و سنین تک میں غلطیاں کی ہیں
حالانکہ بہت سے تذکرے چھپ چکے ہیں اور جن شاعروں کا ذکر اس کتاب میں ہے
ان پر متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ اس پر بھی مرتب "ہنوز روز اول" کا شکار ہیں۔
اس قسم کی بیشمار غلطیاں ہیں۔"

"غلطیوں کے اسباب ہمارے خیال میں تین قسم کے ہیں (۱) غیر معتبر ماخذات (۲)
حوالوں اور اصل کتابوں کی کمی (۳) عجلت اور ہیجان میں اور تحقیق و تدقیق سے بیگانگی۔"

"مرتب ضروری تاریخ سے بھی واقف نہیں اور نہ وہ اس سے واقف ہونے کی
زحمت اٹھانی گوارا کرتے ہیں۔"

اس کے بعد بعض "مضحکہ خیز" غلطیوں کا تذکرہ ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ

"ہم نے یہ تبصرہ بہت ہی روا روی میں لکھا ہے۔ اگر اس انتخاب کا زیادہ غور سے
مطالعہ کیا جاتا تو یقین ہے کہ غلطیوں کا ایک دفتر ہو جاتا۔"

اور خاتمہ یہ ہے کہ

"اس کی تیاری کے لیے نہ تو ادبیات اردو کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا گیا اور نہ

[illegible] کے منتخب کرنے میں کی گئی:
اقتباسات بالا سے صاف عیاں ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب اور اکیڈمی کے درمیان کوئی مخالفت
نہیں ہے ۔ بلکہ جو کچھ ہوا اس کی تمام تر ذمہ داری اکیڈمی پر ہے یا اکیڈمی کے کارکنوں پر جو کہ
[illegible] پر۔ ایڈیٹر

جناب اڈیٹر صاحب الناظر لکھنؤ۔

تسلیم۔ مضمون ذیل ہندوستانی اکیڈمی کے عام سالانہ جلسہ منعقدہ [illegible]
میں پڑھا گیا تھا۔ جلسہ میں اس کی بہت زیادہ تعریف بھی کی گئی تھی۔ اور شایع کرنے کے واسطے
مجھ سے لے لیا گیا تھا۔ اکیڈمی کا سہ ماہی رسالہ بھی جاری ہوا اور اس کے بہت سے نمبر بھی نکل چکے
لیکن یہ مضمون شایع نہ کیا گیا۔ بعض حضرات نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ چونکہ آپ کے مضمون میں اصطلاحات
علمیہ مجوزۂ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) کی تنقید ہے۔ اس وجہ سے ہندوستانی اکیڈمی اس کو
کبھی شایع نہ کرے گی۔ اور اس خیال کی تائید میں ایک خط مولوی عبدالحق صاحب رکن انجمن ترقی اردو کا
دکھایا۔ جو انھوں نے ایک ادبی استفسار کے جواب میں ایک مستفسر کو لکھا تھا۔ جس میں لفظ
ہندوستانی اور تباہی کے متعلق اپنی رائے تحریر کی تھی۔ اور جس کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ
سوال از آسمان جواب از ریسماں کا مصداق بن کر خواہ مخواہ کے لیے انھوں نے ہندوستانی اکیڈمی
کی جانبداری میں تمام ماہرین زبان اردو کے خلاف۔ بلکہ اپنے طرز عمل کے بھی خلاف رائے
تحریر کی ہے۔ جس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ جب رکن انجمن ترقی اردو، ہندوستانی اکیڈمی کی طرفداری
میں اپنے ضمیر کے خلاف رائے دینے کے لیے تیار ہو گئے تو یقیناً ہندوستانی اکیڈمی کو بھی دنیا کی رسم
کے موافق انجمن ترقی اردو کا کچھ نہ کچھ خیال کرنا ہی پڑے گا۔ اس بنا پر میں نے ہندوستانی اکیڈمی
سے اپنا مضمون واپس مانگا۔ اور اس کے واپس کر دینے سے اس کی تصدیق بھی ہو گئی کہ واقعی
ہندوستانی اکیڈمی کا قصد اسکے شایع کرنے کا نہیں تھا۔ ہندوستانی اکیڈمی کے اس طرز عمل سے
اگرچہ کچھ شکایت ہو تو بیجا نہیں ہے۔ گو علمی معاملات میں اختلاف رائے کسی مخالفت کا باعث
نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک ایسے معزز ادارے کی تنگ خیالی ضرور قابل افسوس ہے۔ اور اگر یہ
خیال کر لیں کہ میرا یہ مضمون ہندوستانی اکیڈمی کے انتخاب کے قابل نہیں تھا تو اس وقت اور بھی
ہندوستانی اکیڈمی کی حالت قابل افسوس ہو جائیگی۔ کیونکہ ناظرین کے سامنے ہندوستانی اکیڈمی

۔ رسالہ کے سب نمبر موجود ہیں۔ شاید ملک کا ایک شخص بھی اس کے کہنے کے لیے تیار نہ ہوگا کہ جو
مضامین ان رسالوں میں چھپے ہیں اُن کے مقابلے میں میرا یہ مضمون ملک اور زبان کے لیے کچھ کم مفید ہے۔ صرف
تنقید ہے، مقصد اس پر کہ سہرا میرے سر بندھے گا شہرت ہو، ایک مضمون نگار کو بیس روپیہ اکیڈمی سے مل جانے (ملاحظہ
۔ اخبار روشنی) اور اصطلاحات علمیہ کے متعلق الفاظ کی تجویز جس کی ملک کو بے حد ضرورت ہو رہی ہے
قابل انتخاب بھی جائے۔ کیا الہ آباد کے حامیان اصطلاح ہندوستانی اکیڈمی کے نزدیک بہت اہم
اور قابل معاوضہ کام ہے اور تمام ملک کو اس سے نفع پہنچ سکتا ہے اور اصطلاحات علمیہ کے متعلق
الفاظ کی تجویز بالکل ردی اور غیر مفید کام ہے۔ بہر حال میں آپ کے رسالہ میں اس مضمون کو اشاعت
کے لیے بھیجتا ہوں کہ پہلے اصطلاحات علمیہ کے متعلق میری تجویز پر غور کیجیے۔ اگر قابل قبول ہوں
تو اس پر عمل کریں اور اگر ان میں کچھ غلطی ہو تو مجھے مطلع کیجیے۔ بہ منت [illegible]

اجمل

موجودہ حال

حضرات!

آپ سب جانتے ہیں کہ یہ عرصہ [illegible] کئی سال سے جن اصطلاحات فلسفہ پر تنقید کی
ہے وہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کے زیر سرپرستی شائع کی گئی ہیں۔ اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہر فن
فن فلسفہ ان اصطلاحات کا ترجمہ کریں۔ مترجمین نے چند مخصوص کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ اور ہر کتاب کے آخر
میں ایک فہرست اُن اصطلاحات کی درج کی ہے جن کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں مع ان عجیب و غریب
ترجموں کے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں متداول ہیں اور طالب علموں ہی تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ عامۃ الناس
بھی ان اصطلاحات کے اثرات سے محفوظ نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک زبان کی وسعت اور ترقی صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ اس میں جملہ علوم
و فنون کی اصطلاحات موجود ہوں اور علمی مضامین اس زبان کے ذریعہ سے بآسانی ذہن نشین ہو سکیں۔
اردو میں زوال سلطنت کی وجہ سے علوم و فنون کا سرمایہ کافی جمع نہ ہو سکا۔ لیکن اب بھی خواہان اردو اس
امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ اردو زبان ایک علمی زبان بن جائے اور مغربی علوم و فنون کا سرمایہ بھی اس زبان
میں (جسے ہندوستان کی عام زبان ہونے کا فخر حاصل ہے) منتقل ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا
کہ اس زبان میں جملہ خیالات کے اظہار کے لیے کافی الفاظ جمع کر دیے جائیں۔ اور سب سے پہلے اصطلاحات
وضع کیے جائیں۔ تاکہ ترجمہ کرنے والوں کو آسانی ہو اور محققین کو زبان کی تنگی نئی تحقیقات سے نہ روک سکے

اور سب سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہو کہ اُردو داں طالب علم بغیر کسی انگریزی تعلیم کی مدد کے علوم جدیدہ سے فائدہ حاصل کر سکیں۔

پیش نظر جو اصطلاحات ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ ترجمہ کرنے والوں نے کسی ایک اصول کو مدِ نظر نہیں رکھا۔ بلکہ بطور خود جو ترجمہ مناسب سمجھا، لکھ دیا۔ انجمن ترقی اُردو نے ملک پر یہ احسان کیا کہ ان مختلف ترجموں کو (جو الگ الگ اصولوں کے ماتحت کیے گئے تھے۔ ایک کتابی صورت میں شایع کر دیا۔ اور اس کا نام "فرہنگ اصطلاحاتِ علمیہ" رکھ دیا۔ فرہنگ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی اصطلاح کا ترجمہ کسی مترجم نے کچھ کیا ہے اور کسی نے کچھ۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترجموں پر کسی رکن انجمن نے نظرِ ثانی فرمانے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ اور اس طرح اعتراض کرنے والوں کے لیے نکتہ چینی کا کافی مواد مہیا کر دیا۔

میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ جن اصطلاحات پر میں نے قلم اُٹھانے کی جرأت کی ہے وہ سب کی سب غلط ہیں۔ بلکہ میں نے چند اصول قائم کیے ہیں جو ایسے عام اصول ہیں کہ ترجمہ کرنے اور اصطلاحات وضع کرنے میں اُن کے بغیر چارہ نہیں۔ ان اصولوں کی کسوٹی پر نصف سے زیادہ اصطلاحات کھری نہیں اُترتیں۔ اور ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اُن کی اصلاح کر دی جائے۔

جن اصولوں کی میں نے پیروی کی ہے وہ درج ذیل ہیں:-

(۱) اگر اُردو میں پہلے سے کوئی اصطلاح موجود ہے، تو نئی اصطلاح نہ گڑھنا چاہیے۔

(۲) اگر ہندی یا فارسی میں کوئی اصطلاح مل سکے۔ تو دوسری غیر آرین زبانوں کے الفاظ کو ترک کر دینا چاہیے۔

(۳) جہاں تک ممکن ہو ایسی اصطلاحات وضع کرنا چاہیے جو عام فہم اور با محاورہ ہوں اور ثقیل و پیچیدہ نہ ہوں۔

(۴) بسا اوقات لغوی ترجمہ مہمل ہوتا ہے۔ مثلاً ڈیورا میٹر (Dura Mater) کا ترجمہ "اُم جافیہ" یا "سخت والدہ" کیا گیا ہے۔ یہ ایک سخت دماغی جھلی ہوتی ہے۔ "سخت والدہ" سے کوئی اس مفہوم کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے کوشش کرنا چاہیے کہ ترجمے سے پورا مفہوم ادا ہو سکے۔ اور اگر ممکن ہو تو لفظی ترجمہ بھی ہو جائے۔

مندرجۂ بالا اصولوں کے ماتحت میں نے "فرہنگ" کی اصطلاحاتِ فلسفہ پر نظر ڈالی ہے اور اُن میں مندرجۂ ذیل خامیاں اور غلطیاں پائی ہیں:-

[illegible] مفہوم پر حاوی نہیں ہیں۔

(۲) کچھ ترجمے ایسے ہیں جو یونانی یا لاطینی مادہ کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔ اور اگر مادہ صحیح بھی ہے تو پورے مفہوم پر حاوی نہیں۔

(۳) بعض ترجمے بہت زیادہ ثقیل ہیں۔

(۴) کچھ ترجمے مولوی وحید الدین سلیم مرحوم کے "سبقاً حی" اصولوں پر گھڑے گئے ہیں۔ جو تقریباً مہمل ہیں۔

(۵) کچھ ترجمے ایسے ہیں جو ہر اعتبار سے غلط ہیں۔

(۶) اکثر ترجموں میں یہ خرابی موجود ہے کہ ایک ماہرفن نے ایک ترجمہ لکھا ہے اور اسی اصطلاح کا ترجمہ دوسرے ماہرفن نے دوسرا لکھا ہے۔ اور مرتب یا مؤلف نے ایسی غلطیوں کو دور نہیں کیا۔

سب سے آخر میں ضروری التماس یہ ہے کہ ملک میں غلط اصطلاحات کا رائج کرنا علوم وفنون کو ترقی دینے کے بجائے اُن کو نقصان پہونچاتا ہے۔ خصوصاً اس حالت میں جبکہ یہ اصطلاحات خاص طور پر یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے وضع کی گئی ہوں۔ انجمن ترقی اردو نے اُردو کو مالا مال کرنے اور اُسے علمی زبانوں کی صف میں کھڑا کرنے کی جو کوشش مسعود کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ غالباً تبصرۂ ہذا کو دیکھنے کے بعد کارکنان انجمن اس نتیجے پر پہونچ جائیں گے کہ ترجمہ کرنے سے پہلے کچھ اصولوں کا تعین ضروری ہے تاکہ مترجمین اُن کی پابندی کریں اور باہم اختلاف نہ ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ انجمن موصوف ایک انگریزی اُردو لغت کی تیاری میں مصروف ہے۔ اور اس قسم کی مستند لغت کی ملک کو ضرورت بھی ہے۔ لیکن اگر اس میں بھی انفرادی کوششوں کو جمع کردینے ہی پر اکتفا کی گئی۔ اور مکرر و سہ کرر نظرِ ثانی نہ کی گئی تو کثیر تعداد میں غلطیوں کا سرزد ہونا بعید نہیں۔ اس لیے میں دوبارہ انجمن ترقی اُردو کو توجہ دلاؤں گا کہ اس قسم کے ترجموں کو بغیر کافی تحقیق کے ملک کے سامنے نہ پیش کرے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

اوراق ہذا میں "فرہنگِ اصطلاحاتِ علمیہ" کی جملہ اصطلاحاتِ فلسفہ پر تبصرہ کرنے کے بعد صرف اُن اصطلاحات کا بدل پیش کیا گیا ہے، جو میری رائے میں صحیح طور پر ترجمہ نہیں کی گئیں۔ اور جو اصطلاحیں صحیح ترجمہ ہوئی ہیں اُن کو میں نے اس مضمون میں شامل نہیں کیا۔ اس طرح تقریباً نصف اصطلاحیں غلط ثابت ہوتی ہیں۔ یہ بات نہ تو مترجمین کے لیے باعثِ افتخار ہوسکتی ہے اور نہ انجمن ترقی اُردو کے لیے۔

فرہنگِ اصطلاحات میں فلسفہ کی جو اصطلاحیں جمع کی گئی ہیں وہ مکمل نہیں ہیں۔ اور چونکہ

الگ الگ کتابوں کے ضمیموں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ اس لیے جملہ اصطلاحیں بہ ترتیب حروف تہجی نہیں جمع ہو سکیں۔ بلکہ اخلاقیات کی اصطلاحیں الگ ہیں اور مابعد الطبیعیات کی الگ۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ فلسفہ کی جملہ اصطلاحات کو بہ ترتیب حروفِ تہجی لکھا جاتا۔ تاکہ طالب علم کو تلاش اصطلاح میں دقت نہ ہوتی۔ اور ہر ایک فن میں بار بار ایک ہی اصطلاح کا ترجمہ درج کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ مثلاً "تصور" منطق کی بھی اصطلاح ہے اور نفسیات کی بھی۔ اس لیے اس کا ہر جگہ درج کرنا ضروری [illegible] بلکہ خطوط وحدانی میں مخصوص اصطلاحوں کے سامنے (منطق) یا (اخلاق) یا (نفسیات) یا ان الفاظ کا مخفف لکھا جا سکتا تھا۔ بہر حال میں نے منطق۔ اخلاقیات۔ مابعد الطبیعیات اور نفسیات پر ان اصطلاحات کا الگ الگ ضمیموں کی صورت میں اضافہ کر دیا ہے۔ جو "فرہنگ" میں موجود نہیں ہیں۔

نفسیات ایک ایسا مضمون ہے جس میں روزانہ نئی نئی باتوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لیے نفسیات کی کتابیں اور اصطلاحیں روز افزوں ترقی پر ہیں لہذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میری فہرست مکمل ہے اور نہ ایسی صورت میں ہو سکتی ہے۔

امید ہے کہ آپ اصطلاحات کے اہم مسئلے پر کافی توجہ فرمائیں گے۔ اور میری کوتاہیوں اور خامیوں کی اصلاح فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

علم الاخلاق

تنقید بر اصطلاحات مترجمۂ جناب مولوی عبد الباری صاحب ندوی پروفیسر فلسفہ کلیہ جامعۂ عثمانیہ

شمار	اصطلاح انگریزی	اصل ترجمہ	ترجمۂ جدید	تشریح
1	Altruism	اخوانیت	ایثار۔ غیر پرستی	ایثار اُس سلک اخلاق کو کہتے ہیں جو دوسروں سے محبت کرنا بتاتا ہے اسے غیر پرستی بھی کہہ سکتے ہیں جس کی ضد خود پرستی یا انانیت ہے۔ لاطینی مادہ alter کے معنی بھی غیر کے ہیں۔
2	Ascetic	مرتاض	زاہد	
3	Asceticism	مرتاضیت	زہد	
4	Attainment catastrophe	حصولِ [illegible]	حصول آخر	catastrophe کے معنی [illegible]

نمبر	English	اصطلاح	متبادل	کیفیت
				ایک مخصوص واقعہ جو ایک سلسلۂ واقعات کو ختم کردے۔
۵	Causist	کازستائیہ	ضمیر پرست	
۶	Causistry	کازستائیت	ضمیر پرستی	
۷	Beyond good or evil	ماورائے خیر و شر	نیکی اور بدی سے بالاتر	
۸	Conduct	کردار	چلن	کردار ترجمہ ہے Character کا
۹	Categorical	اطلاقی	قطعی۔ حتمی	اطلاق کے معنی ہیں آزاد کرنا۔ رہا کرنا اور گفتگو کرنا۔ اطلاقی غلط ترجمہ ہے۔
۱۰	Celibacy	تجرد۔ عزوبت	کنوارا پن	
۱۱	Cosmopolitan	ہمہ وطن	جہاں باش۔ غیر متعصب	
۱۲	Cosmopolitanism	ہمہ وطنیت	جہاں باشی۔ بے تعصبی	
۱۳	Decision	عزیمت	فیصلہ	عزیمت کے معنی ہیں مصمم ارادہ کرنا۔
۱۴	Discipline	قاعدہ	نظام	
۱۵	Evil	شر	بری۔ بد۔ برائی	
۱۶	Egoism	انائیت	خودی۔ خود پرستی۔ اہنکار۔ انانیت	
۱۷	Ethnology	علم الاقوام۔ قومیات	نسلیات	یعنی انسان کی مختلف نسلوں کا علم۔ قوم اور نسل میں فرق ظاہر ہے۔
۱۸	Ethology	علم السیرت	اخلاقیات۔ سیرت	Ethos اخلاق کو کہتے ہیں۔
۱۹	Fanatic	جوشمند	جوشیلا	
۲۰	Good	خیر	نیک۔ نیکی	
۲۱	Good will	ارادۂ خیر	نیک اندیشی	
۲۲	Idea	تصور	خیال۔ پندار	تصور کی انگریزی Percept یا Image ہو سکتی ہے!
۲۳	Ideal	نصب العین	خیالی	

نمبر	English			
۲۴	Idealism	تصوریت	خیالیت	
۲۵	Idealists	تصوریہ	خیالیہ	
۲۶	Imperative	امر	لازم۔ ضروری	علم صرف کی اصطلاح میں امر کہتے ہیں
۲۷	Intuition	وجدان	حدس	وجدان نفس کی قوت باطنی کو کہتے ہیں اور حدس ایک منطقی اصطلاح ہے جو بغیر استدلال کے کسی حقیقت کے معلوم ہونے کا نام ہے دوسرے الفاظ میں الہام کہتے ہیں
۲۸	Intuitionists	وجدانیہ	حدسیہ	
۲۹	Intuitionism	وجدانیت	حدسیت	
۳۰	Incompleteness	ناتمامی	نقص	
۳۱	Individualism	انفرادیت	فردیت	(Individual) کا ترجمہ فرد ہے
۳۱	Instinct	جبلت	محرک فطری طبیعت۔ رجحان	اس لفظ کا مادہ (Instinguo) ہے یعنے ڈنک مارنا محاورۃً باطنی ترغیب یا بے چینی کو کہتے ہیں لیکن جبلت کا ترجمہ آفرینش ہے۔ (اکثر مراد)
۳۳	Infinite	لا محدود	بے پایاں	
۳۴	Impulse	تہیج	محرک۔ خواہش	
۳۵	Institutions	شعائر	ادارات	
۳۶	Liberty	اختیار	آزادی	آزادی کے معنی ہیں آزادی عمل یا آزادی ارادہ۔
۳۷	Luxury	عیش پرستی۔ تعیش	تنعم	تعیش عیش پرستی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
۳۸	Necessitarianism	ضرورت۔ وجوبیت	قدر۔ اختیار	یعنی وہ مسلک اخلاق جو انسان کے ارادہ کو آزادی عمل پر قادر سمجھتا ہے۔
۳۹	Necessitarians	ضروریہ۔ وجوبیہ	قدریہ	

۴۰	Objective	واقعی۔ خارجی	ظاہری۔ خارجی	خلاف باطنی و داخلی کے۔
۴۱	—— Right	صائب واقعی	حق ظاہری	
۴۲	Perseverance	استقلال۔ مواظبت	ثبات	
۴۳	Prudence	حزم۔ دانائی	احتیاط۔ حسن تدبیر	
۴۴	Pedagogics	تعلیمیات	ملائیت	وہ طریقے جو ملاؤں کی تعلیم کے ہوتے ہیں۔ آجکل حقارت کے معنی رکھتا ہے۔
۴۵	Passion	جذبہ	جوش۔ ہیجان	کسی جذبہ کی انتہائی حالت۔
۴۶	Pessimism	یاسیت	تشاؤم۔ بدفالی۔ مردہ دلی	
۴۷	Pessimists	یاسیہ	متشائم۔ بدفال۔ مردہ دل	
۴۸	Reflection	فکر۔ نظر	بچار۔ تامل۔ اندیشہ	
۴۹	Right	حق صائب	حق	یہ لفظ بحیثیت اسم نکرہ کے مشتق کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ صائب کے معنی ہیں پہنچنے والا۔ رسا۔ رسندہ۔ جو اس جگہ غلط ہے۔
۵۰	Sophists	سوفسطائیہ	دھوکہ باز	
۵۱	Subjective	ذہنی۔ شخصی	باطنی۔ داخلی	
۵۲	—— Right	صائب شخصی	حق باطنی	
۵۳	Satisfaction	تشفی	اطمینان۔ تسلی	تشفی کی انگریزی ہے ...solation
۵۴	Utopia	یوٹوپیا	جنت خیال	
۵۵	Wisdom	حکمت	عقل	یونانی فلسفہ میں (...isdom) کے معنی فلسفہ کے بھی تھے۔ اس...

			سے عربی مترجمین نے اس کا ترجمہ حکمت کیا ہے۔ حالانکہ اس کے معنی عقل کے ہیں۔

وہ الفاظ جنکا ترجمہ فاضل مترجم نے نہیں درج کیا۔ یعنی اُن اصطلاحات کو اپنی کتاب میں استعمال کیا ہے۔ مگر تتمہ میں ان کا انگریزی ترجمہ نہیں دیا:

کردار	Character
جمالیات	Asthetics
جزمی علوم	Sure sciences or Axiomatic Sciences

(اسکے بعد اصطلاحاتِ منطق مترجمۂ جناب مولانا عبدالماجد صاحب بی اے، اصطلاحاتِ اصول نفسیات مترجمۂ جناب پروفیسر سید ولی الرحمٰن صاحب ایم اے، اور اصطلاحاتِ طبیعیات مترجمۂ جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے ہیں، جو آیندہ نمبر میں درج ہوں گی۔ اور آخر میں صاحبِ مضمون نے اُن اصطلاحات کا ترجمہ خود پیش کیا ہے جنکے ترجمے فرہنگ مصطلحات میں درج نہیں ہیں یہ اصطلاحات اتنی ہیں کہ غالباً دو نمبروں میں شایع کی جا سکیں گی۔ - ایڈیٹر)

تازہ غزل

(از جناب مولانا حسرت موہانی)

دل کو غمِ کونین سے بیگانہ بنا دے — اے جلوۂ جاناں مجھے دیوانہ بنا دے

بدمستِ سیہ کار کہ مخمورِ حق آگاہ — دیکھیں ہمیں کیا ساقیِ میخانہ بنا دے

حالت ہے فقیرانہ مری در شہِ خوباں — چاہے تو فقیرانہ سے شاہانہ بنا دے

دنیا کے لیے ہو سبقِ رشد و ہدایت — گر عشق مرے حال کا افسانہ بنا دے

فرزانگیِ ہوش سے بیزار ہے حسرت
حیرت اُسے دیوانۂ فرزانہ بنا دے

ہائے ریاضؔ مرحوم

(از جناب پروفیسر سید علی احسن صاحب احسنؔ مارہروی)

ریاضؔ کا مرنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں! وہ بڈھے تھے، اور بوڑھوں کو مرجانے کے سوا کوئی مرحلۂ **زندگی باقی نہیں** رہتا ہے۔

کہ پیرِ دہ سالہ پیرِ دیگر نیست

ہاں تعجب و حسرت یہ ہے کہ پاؤ گے دوسرا نقش ریاضؔ ● گل ہزاروں ہیں ایک صورت کے۔

مصحفیؔ نے صحیفۂ حیات کی ورق گردانی ختم کی، تو اسیرؔ دنیائے شاعری میں وابستۂ شہرت ہوئے، اسیرؔ جب قید زندگی سے آزاد ہوئے، تو امیرؔ با توقیر سریر آرائے سخن ہوئے۔ امیرؔ گوشہ گیر غربت ہوئے تو ریاضت ریاضؔ کی بدولت شاعری کا خزاں رسیدہ چمن گلکدۂ بہار بن گیا۔ اب بجز خارزار کچھ نظر نہیں آتا۔ دنیا دورہے، نئی پود ہے، نئی روش ہے، نیا طرز ہے، دیکھیے اردو کا عجیب الخلقت شتر بے مہار کس کل بیٹھتا ہے!!

مینائے سخن کے مرشد مرتاض لسان الملک حضرت ریاضؔ حلقۂ ادب میں کیا مرتبہ رکھتے تھے؟ ایک طویل اور لطیف داستان ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس باب میں سیر حاصل مضامین لکھے جائیں لیکن یہ کام ایک کے بس کا نہیں۔ مرحوم کے خصوصی اخلاق اور عمومی اشفاق نے کس طرح دنیا کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے ہیں۔ اُن کے حالات و خصوصیات ہر شارف کی طرف سے سپرد قلم ہوتے رہیں تو بہتر و انسب ہے۔ ریاضؔ عام طور سے صرف شاعر سمجھے جاتے ہیں، اور ایسا سمجھنا بجائے خود بیجا نہیں، لیکن بہت کم افراد کو اس سے آگاہی ہوگی کہ انہیں منظوم سخن آرائی کی طرح منثور عبارت آرائی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ حرم سرا اور دوسرے ناولوں کے علاوہ ریاض الاخبار کے مطالعہ سے انکی خصوصیت نثر نگاری معلوم ہوسکتی ہے، اور فتنہ و عطر فتنہ کی ہنگامہ آرائیوں نے تو اپنے زمانۂ شباب میں قیامت ہی ڈھا رکھی تھی۔

یہاں اُنکے تین مختصر خطوط درج کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ نجی اور بے تکلفانہ تحریریں ہیں لیکن یہی وہ چیزیں ہیں جس سے نفسیاتی اصول پر اندرونی جذبات کے جوہر دوسروں کو صاف صاف نظر آسکتے ہیں۔ اگر ناظرین اختر نے اس تحریک میں حصہ لیا، اور اپنی اپنی معلومات کے مطابق اُنکے واقعات و حالات نیز مکالمات و مراسلات شائع کرتے رہے تو ایسے اوراق اُن کی مکمل سوانح عمری کے لیے بہترین ذخیرہ ثابت ہونگے۔

مرحوم کے ساتھ میرے تعلقات خصوصی کو کم و بیش ۴۰ برس کا زمانہ گزرا۔ تقریباً بیس برس تک

نسبت ملاقات کا سلسلہ قائم رہا اور یہ مدت زیادہ تر اخباری و ادبی دنیا و رسائل کے مطالب و تعارف تک محدود رہی۔ لیکن جب صوری اور مکمل ملاقات کے بعد تمام حجابات نا آشنائی اٹھ گئے۔ اس وقت سے جتنی ملاقاتیں ہوئیں اور جس قدر خط و کتابت کا موقع ملا، خصوصیات باہمی میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔ اور ہر مکالمت و مراسلت میں محبتی رنگینی نے ایسے گہرے اور پائدار نقوش قلوب میں جمادئیے جو کبھی مٹنے والے نہیں۔ انھیں دلنشین نقوش کا ایک دھندلا سا خاکا ان تحریروں میں نظر آئے گا۔

۱۲ مارچ ۱۹۳۱ء کو میرے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں: —

مکرمی۔ کاغذ زر ہاتھ آنے سے اتنی خوشی نہیں ہوتی، جتنی آپ کے خط سے۔ جواب میں تاخیر اس لیے ہوئی، پانچ روز ہوئے دو دست آئے۔ تیسری مرتبہ جانے پر دست نہیں آیا غش آیا۔ خفیف اجابت سے فارغ ہو کر واپس ہونے کو قدم اٹھایا تھا کہ سنبھلتے قدمچوں پر بائیں کروٹ دراز تھا۔ نہ قدمچوں کے نیچے نالی میں گرا نہ قدمچے کے اندر، ورنہ رخصت تھا۔ بائیں ہاتھ اور دہنے پاؤں میں زخم، دو رات دن بستر استراحت پر رہا۔ اب بفضلہ اچھا ہوں، سب بچے بھی اچھے ہیں، ان کے ماں باپ بھی۔

آپ علیگڈھ آنے کے لیے اصرار کر رہے ہیں میرے کرم! میں ہرگز سفر نہیں کر سکتا۔ اس خیال کو قطعاً جانے دیجیے، امکان ہوتا تو میں خاطر شکنی کبھی روا نہ رکھتا۔ آپ جب لکھنؤ آئیں مجھے لکھیں، ضرور لکھنؤ آؤں گا۔ خدا آپ کے اس مشاعرے کو بھی کامیاب کرے۔

کاش ریاض و احسن کبھی جدا نہ ہوتے، خدا آپ کو اتنا دے رنے کہ میں آپ کے پاس بسر کر سکوں۔ اب بہت ضعیف ہو گیا ہوں اور ضرورت سے زیادہ مفلس، ضرورت والا ہی کا سخن تکیہ ہے، موقع ہو یا نہ ہو جلد جلد مجھے یاد کرتے رہیے والتسلیم۔ رستا ایک ناتمام غزل کا ایک شعر

ہماری زمزمی میں آب زمزم بھی ہے دو شے بھی — ہوئے ہیں جمع اس میں آگ پانی دیکھتے جاؤ

آپ نزدیک ہوتے تو ایک شعر سنانے کے سو روپے طلب کرتا، کم سے کم آپ مولوی سبحان اللہ خاں صاحب ہوتے۔

(ریاض)

سال پیوستہ مارہرے میں ایک مشاعرہ کیا گیا تھا، جس میں اکثر مشاہیر کرام نے تشریف لائے تھے۔ ان سے بھی باصرار درخواست کی گئی کہ تشریف لا کر تمنائے دیرینہ پوری کیجیے۔ اس کا جواب ۱۹ مارچ ۱۹۳۲ء کا لکھا ہوا حسب ذیل ہے: —

کرم! دیوانہ بنانے والے الفاظ آپ کے محبت نامے میں میری نظر سے گزرے۔ میں تو خود کو حسن کا زر خرید سمجھتا ہوں، دیوانہ بنائیں، فرزانہ بنائیں، ہر طرح بنائیں۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔ مجھے شوق ہے، چوری چوری آپ کی موجودگی و دلیر کی موجودگی کا پتا لگا کر میں کسی کیسی طرح ۔۔ پہنچ جاؤں اور یہ شعر سناؤں۔

لب ہلے بند تب آہستہ ادا کرنے کو تھے — چوری چوری کچھ نہ پوچھو رات کیا کہنے کو تھے

یہ شعر نشاندہی ہم کہ حیاں تو راہ گم نہ کند۔ مجھے کبھی لکھ بھیجیے گا۔ کس کا شعر ہے۔ طرح پر غزل کہنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں تک لکھ کر میں نے مطبوعہ دعوت نامہ دیکھا۔ اس میں ۵۔ اگست تحریر ہے۔ ۵ اگست تو سر پر آ گئی۔ مجھے کم سے کم ۲ روز کی فرصت درکار ہے۔ بہرحال انتہائی کوشش سے کام لوں گا۔ آپ نے غلطی کی۔ مجھے (۱۰) شعر معاوضہ دینے کو لکھ دیا ہوتا۔ دنیا کے کام چھوڑ کے مصروف کار ہو جاتا۔ آیندہ کے لیے (۱۰) فی شعر سہی۔ یہ تو استدعا نہیں کہ پیشگی محض موقع دینے کے لیے کہ لالچ میں پڑ کر اور پھر خود بدولت امداد فرزندم کے لیے غلط سہارا ہوں کہ مصروف کار ہو جاؤں۔ مصروف کار آپ سمجھے! مصروف کار انتہائی لذت کے خاص موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ آپ سے ملنے کو بہت ہی جی چاہتا ہے، اور جب تک دلیر بھی موجود ہوں۔ دلیر کے مزاج و مذاق سے نا آشنا ہوں۔ بہرحال وہ میری بزرگ داشت میں کوتاہی کبھی نہ کریں گے۔ آپ مجھے اپنا بہت مشتاق سمجھ کر کہیں خیر آباد نہ تشریف لے آئیے گا۔ اس خیال سے میں ڈر گیا۔ میں ہرگز آپ کا متمنی نہیں ہوں۔ نہ آپ سے مجھے لطف ہے۔ میں دنیا سازی کے برتاؤ سے ایسے فقرے لکھ دیا کرتا ہوں کہ آپ خوش ہو جائیں، اور میں اس طرح آپ کو بنا کر، دیوانہ بنانے والے آپ کے الفاظ کا بدلہ لے لوں۔ کارڈ ختم، مضمون ختم۔ دلیر کے سلام کا جواب سلام زیادہ کچھ نہیں۔ (ریاض۔ خیرآباد۔ ۲۹ر جولائی سنہ ۱۹۳۳ء)

شاعرہ مذکور میں خود نہ آ سکے لیکن میری خاطر سے تازہ غزل کہہ کر بھیجی اور اسکے ساتھ یکم اگست کی لکھی ہوئی یہ تحریر بھی:-

کرمی۔ کل ۳۱ر کو غزل کہی۔ غزل کیا بدنما قافیہ پیمائی کی۔ اس امید پر کہ آپ اور دلیر صاحب میری غزل درست فرما لیں گے۔ تو یہ فرمائی کا موقع نہ ہو تو چاک فرما دیں۔ میں تو اب کہنے پڑھنے سے مجبور ہو رہا ہوں۔ طرح مشاعرہ اور زمین اچھے قافیوں کے ساتھ بہت شگفتہ ہے۔

انشاء اللہ شاعرہ بہت کامیاب رہے گا۔ اپنی غزل اور دلیر کی غزل بھیجتا ہوں، پرچے کا منتظر رہوں گا۔ اتحاد دورِ جدید شاعری کو شائع دیتا ہے۔ اس دس سال کے پاس شمارہ بڑھے والے بہت ہی اشعار ہو کر بہت ہی بے شعور نکلے۔

میں اپنے مصائب میں مبتلا ہوں، یہ آخری وقت بہت ہی تلخی سے گزر رہا ہے۔ امراض بھی، افلاس بھی۔ اللہ رحم کرے۔ ریاض۔ یکم اگست ۱۹۳۳ء

لسان الملک کی نثر نگاری میں فصاحت و بلاغت کی گنگا رواں چمنستانِ ادب کے لیے سدا بہار رہی ہوئی ہیں۔ ان مختصر ادبی مکاتیب بھی خطوط سے پورا اندازہ نہیں ہو سکتا پھر بھی تحریر کی روانی، الفاظ کی برجستگی اور عبارت کی شوخی (جسے مرحوم کی طبیعتِ ثانیہ کہنا چاہیے) نقطے نقطے، حرف حرف اور لفظ لفظ سے نمایاں ہے اور یہی بات حضرت ریاض کے کمال کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

انکی رحلت کا سانحہ سننے کے بعد سے اس وقت تک جو حسرت آمیز کیفیت مغلوب کیے ہوئے ہے وہ کہنے میں نہیں آسکتی، شعر و سخن کا جوش مدت ہوئی کہ افسردہ ہو چکا تھا۔ ریاض کی جانگزا خبر نے بالکل مردہ کر دیا۔ بجھی ہوئی طبیعت سے پُرسوز اشعار تو کیا نکل سکتے، مگر بہرحال ان کی یادگار کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے جذباتِ بے حسی کا اظہار ذیل کے قطعہ تاریخ میں کیا گیا ہے، جو کتابہ قبر بن سکتا ہے۔

قطعۂ تاریخ

دیکھے زمانہ دیدۂ عبرت نگاہ سے — بیدار کن یہ عالمِ خوابِ ریاض ہے
کل جو لباسِ چہرہ کشائے جمال تھا — بن کر کفن وہ آج نقابِ ریاض ہے
ہے دفترِ حیاتِ نود سالہ منتشر — دستِ اجل سے چاک کتابِ ریاض ہے
کہیے لسانِ ملک کہ خیامِ عصر اُسے — شایانِ شاں ہر ایک خطابِ ریاض ہے
ہے عام یہ سوال بتا دے مجھے کوئی — دنیائے شاعری میں جوابِ ریاض ہے؟
عمرِ کہن میں بھی ہے جواں اُس کا ہر سخن — گویا عروجِ عہدِ شبابِ ریاض ہے
رندانِ پارسا کا ہے پیرِ مغاں وہی — سحرِ حلال، کیفِ شرابِ ریاض ہے
سب مانتے ہیں کوئی نہیں اُس سے منحرف — خضرِ طریق، راہِ صوابِ ریاض ہے
بزمِ انجمن میں اُس کی زباں کے ہیں زمزمے — گونجی ہوئی صدائے ربابِ ریاض ہے
جو بادہ کش ہے میکدۂ شاعری کا آج — لذت چشیدۂ مئے نابِ ریاض ہے

اردو ادب ہے جس کا بعد فخر آسماں — وہ بارگاہ فیض مآب ریاض ہے
گلزار نظم کا ہو کہ صحرائے نثر ہو — چھایا ہوا ہر اک پہ سحاب ریاض ہے
بھولتی نہیں نظر سے وہ تصویر نور کی — ہر چند پردہ دار حجاب ریاض ہے
موجود ہے دلوں میں نگاہوں سے ہے نہاں — یہ التفات ہے کہ عتاب ریاض ہے
احسن ! رہیگی اب تو ملاقات حشر میں — خاموش لب ہے بس یہ جواب ریاض ہے
ہے مستحق وہ خلد مطہر کا بالیقیں — بے شبہ پاک صاف حساب ریاض ہے

پڑھ لو جو فاتحہ تو یہ تاریخ بھی پڑھو
یعنی - مزار پاک جناب ریاض ہے
۱۳ ۵۴

تاریخ وفات ریاض

(از جناب منشی الٰہی بخش صاحب اعجاز لکھنوی)

مر گئے سید ریاض احمد — کیجیے کیا یہی تھا حکم الٰہ
شاعر شوخ طبع کامل فن — مانتے تھے اُسے سخن آگاہ
بخش دے اپنے لطف سے خالق — قصر جنت ہو اُس کی راحت گاہ

سال رحلت ہے اسکا دردآگیں
عندلیب ریاض معنی آہ
۱۳۵۴ھ

ایضاً

بزم سخنوراں میں غنیمت تھی اُسکی ذات — مرنے کا پھر ریاض کے کس طرح غم نہ ہو
لطف و کرم سے اُسکے نہیں دور کچھ یہ بات — رضواں سکے کہ - خلد مبارک ریاض کو
۱۹۳۴ء

داستانِ دیوانِ ریاض

(از جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے۔ رکن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ)

۴۔ اگست شنبہ کا دن تھا۔ میں حسب معمول چھ بجے کے بعد دفتر سے مکان آیا۔ صحن میں چھوٹی میز پر کچھ خطوط رکھے ہوئے تھے۔ پہلا کارڈ اٹھایا۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا مکتوب تھا:

"مکرم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

لیجیے آپ کے اور میرے ممدوح حضرت ریاض خیرآبادی بھی چل بسے ......"

بس اسی قدر پڑھا۔ مونڈھے کے تکیے سے سر لگا کر کچھ دیر سناٹے میں پڑا رہا۔ نماز کا وقت آ گیا تو اٹھتے اٹھتے بقیہ کارڈ پڑھا۔ مسجد کو گیا۔ نماز ادا کی، فاتحہ پڑھی، واپس آیا۔ ایک خیال تھا کہ دل و دماغ پر مسلط ہو گیا تھا۔ مولانا نے اپنے گرامی نامہ میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ "آپ انپر کچھ لکھیے ضرور"۔ میں نے جواباً عرض کر دیا کہ "میں تو بہت کچھ لکھنا چاہتا تھا مگر اس کا لطف جب تھا کہ وہ ہوتے اور دیکھتے۔ اب تو کچھ لکھنے کو جی نہیں چاہتا"۔ چند روز بعد مولانا ظفر الملک کا والا نامہ صادر ہوا اور موصوف نے بھی اسی قسم کی خواہش کی اور پھر مکرمی رئیس احمد صاحب نے بھی ایسا ہی خیال ظاہر فرمایا۔ مجبوراً چند الفاظ دیوان کے متعلق لکھتا ہوں مگر دل پر ایک بار محسوس کرتا ہوں۔ کسی رسالہ، کسی اخبار میں حضرت مرحوم کی کوئی غزل طبع ہوتی تو سب سے پہلے اسی کو پڑھتا۔ اب یہ کیفیت ہے کہ کئی روز سے الناظر آیا ہوا رکھا ہے اس میں مرحوم کی آخری غزل طبع ہوئی ہے۔ کئی مرتبہ پڑھنا چاہا مگر نہ پڑھ سکا۔ صرف مقطع پر اکتفا کی:—

نشۂ مے سے جواں بنتے ہیں پیری میں ریاض
وقت ہے توبہ کریں اب قبر کا ساماں کریں

کثیر الاحباب بہت لوگ ہوتے ہیں مگر حضرت ریاض کا وصف خاص یہ تھا کہ ہر مشرب، ہر طریق، اور ہر حیثیت کے لوگ انکے احباب میں داخل تھے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بچے جوان، بوڑھے سب ان سے یکساں بے تکلف رہا کرتے تھے۔ حضرت مرحوم دس برس کی عمر میں اپنے والد (سید طفیل احمد مرحوم) کے ہمراہ گورکھپور گئے اور چالیس برس سے زیادہ مستقلاً گورکھپور میں رہے۔ میرے والد، چچا، ماموں، ان کے سامنے کے کھیلے ہوئے ہیں، اور وہ عمر میں ان سے

تھے مگر اپنے والد کے دوسرے ہمنشینوں کے سامنے مجھے جس ادب و لحاظ کی ضرورت تھی حضرت
یاس کے لیے اس کی ضرورت نہ تھی۔ ان سے ایک عجب عقیدت و ارادت ہوگئی تھی۔ کچھ شعر بھی
کر دکھایا کرتا تھا۔ ان کے اشعار عطر فتنہ میں چھپتے تو اُسے محفوظ رکھتا۔ بچپن ہی میں ان کے
بہت سے اشعار یاد ہوگئے تھے۔ عمر زیادہ ہوئی تو طبعاً ان کے دیوان کے دیکھنے کا خیال پیدا
ہوا۔ مگر دیوان تھا کہاں کہ دیکھتا۔ دل میں یہ ولولہ پیدا ہوا کہ چھپنا چاہیے۔ مجھے اتنا معلوم نہیں
کہ مجھ سے پہلے ان کے دیوان کے طبع کے لیے کن کن لوگوں نے تحریکیں کیں مگر قیاساً یہ سمجھتا ہوں کہ
اس قسم کی تحریکیں ضرور ہوئی ہوں گی۔ اور حضرت مرحوم نے اپنی وسیع الاخلاقی سے تا حد پذیرائی
کسی کو مایوس نہ کیا ہوگا۔ مگر میرے دیکھتے دیکھتے متعدد اصحاب دیوان کی صورت دیکھنے کی حسرت
لیے ہوئے دنیا سے اُٹھ گئے، اور آخر میں خود حضرت مرحوم کا بھی یہی حال ہوا۔

مجھے سب سے پہلے ان کے دیوان کے طبع کا خیال ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوا۔ میں ہنوز
علی گڑھ میں پڑھتا تھا۔ امتحان دے کر مکان آیا تھا۔ حکیم برہم مرحوم کے وہاں مجلس شوریٰ
منعقد ہوئی، اور یہ رائے قرار پائی کہ سو اشخاص ایسے ہو جائیں جو پندرہ روپئے فی جلد دینا منظور
کریں تو طبع کا سامان ہو جائے۔ چند روز کے اندر بہت سے لوگوں نے نام لکھ دیے مگر یہ انتظام پایۂ
تکمیل کو نہیں پہونچا۔ کیونکہ اہم سوال روپیہ کا نہیں تھا بلکہ اہم سوال یہ تھا کہ حضرت مرحوم دیوان
مرتب کر کے دیں۔ اسی اثنا میں کچھ حالات ایسے پیش آگئے کہ کئی برس تک نہ حضرت مرحوم
اس طرف توجہ کر سکے نہ اُن کے احباب نے توجہ دلانا مناسب سمجھا۔ ۱۹۱۴ء میں پھر اس فکر
و خیال رجوع ہوا۔ مرحوم مہاراجہ محمود آباد کو اصرار تھا کہ دیوان ممدوح کی طرف سے ریاست کے
مطبع میں طبع ہو۔ اہل گورکھپور اپنا حق جتاتے تھے کہ یاس کی شاعری کا نشو و نما گورکھپور ہی میں ہوا
تھا۔ لکھنؤ کے تعلق سے خان بہادر سید احمد حسین صاحب کا قدم بھی درمیان میں آگیا تھا۔
ریاست محمود آباد میں طبع دیوان سے حضرت مرحوم خود گھبرائے ہوئے تھے۔ اوّل تو حضرت مرحوم
کا خیال تھا کہ دیوان بہت ہی اعلیٰ درجے کا طبع ہو، اور ریاست کے مطبع میں یہ ذرا دشوار تھا۔ دوسرے
مہاراجہ مرحوم دیوان میں کچھ حذف و اسقاط بھی چاہتے تھے۔ ارشاد ہوا تھا کہ دیوان مجھے دیجیے
میں اس پر نظر کر دوں اور بعض اشعار کو خارج کر دوں۔ حضرت مرحوم نے اپنی طبعی خوش خلقی اور [illegible]
بھولے پن سے عرض کر دیا کہ حضور کی زحمت فرمائی کی ضرورت ہی کیا ہے، یہ معلوم ہو جائے کہ کس قسم
کے اشعار کا حذف کرنا منظور ہے، میں خود اُس قسم کے تمام اشعار کو خارج کر دوں۔ [illegible]

کسی سے وصل پہ سنتے ہی جان ہول گئی ۔۔۔ چلو ہٹو بھی ہماری زبان سوکھ گئی

حضرت ریاضؔ تو سنتے ہی سنانے میں آ گئے، گو سخن بر وفق مرادِ بادشاہ باید گفت، اظہارِ اتفاق کر کے چلے آئے۔ مجھ سے فرمایا کہ شعر تو شائع ہو چکا بلکہ زبان زد ہو چکا، اب خارج کروں تو کیسے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ خارج بھی کر دیں گے تو میں اس قسم کے تمام اشعار کو یکجا کر کے ایک ضمیمہ شائع کر دوں گا۔ ادھر حضرت مرحوم اس خلجان میں پڑے، اُدھر مہاراجہ بہادر قومی معاملات اور پھر سرکاری ملازمت میں منہمک ہو گئے۔ طبعِ دیوان کی طرف چنداں خیال نہیں رہا۔ سمجھ لیا گیا کہ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

اب پھر گورکھپور کا نمبر آیا۔ حضرت مرحوم کا خیال ہوا کہ ایک خاص ایڈیشن بھی ہو اور جو لوگ پچاس روپے دیں اُن کے نام اُس میں طبع ہو جائیں، اور اس قسم کے تمام نسخوں پر حضرت مرحوم دستخط بھی فرما دیں۔ فہرست کھلی، نام لکھے گئے، میں نے سو لکھا، ارشاد ہوا کہ اتنا اور لکھو۔ ع نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔ یہ بھی لکھ دیا مگر کام کچھ آگے نہ بڑھا۔ اس مرتبہ سرگرم کار مولوی فاروق صاحب ایم۔ ایس۔ سی اور سید جمشید علی صاحب رئیس تھے۔ یہ دونوں اصحاب کل مصارف اپنی جیب سے ادا کرنے پر آمادہ تھے مگر دیوان اب بھی پردۂ خفا سے عرصۂ شہود پر نہیں آیا۔ ایک طرف سے تقاضا اور دوسری طرف سے وعدہ ہوتا رہا۔ تا آنکہ یہ معاملہ بھی سست سا پڑ گیا اور اس میں کچھ دقت اس وجہ سے بھی لاحق ہوئی کہ حضرت مرحوم کا قیام خیرآباد میں رہا کرتا اور طباعت کے کام کو دیکھنے کے لیے بار بار گورکھپور آنے کی ضرورت ہوتی۔ مرحوم کی جوانانہ ہمت اگرچہ سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتی تھی مگر واقعاً عمر و صحت کے اعتبار سے ان کا بار بار گورکھپور آنا دشوار تھا۔ ان کا رجحان اس طرف تھا کہ دیوان لکھنؤ میں طبع ہو، کیونکہ خیرآباد سے لکھنؤ تک جانا قدرے آسان تھا۔

یہ خواہش بھی پوری ہو گئی۔ یاد سے تکلیف ہوتی ہے۔ میں جب حیدرآباد سے گورکھپور جاتا اور لکھنؤ میں قیام کا ارادہ ہوتا تو مرحوم کو مطلع کر دیتا۔ محض مجھ سے ملنے کے لیے خیرآباد سے لکھنؤ تک تشریف لاتے۔ ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۲ء میں حیدرآباد سے لکھنؤ گیا اور مرحوم حسبِ عادت اپنی شفقتِ بزرگانہ سے تشریف لائے تو خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کے وہاں گفتگو ہو کر یہ قرار پایا کہ خان بہادر اپنی ذمہ داری پر دیوان طبع کرائیں۔ خان بہادر نہ صرف اخراجات مہیا کرنے بلکہ اہتمام کے لیے بھی آمادہ تھے اور اپنے وسیع اثرات و تعلقات کی وجہ سے

[illegible] میں کامل اطمینان کے ساتھ لکھنؤ سے گورکھپور گیا۔ مگر سال گزر گیا اور طبع
[illegible] ہوا۔ دوسرے سال پھر یہی صورت پیش آئی اور پھر یہی قرارداد ہوئی مگر نتیجہ حسب بالا۔
[illegible] قرعہ فال گورکھپور ہی کے نام نکلا۔ حق یہ ہے کہ مرحوم اگرچہ گورکھپور سے چلے گئے
تھے مگر گورکھپور سے ان کے تعلقات بدستور قائم تھے اور ان کا دل گورکھپور ہی میں لگا رہتا تھا۔

وہ گلیاں [illegible] ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے　　بڑی حسرت سے لب پر نام گورکھپور آتا ہے

واقعہ یہ ہے، میں جانتا ہوں اور بعض دیگر احباب بھی جانتے ہوں گے کہ مرحوم کی دلی تمنا یہ تھی کہ
دیوان طبع لکھنؤ میں ہو مگر اشاعت گورکھپور ہی سے ہو اور گورکھپور کے اصحاب کی طرف سے ہو۔
غرض [illegible] میں خان بہادر مولوی محمد اسمٰعیل صاحب بیرسٹر ایٹ لا اور مولوی رضوان اللہ صاحب
بی اے ایل ایل بی نے کمر ہمت باندھی اور یہ تہیہ کر لیا کہ روپیہ بلا تاخیر نقد جمع ہو جانے۔
حضرت "ریاض" کے دیوان کے لیے روپیہ کون نہ دیتا، اور پھر ایسے دو اصحاب کی سرگرمی۔ روپیہ
جمع ہو گیا اور ستائیس برس کی گفت و شنید اور وعدہ و وعید کے بعد ۱۹۳۳ء میں یہ ہوا کہ حضرت
مرحوم نے اوائل سنہ میں دیوان کا ابتدائی حصہ اور مئی تک بقیہ حصہ مرتب کر کے حوالے کر دیا
اگر میں یہ کہوں تو کچھ بیجا نہ ہو گا کہ جن لوگوں نے اس دیوان کے طبع کی فکر و کاوش میں ایک عمر گزار دی
تھی اُن کی جان میں جان آ گئی۔
میں ۱۳ مئی کو گورکھپور پہونچا، حضرت مرحوم ۱۷ مئی کو تشریف لائے اور دس روز میرے
ہی یہاں قیام فرمایا۔ میں ان دنوں اپنے ماموں (خان بہادر مولوی حمید اللہ صاحب) کی علالت
کی وجہ سے پریشان تھا۔ سارا وقت مدنظر کے وہاں گزرتا۔ دن میں بارہ ایک بجے اور شب میں
دس گیارہ بجے آتا۔ مرحوم سے جی بھر ملنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ مگر حضرت مرحوم کی موجودگی گھر کے
لیے کافی تھی۔ قدر دانانِ ریاض دیوان کے مراحل طے کرتے رہے۔ منشی علی حسن صاحب کتابت
کے لیے تجویز ہوئے اور منشی دین محمد صاحب طباعت کے لیے۔ حضرت مرحوم دیوان دو رنگ
میں چھپوانا چاہتے تھے، یعنی جدول سرخ ہو اور محض جدول نہ ہو بلکہ باریک انگوری بیل ہو۔ نمونہ
طبع ہوا اور حضرت مرحوم نے پسند فرما لیا اور یہ طے ہو گیا کہ کام کا اجرا ہو جائے۔
دیباچۂ دیوان کے لیے مرحوم کا اصرار اور سخت اصرار تھا کہ دیباچہ میں لکھوں، مگر مجھے دو
وجوں سے عذر تھا۔ اول تو مجھے اپنی خرابی صحت کی وجہ سے یہ اطمینان نہ تھا کہ میں وقت پر
[illegible] کام کو پورا کر سکوں گا، اور میں یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ میری وجہ سے ایک دن کی بھی تاخیر ہو

دل میں اپنے طور پر ایک دوسری ہی تجویز قائم کر چکا تھا۔ خیال یہ تھا کہ ایک مختصر [illegible]
دوں جس کے جزا ابو نواس، حافظ اور ریاض ہوں۔ میں ابو نواس اور حافظ کے نوٹ مرتب
کر چکا تھا۔ صرف یہ انتظار تھا کہ حضرت مرحوم کا دیوان مدون ہو جائے تو اُس میں سے اشعار کا
انتخاب کروں۔ چونکہ اس رسالہ میں ریاض کے خمریات پر بحث لازمی تھی اس لیے میرا عذر یہ تھا کہ
میں ایک ہی بحث کو دو جگہ نہیں لکھ سکتا۔ بہت رد و قدح کے بعد یہ قرار پایا کہ مولوی محمد فاروق
صاحب ایم۔ ایس۔ سی ذاتی حالات لکھیں، مولوی سید محمد کامل حسن صاحب ایم۔ اے شاعری پر تبصرہ
کریں اور جناب وصل بلگرامی صاحب اُردو شعرا کے کلام سے حضرت ریاض کے کلام کا مقابلہ کریں۔
آخر جون میں اس کامل وثوق کے ساتھ میں گورکھپور سے واپس ہوا کہ اب طبع دیوان کا سلسلہ
جاری ہو جائے گا۔ بلکہ یہاں تک انتظام کرتا آیا کہ جو اجزا طبع ہوتے جائیں وہ برابر مجھے پہنچتے
رہیں۔

لیکن قدرت کو ابھی کچھ اور ستم ظریفی کرنا تھی۔ جناب مولوی سبحان اللہ صاحب کی ذکاوت و
فطانت پر ان کے تمام جاننے والے ایمان لائے ہوئے ہیں۔ آپ نے حضرت ریاض کے بعض
اشعار میں کچھ ترمیمیں سوچیں یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ آپ کو سوجھیں۔ اسی زمانے میں چند ترمیمیں
مجھے بھی سنائی تھیں۔ اُن میں سے ایک ترمیم یاد ہے۔ ریاض فرماتے ہیں:۔

لاشہ ہے میرا یا مئے رنگیں کی موج ہے — تربت ہے میری یا کوئی بوتل شراب کی

ترمیم ہوئی

لاشہ ہے میرا یا کوئی بوتل ہے سربمہر — تربت ہے میری یا کوئی بھٹی شراب کی

اس میں شبہ نہیں کہ تشبیہ میں ترقی ہو گئی ہے مگر اس طرح کی ترمیموں سے سارا دیوان مبدل ہو جاتا،
وہ ریاض کا کلام نہ رہتا۔ حضرت مرحوم نے اس موقع پر بھی خلقی مروت سے کام لیا اور دیوان
کو وقفِ اصلاح کر کے چلے گئے۔ مجھے سخت خلاف ہوا۔ میں نے یہ کہہ دیا کہ اصل دیوان میں ترمیم
نہیں ہو گی، یہ ممکن ہے کہ ترمیمات کا ایک ضمیمہ لگا دیا جائے۔ مشکل یہ ہوئی کہ ترمیم نہ آج ختم ہوتی ہے
اور نہ کل۔ مجھ سے اور حضرت مرحوم سے برابر مراسلت رہی۔ تین مہینے ہوئے کہ حضرت مرحوم نے
مجھ کو [illegible] میں یہ اطلاع دی کہ "مولوی صاحب نے جملہ قیود اُٹھا دیے" اور دیوان [illegible]
کے بعد [illegible] دیوان آ جائے تو لکھنؤ جا کر کتابت کا انتظام کروں"۔ کسی شاعر کے کلام میں ترمیم
کی [illegible] ترکیب ترمیم کو "قیود اُٹھا دینے" سے تعبیر کرے، یہ حضرت مرحوم ہی کا اخلاق تھا۔

[illegible] مولانا رضوان صاحب کچھ تردولت میں گرفتار ہو گئے
[illegible] کی سالوں میں [illegible] غیرہ تاخیر ہوتی گئی تا آنکہ خود حضرت مرحوم "چل بسے"۔ کاش مولوی سبحان اللہ
صاحب کے ذہن میں ترمیم کا خیال نہ آیا ہوتا تو حضرت مرحوم کی زندگی میں دیوان اگر مکمل طبع ہو کر شائع
نہ ہو جاتا تو اس کا ایک معتد بہ حصہ ضرور چھپ گیا ہوتا۔ دل کا کچھ بار ہلکا ہو جاتا۔ بیاض دیوان کی
سو [illegible] اور بگڑتی ہوئی انہیں دیکھتے ہوئے ایک مرتبہ حکیم مرحوم نے مجھ سے کہا تھا کہ
"دیوان کا روپیہ بھائی صاحب کی قسمت کا نہیں ہے" یہ قول سچ ہو گیا۔

اسی تعویق اور لیت و لعل کے زمانے میں ایک مرتبہ حکیم صاحب مرحوم نے جھنجھلا کر یہ بھی
فرمایا تھا کہ "آپ کا اور بھائی صاحب کا کوئی کام کبھی انجام کو نہیں پہنچے گا" میری حد تک تو یہ
بالکل بجا ہے مگر "بھائی صاحب"[1] کے معاملے میں اس کی تشریح اس تمام بحث کی غرض و غایت ہے۔

ریاض الاخبار کے بند ہونے کے بعد حضرت مرحوم کے وسائل آمدنی بہت ہی محدود ہو گئے
تھے۔ انھوں نے اپنی عمر کے آخری پچیس سال جس عسرت اور ساتھ ہی جس خودداری سے بسر کیے وہ
ان کی زندگی کا ایک مابہ الامتیاز واقعہ ہے اور اس کی کیفیت ان کے سوانح حیات میں روشن
ہو گی۔ غالب کے فارسی کلام کی طرح وہ اپنے دیوان کی نسبت یہ بھی نہیں سمجھتے تھے کہ ع ایں ہمہ
از قحط خریداری کہن خواہد شدن۔ ایک برس بھی پورا نہ ہوتا کہ انکے دیوان کے دوسرے اڈیشن کی
نوبت آ جاتی۔ مصارف طبع کی کسی وقت بھی دشواری نہیں تھی۔

پھر کیوں نہ انھوں نے اب سے پچیس برس قبل اپنا دیوان چھپوا کر اپنی زندگی آرام سے
گزاری؟

یہ حیرت ہر شخص کو ہو گی، اور اس کا جواب تین لفظوں میں دیا جا سکتا ہے مگر ضرورت
ہے کہ اسے ذرا تفصیل سے بیان کیا جائے۔

جب حضرت مرحوم کی سوانحعمری لکھی جائیگی تو واضح ہو گا کہ ان کی زندگی نے دو سخت پلٹے
کھائے۔ انیسویں صدی کے اواخر بلکہ بیسویں صدی کے اوائل تک گورکھپور میں کچھ خوش وقت
اصحاب باقی تھے۔ مولوی حبیب اللہ مرحوم (وکیل و وائس چیرمین میونسپل بورڈ) اور بابو [illegible]
آنجہانی (سکریٹری میونسپل بورڈ) ہر بزم کی روح رواں تھے۔ مرحوم مولوی احسان اللہ عباسی (
وکیل و مصنف تاریخ الاسلام وغیرہ) کی رائے روشن تمام محافل اور مہتممہ [illegible] کی جان تھی۔

---

[1] حضرت مرحوم کو انکے اکثر احباب "بھائی صاحب" کہا کرتے تھے۔ آخر انکے خورد بھی و بیاری [illegible]

منشی چھوٹے لال جونی (وکیل) اصحاب حل و عقد کے سرِ دفتر تھے۔ تحریک کے [illegible]
محمد خلیل مرحوم و مغفور (چیرمین میونسپل بورڈ) کی برگزیدہ ہستی سایہ فگن تھی۔ مولوی سبحان اللہ صاحب
رئیس کا عنوانِ شباب تھا۔ ہر طرح کی مساعدت کے لیے ذاتِ موفور السرور کافی سے زیادہ تھی۔ سب سے
بڑھ کر یہ کہ مسٹر سید حبیب اللہ بیرسٹر ایٹ لا گورکھپور میں جنٹ مجسٹریٹ اور مصالح قومی و ملکی کے لیے
وقف تھے۔ جہاں اتنے اصحابِ خبرت و اربابِ فکرت جمع ہوں وہاں کسی اختراعِ دماغی کے بروئے
کار آ جانے میں کیا دیر لگتی ہے۔ رزولیوشن پاس ہو گیا کہ ایک کمپنی قائم کی جائے اور ایک روزانہ
اخبار نکالا جائے اور منشی سید ریاض احمد صاحب مہتمم و مؤتمن ہوں۔ اگر معاملہ یہیں تک رہتا تو
بہ اغلب وجوہ خیریت سے گزر جاتا۔ مگر زمانہ جدید کی مطابقت اور عاقبت اندیشی کی کسر رہ جاتی
لہٰذا قرار پایا کہ کمپنی کی رجسٹری کرا دی جائے۔ رجسٹری ہو گئی۔ کچھ روپیہ بھی جمع ہو گیا اور اخبار
(صلح کل) کا اجرا عمل میں آ گیا۔ جس شخص نے پولیس کی ملازمت اس طرح کی ہو کہ کبھی وردی
نہ پہنی ہو اور ریاض الاخبار کے بقایا کی وصولی کی بہترین تدبیر یہ سمجھتا ہو کہ بقایا نہ وصول ہوگا تو
اخبار میں نام شائع کر دیا جائے گا۔ اس پر جب چھ بڑے رجسٹروں کی خانہ پُری کا بوجھ پڑ جائے گا تو
انجام معلوم۔ ایک پلنگ تھا اور حضرت ریاض تھے۔ اسی پر لکھنا، اسی پر کھانا اور اسی پر سونا۔
کسی شب میں بستر بچھا لیا کسی شب میں یہ بھی نہیں۔ بیمار رہنے لگے اور سخت بیمار ہوئے۔ ناچار اپنے
بھائی سید نیاز احمد صاحب کے پاس فرخ آباد چلے گئے۔ گورکھپور سے یہ پہلی طولانی غیبت تھی۔ واپسی
کے بعد پھر ان کی سابقہ حالت نے عود نہیں کیا۔ حکیم برہم مرحوم ۱۹۰۲ء میں گورکھپور آ گئے تھے۔
صلح کل کے وہ ایڈیٹر تھے، نقشہ و عطر فتنہ حضرت ریاض نے انھیں دے دیا تھا، اب ریاض الاخبار
کی اڈیٹری بھی انھیں کے سپرد ہوئی۔ ریاض الاخبار کی پالیسی میں کیا تغیرات ہوئے، صلح کل پر
کیا گردش پیش آئی، ان امور کے بیان کا یہ موقع نہیں۔ حاصل یہ کہ ۱۹۰۷ء میں حضرت ریاض نے
گورکھپور کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ کو اپنا مستقر قرار دیا۔ ریاض الاخبار کو بھی وہیں لے گئے۔ اور کچھ دنوں بعد
بند کر دینا پڑا۔

کاش صلح کل جاری نہ ہوا ہوتا یا جاری ہوا تھا تو حضرت مرحوم اس کی مالی و انتظامی ذمہ داری
اپنے سر نہ لیتے، اگر ذمہ داری لی تھی تو کمپنی کی رجسٹری نہ کراتے۔ جس طرح ریاض الاخبار کا کام چلا
جاتا تھا اسی طرح اس کا بھی کام چلاتے تو ان کی پُرسکون زندگی کا خاتمہ نہ ہوتا، اور شاید ان کے
آخر دم تک ریاض الاخبار گورکھپور سے جاری رہتا۔ ریاض الاخبار زمانہ کا ساتھ دے سکتا

تم ریاض تک تصویں، اسے آنکھوں سے لگاتے رہتے۔ اور ان سے بڑھ کر یہ کہ نہ حضرت ریاض انکھنؤ سے بیمار ہوتے اور نہ اُن کا دیوان گم ہوتا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مرحوم جب اپنا سامان لے کر گورکھپور سے جا رہے تھے تو راستے میں اُن کا ایک بکس چوری ہو گیا اور دیوان اُسی بکس میں تھا۔ منکاپور اور گونڈہ کے درمیان ایسا ہوتا رہتا ہے کہ چور چلتی گاڑی کی پٹری پر چڑھ آتے ہیں اور دروازہ کھول کر بکس گرا دیتے ہیں اور چلتی گاڑی پر سے کود جاتے ہیں۔ انٹر کلاس میں یہ واردات زیادہ ہوتی ہے حضرت ریاض کا وہ بکس جس میں دیوان تھا اسی طرح غائب ہوا خود میرا ایک بکس جس میں کاغذات تھے اسی طرح جاتے جاتے بچ گیا۔ چور نے دروازہ کھول کر بکس کھینچا ہی تھا کہ ایک مسافر کی آنکھ کھل گئی۔ اور اُس کی آواز پر وہ شخص بکس کو چھوڑ کر ریل پر سے کود گیا۔ چالیس برس سے زائد کے سرمایۂ حیات کے اس طرح ہاتھ سے جاتے رہنے کا حضرت ریاض پر کیا اثر پڑا ہوگا، اس کا اندازہ دشوار ہے۔

جو ہونا تھا وہ ہو چکا حضرت مرحوم اگرچہ سخت، گھبرتے گر کر ہمت باندھی اور مختلف ذرایع و وسائل سے ازسرنو دیوان جمع کرنا شروع کیا۔ مگر قدرت کو ابھی ایک نیا کھیل کھیلنا تھا اور یہ مرحوم کی زندگی میں دوسرا بابِ تھا۔

سنہ ۱۹ء میں ایک ناکردہ گناہ کا الزام قتل میں ماخوذ ہونا، حضرت مرحوم کا بیرونی مقدمہ میں دن کا رات اور رات کا دن کر دینا کچھ عجیب عالم تھا۔ میں اُس وقت اور اُس حالت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جب مرحوم ایک نظم لکھ کر لائے:-

موت آئے تو نہ معلوم ہو آنا اُس کا   جان جائے تو نہ معلوم ہو جانا اُس کا

دو شخصوں کو سزا ہو گئی۔ اپیل میں ایک کو رہائی ملی، دوسرے کی سزا تغیر کے ساتھ بحال رہی۔ چند برس بعد اُس کی بے قصوری بھی ثابت ہوئی اور اُسے بھی رہا کیا گیا۔ مگر اس سے حضرت مرحوم کی زندگی میں ایک اہم تغیر واقع ہوا حضرت مرحوم مذہب کے پابند تو ہمیشہ سے تھے مگر ظاہر ایسا بنا رکھا تھا کہ لوگ انھیں صرف شاعر قال نہیں بلکہ شاعر حال سمجھتے تھے:-

ہے ریاض اک جوانِ مست خرام   پیے اور جھومتا جائے

اب ہوا میں اُڑتی ہوئی مونچھوں پر تصوا، شواب کی قینچی چل گئی اور منڈی ہوئی داڑھی پر خدا کا حکم نافذ ہو گیا۔ ان کے چہرے پر جب اس گیا و سپیں کی پرورش ہو رہی تھی، کچھ دونوں مجھے

سے کا تعلق نہیں ہوا، جب اس نورانی شکل کے ساتھ تشریف لائے تو مجھ سے پہلے میر حسن کے
ملاقات کی طرف دیکھا۔ دوسرے تیسرے روز غزل کہی ع بالی رفتہ رفتہ سفید بھی ہوگئیں
ہوگئی۔ ان کی شاعری پر بھی اس کا اثر پڑا۔ ایام جوانی میں فرمایا تھا کہ

شرما کر ریاض بیٹھی ہے — لمبی داڑھی ہے ہاتھ بھر کی

مگر یہ صرف شاعری تھی داڑھی نہیں تھی۔ لیکن آخر زمانے میں جب یہ ارشاد ہوا کہ:—

ع ریاض آپ بھی پیتے ہیں بایں ریش سفید — اسے یہ نورانی شکل اور سینہ کا سوچ میں

تو ریش سفید "نورانی شکل" محض شاعری نہیں رہی۔

غرض صحبت، حالات، خیالات ہمیشہ بدلتے رہے ۱۹۱۰ء تک ریاض ۱۹۱۰ء کے ریاض نہیں رہے۔ اگر کچھ قدر مشترک تھا تو بس اتنا کہ ان کی چلبلی طبیعت اور زندہ دلی میں فرق نہیں آیا اور شاعری کو انھوں نے خیرباد نہیں کہا۔

منشی امیر اللہ تسلیم کے حالات میں کسی موقع پر مجھی سید فضل الحسن حسرت موہانی نے لکھا ہے کہ منشی صاحب مرحوم نے ایک داستان نظم کی تھی وہ گم ہو گئی۔ آپ نے کمال استقلال سے فرمایا کہ "خیر ایک پیسے روز کا تیل اور سہی" ایک داستان میں تو یہ ممکن ہے لیکن دیوان غزلیات جو مدت العمر کا سرمایہ ہو وہ پیسے روز کے تیل سے نہیں مہیا ہو سکتا۔ لوگ طبع دیوان کے تقاضے کرتے تھے حضرت ریاض وعدے کرتے رہتے تھے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ (۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۰ء تک کی) تین برس کی گردش کے بعد سے جب انھیں ذرا سکون حاصل ہوا تو انھوں نے از سر نو دیوان جمع کرنا شروع کیا۔ ان کی کوئی غزل ایسی تو تھی نہیں جو کہیں نہ کہیں شائع نہ ہو چکی ہو مگر ان اخبارو اور رسالوں کا ملنا دشوار تھا۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے بہت سی غزلیں ایسی بھی کہیں جو محض تکمیل دیوان کی ضرورت سے کہی گئی تھیں۔ ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء تک انھیں اس معاملہ میں معذور سمجھا جا سکتا ہے، مگر اس کے بعد جو تاخیر ہوئی وہ محض دو وجہوں سے ہوئی: اول یہ کہ وہ اپنے دیوان کو زائد از ضرورت مکمل بنانا چاہتے تھے، دوسرے طباعت کے متعلق ان کے خیالات اس قدر بلند تھے کہ کسی مطبع کا اس سے عہدہ برآ ہونا ذرا دشوار تھا۔ ایک مرتبہ تو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ دیوان جرمنی میں طبع ہونا چاہیے۔ اگر یہ دو خیالات حائل نہ ہوتے تو ان کا دیوان آپ سے برسوں قبل طبع ہو جاتا اور بعد کے اڈیشن میں اضافے ہوتے رہتے۔

لیکن جو کچھ ہوا، حضرت مرحوم کی عمر، ان کی صحت، ان کے آلام و افکار کو دیکھتے ہوئے

اِن کا سلسلہ بیس برس تک دیوان کے اجزائے متفرقہ کے جمع کرنے، ترتیب دینے اور کتابت کے پورا کرنے میں معطل رہنا ایک ما فوق الطاقت واقعہ ہے۔ بہرحال آفریں اُن کی ہمت پر اور صد ہزار آفریں اُن کے ثبات و استقلال پر کہ اُنھوں نے اس کام کو انجام کو پہنچا دیا۔ وہ خود متمتع نہیں ہوسکے مگر اہلِ ادب کو لازوال نفع پہنچا گئے۔ اگر خود مرحوم نے اس قدر تکلیف برداشت کرکے دیوان کا مسودہ مدون نہ کر دیا ہوتا تو "ریاض کا کلام" صرف اُن چند غزلوں کا مجموعہ ہوتا جو تاجرانِ کتب جمع کرکے ردی کاغذ پر چھاپ دیتے۔ مجھے توقع ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس وقت دیوان کا کام ہے اُن کے لیے یہ حادثۂ جاں کاہ تازیانے کا کام دے گا اور دیوان علیحدہ طبع ہو کر رُوشناسِ عالم ہوگا۔ انشاء اللہ القدیر۔

فغانِ آرزو

(از جانشینِ جلال جناب انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

یہ جو دو اک بہار کے دن ہیں — زندگی میں شمار کے دن ہیں
مدتِ وعدہ دور ہے اے دل — ختم کر صبر و قرار کے دن ہیں
فرق لذت کا ہے اگر احساس — تو خزاں بھی بہار کے دن ہیں
ظلم ہے عمر میں شمول ان کا — ایسے کچھ انتظار کے دن ہیں
ہے جو عہدِ شباب دولتِ کیف — عیش ناپائدار کے دن ہیں
ہے معین نفس کی آمد و شد — عمر کتنی شمار کے دن ہیں
جوششِ گل میں بھی خار کی ہے خلش — اک مصیبت بہار کے دن ہیں
بیم و اُمید کے سیاہ و سفید — گردشِ روزگار کے دن ہیں

آرزو لعنت ہے گر وہ حسیں
شکوے چھوڑو کہ پیار کے دن ہیں

نظامِ اردو | زبان کے اجزائے ترکیبی کی تحقیق و تشریح، مترادفات کے اصولِ استعمال اور ہر لفظ کے برمحل و بجا برتنے کا معیار۔ از حضرت آرزو لکھنوی۔ قیمت عہ
منیجر الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

تاریخ خوابِ عدم

۱۹۳۴ء

(از جناب حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ)

"لسان الملک خیام العصر شیریں زبان۔ فصیح زمان جناب ریاض"

۱۳۵۲   ۱۹۳۴

(۱)

لحدِ ریاض احمد خیرآبادی

۱۹۳۴

(۲)

تغزل کے خاتم تھے بیشک ریاض   ہوا ختم بس اب یہ بابِ سخن

غزل سے گئی رندی و عاشقی   انھیں تک تھی سب آب و تابِ سخن

جوانی میں کیا کیا نہ ہوگی بہار!   جو پیری میں تھا یہ شبابِ سخن

یہ حامد نے تاریخِ رحلت کہی

کہ۔ بے کیف ہے اب شرابِ سخن

۱۳۵۳

(۳)

کیا حشر ہو عمارتِ شعر و سخن کا اب   جب تک ریاض کا تھا سہارا، گری نہیں

تاریخ انتقال دلِ زار[1] سے ہوئی   ہے یوں کہ جب ریاض نہیں شاعری نہیں

۱۳۴۴

(۴)

ریاض خیرآبادی نرفتہ ست   کہ رفتہ است از غزل آں نمک بجے

رقم زد سالِ رحلت کلکِ حامد   ادیبِ خوش بیان و شوخ گوئے

۱۹۳۴

---

[1] دلِ زار یعنی الف کے ایک عدد کا تعمیہ ہے۔ قادری

زندگی!

(از جناب پروفیسر جلیل احمد صاحب جلیل قدوائی ایم اے)

کیا کیا فریب دے کے ستاتی ہے زندگی
ہر دم ہنسا ہنسا کے رلاتی ہے زندگی

بیزار کیسے کوئی بھلا اس سے ہو سکے
انساں کو سو طرح سے لبھاتی ہے زندگی

روٹھے جو اس سے ایک دفعہ دل تو لاکھ بار
دے کر فریب اس کو مناتی ہے زندگی

آئے جو کوئی پاس تو کہتی ہے "دور ہو"
اور دور ہو تو پاس بلاتی ہے زندگی

ہنستا کسی کو پا کے رلاتی ہے اشک خوں
روئے کوئی تو اس کو ہنساتی ہے زندگی

امیدوار دل ہو تو یہ توڑتی ہے آس
مایوس ہو تو آس بندھاتی ہے زندگی

کوئی ڈرے نہ اس کو تو ڈرتی ہے اس سے یہ
کوئی ڈرے تو اور ڈراتی ہے زندگی

حاوی اگر ہو کوئی تو رہتی ہے یہ دبی
اور جو دبے تو اس کو دباتی ہے زندگی

گرتا ہے خود ہی طائر دل آ کے سر کے بل
رنگین دام ایسا لگاتی ہے زندگی

گر کوئی ہوشیار نہ ہوتا ہو یوں شکار
حرص و ہوس کا جال بچھاتی ہے زندگی

اک عمر ڈھونڈتے بھی جن کی ملے نہ چھاؤں
کچھ ایسے سبز باغ دکھاتی ہے زندگی

پھر کر کے غم سے جان کی دنیا دکھوں بھری
گھن کی طرح سے جسم کو کھاتی ہے زندگی

جب تک ہے سانس جسم میں ہے چھوٹنا محال
پنجے میں اپنے ایسا دباتی ہے زندگی

پورے کسی کے کرتی ہے لاکھوں تو بیشمار
ارماں خاک میں بھی ملاتی ہے زندگی

بے بال و پر کو تو یہ پرواز بخش کر
رفعت پہ آسمان کی بٹھاتی ہے زندگی

جو خاک پر ہیں ان کو تو دیتی ہے اوج عرش
جو عرش پر ہیں ان کو گراتی ہے زندگی

اہل ہوس کو تخت جواہر نگار پر
کچھ دن بٹھا کے عیش کراتی ہے زندگی

پھر ایک دن گھسیٹ کے ان کو کشاں کشاں
فرش زمیں پہ لا کے سلاتی ہے زندگی

لاکھوں ہی گھر مٹا کے بساتی ہے ایک گھر
سو جان لے کے ایک بچاتی ہے زندگی

کتنوں کا خون چوس کے پلتی ہے ایک جان
حیرت ہے زندگی ہی کو کھاتی ہے زندگی

نیکی کسی کی ہو تو اسے خاص طور پر
اک راز کی طرح سے چھپاتی ہے زندگی

[illegible] ذرا جو بُرائی تو دیکھیے ۔۔ عالم میں ایک شور مچاتی ہے زندگی

قائم ہے کس طرح سے سروں پر یہ آسماں
منظر تو رات دن یہ دکھاتی ہے زندگی

جب کو یہ ڈر ہے طبقۂ عالم اُلٹ نہ جائے
دُنیا سے ذکرِ خیر مٹاتی ہے زندگی

مکار و حیلہ ساز سیہ کار و خود غرض
شیطان آدمی کو بناتی ہے زندگی

انساں عجب ہے ملعبۂ نادیں جے جمیلؔ
جس راہ چاہتی ہے چلاتی ہے زندگی!

طُور کی طرح مرے دل کو جلانے والے

(از جناب حکیم افتخار علی صاحب جگرؔ صدیقی بسوانی)

دیکھنے والے نہیں ہوش میں آنے والے
کون دیکھے تجھے دیدار دکھانے والے

مُنہ چھپا کر ہمیں دیدار دکھانے والے
تیرے انداز ہیں دیوانہ بنانے والے

کہہ دیا صاف اُنھوں نے کہ نہ آنا در پر
آنے والے نہ وہاں ہم ہیں نہ جانے والے

دل ہمارا ابھی تو پامال کیا ہے تو نے
خاک میں سارے زمانے کو ملانے والے

تو نے دنیا میں کیا نام وفا کا روشن
شمع لا کر مری تربت پہ جلانے والے

داورِ حشر سرِ حشر نہ پوچھے ہم سے
ہم تو قاتل کا نہیں نام بتانے والے

فرض ہے راہ میں ہر گام پہ سجدہ کرنا
دیکھ او حُسن کی درگاہ میں جانے والے

تجھ کو موسیٰ کی قسم پردہ سے باہر آ جا
طُور کی طرح مرے دل کو جلانے والے

دل سنبھالے مری میت پہ وہ کیوں روتے ہیں
آج کیا ہو گئے انداز جلانے والے

سوئیے چین سے نیند آپ کو خوب آئیگی
مر گئے رات کو نالوں سے جگانے والے

موسمِ گُل کی جنوں خیز ہوائیں ہیں جگرؔ
دن قریب آ گئے دیوانہ بنانے والے

رفیقِ تنہائی اور دوسرے افسانے - از پروفیسر علی عباس حسینی ایم اے۔ جس پر مصنف کو ہندوستانی اکیڈیمی سے آٹھ سو روپیہ انعام ملا۔ قیمت ۱۲
منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

اسمبلی کا انتخاب

انتخاب کے مسئلہ سے راقم الحروف کو زیادہ دلچسپی نہیں ہے، جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ انتخاب کا جو حقیقی مفہوم ہے یا ہونا چاہیے' اُس سے کسی کو سروکار نہیں۔ ہر شخص اسے ذاتی مقاصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ اور وسیلہ یا اپنے کسی عزیز یا دوست کی رفعت و ترقی کا ضروری زینہ تصور کرتا ہے۔

اگر صحیح طریقہ پر انتخابات ہوتے تو چاہیے یہ تھا کہ جو شخص منتخب کیا جانے والا ہے' وہ اپنے گھر میں بیٹھا رہتا اور لوگ اُسے اُس کی خدمات، اہلیت کی بنا پر منتخب کرتے۔ مگر ہوتا کیا ہے؟ ہر امیدوار کو ووٹ داخل کرانے کے لیے سیکڑوں بلکہ ہزاروں روپئے خرچ کرنا ہوتے ہیں۔ ووٹ دینے والوں کو ہموار کرنے کے لیے طرح طرح کے جائز و ناجائز اثرات استعمال کرنا پڑتے ہیں اور بعض اوقات تو ووٹ کی قیمت بھی ادا کرنا ہوتی ہے۔ اسی سلسلہ میں کبھی کبھی مار پیٹ، ہنگامے اور کشت و خون تک کی نوبت آجاتی ہے۔

انگلستان میں جہاں سے یہ نعمت اِس ملک کو ملی ہے' حالات کسی قدر بدلے ہوئے ہیں۔ وہاں کے رائے دہندگاں اوّل تو اس ملک کے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ تعلیم یافتہ اور منظم ہیں، دوسرے ذمہ دار قومی حکومت قائم ہونے کی وجہ سے اعضائے حکومت اور نمایندگانِ ملک کے نصب العین اور مقاصد میں یکسانیت ہے، صرف طریقِ کار میں اختلاف ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ وہاں کی حکومت کا انتخاب مُلکی نمایندوں ہی کی جماعت میں سے ہوتا ہے' اور جس خیال کے لوگوں کی اکثریت پارلیمنٹ میں ہوتی ہے' زمامِ حکومت اُنھیں کو تفویض کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ رائے دہندگاں انتخاب کے وقت حتی المقدور اُسی شخص کو اپنا ووٹ دیتے ہیں جس کے مسلکِ سیاسی سے وہ اتفاق رکھتے ہوں پھر بھی انتخابات کے موقع پر ایسی ایسی ناگفتنی باتیں عمل میں آتی ہیں کہ انسانیت سرگریباں اور تہذیب و شائستگی عرقِ انفعال و ندامت میں غرق ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے جاہل رائے دہندگاں تو سرے سے اس کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے کہ وہ اپنی رائے مناسب اُمیدوار کے حق میں دیں۔ مگر ستم یہ ہے کہ یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی اِس وقت تک اپنی رائے کے صحیح استعمال کی قدر و قیمت نہیں جانتا۔ مذہبی تعصب، ذات پات یا قبیلگی عصبیت، ذاتی منفعت و اثرات اور وجاہت و دولت کی بنیاد پر عموماً انتخابات ہوتے ہیں۔

ہوشیار اور چالاک لوگ مہینوں اور برسوں پیشتر سے انتخاب میں کامیاب ہونے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ نئی انجمنیں بنائی جاتی ہیں، اخبارات نکالے جاتے ہیں، اپنی فیاضی، حب قومی اور قابلیت مختلف پیرایوں میں مشتہر کی جاتی ہے۔ اور اہل غرض کارندوں کے ذریعہ رائے دہندگان عام فریب میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔ انتخاب کا زمانہ قریب آنے پر امیدواروں کی حالت ناقابل بیان ہوتی ہے۔ وہ نہ اطمینان سے کھانا کھا سکتے ہیں، نہ آرام کی نیند سو سکتے ہیں۔ ممبری کا بھوت ہر وقت سر پر سوار رہتا ہے۔

اس وبائے عام میں ہندو مسلمان سب مبتلا ہیں اور مسلمان چونکہ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسرف اور لہو و لعب کے زیادہ شایق ہیں، اس لیے گھوڑ دوڑ، پتنگ بازی، تھیٹر، سنیما کی طرح انتخابات کے کھیل میں بھی قدرتاً ان کو بہت دلچسپی ہوتی ہے اور وہ بڑے حوصلے سے اس میں روپیہ صرف کرتے ہیں۔ اور تعلیم کی کمی اور سیاسی تنظیم ناقص ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں اُن کے نمائندے زیادہ نااہل و ناکارہ بھی ہوتے ہیں اور خود غرض و مطلب پرست بھی۔

میونسپلٹی ہو یا ڈسٹرکٹ بورڈ، کونسل ہو یا اسمبلی، ان کی رکنیت کے لیے سب سے زیادہ جن اہلیتوں کی ضرورت ہے، اُن پر شاذ و نادر ہی توجہ کی جاتی ہے۔ اُمیدوار تو غرضمندی کی وجہ سے اندھے ہوتے ہی ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ رائے دہندگان کی اکثریت بھی ان امور پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتی۔ اور پڑھے لکھے اصحاب تک ذاتی تعلقات کی رَو میں بہ جاتے اور دانستہ طور پر اُن سے اغماض برتتے ہیں۔ اور بسا اوقات رائے دہندگان کو گمراہ کرنے کے لیے ایسی رکیک حرکتیں کرتے ہیں کہ اُن کے علم و فضل پر جہالت قہقہے لگاتی ہے۔

اِن حالات میں انتخابات سے کیا دلچسپی ہو؟ مگر مشکل یہ ہے کہ انتخابی ادارے مُلک میں قائم ہیں اور رائے دہندگان کے نمائندے بن کر جو لوگ اِن اداروں میں جاتے ہیں حکومت کے نظم و نسق اور اہلِ ملک کی زندگی پر ایک حد تک اُن کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ اس لیے باوجودیکہ انتخاب کا طریقہ قطعی غلط ہے، مختلف اُمیدواروں کے درمیان فرق و امتیاز کرنا ہی پڑتا ہے۔

اضلاع اودھ سے، شہر لکھنؤ کو چھوڑ کر ایک مسلمان نمائندہ اسمبلی میں جاتا ہے اور لکھنؤ کو حق دیا گیا ہے کہ صوبہ کے چھ دوسرے بڑے شہروں کے ساتھ مل کر ایک مسلم نمائندہ منتخب کرے۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ہماری رائے کے خلاف مولانا شوکت علی صاحب اسمبلی کی رکنیت کے اُمیدوار ہیں اور ایک قانونی سقم کی بنا پر، روہیلکھنڈ کو چھوڑ کر ہفت شہری حلقہ کی نیابت کرنا چاہتے

اسمبلی کا انتخاب

[illegible] جو کچھ بھی ہو باوجود مناقشن ہماری قوم میں نہیں ہے اور اگر مسلمانوں میں کچھ بھی سیاسی
[illegible] اُن کے مقابلہ میں جو اصحاب ہیں وہ فوراً دست بردار ہو جاتے اور معاملہ کو
[illegible] اسمبلی میں پہنچا دیتے۔ جیسا کہ پنجاب کے ایک حصے میر غلام بھیک صاحب
[illegible] سید [illegible] کی دست برداری کا ابھی حال میں اعلان ہوا ہے۔ جن کے لیے قسمت انبالہ
کے مسلمان [illegible] قابل ہیں۔ مگر ہمارے خیال میں یونٹی بورڈ کا اُن کو اس خدمت کے لیے منتخب کرنا
اور مولانا کا اس پر رضامند ہو جانا بے محل ہے اور کسی مفید نتیجہ کی امید نہیں دلاتا۔ اسمبلی میں جس قدر
[illegible] سارے ہندوستان سے منتخب ہو کر جائیں گے اُن میں سے بہت ہی کم مسلمان نمائندے
ایسے ہوں گے جو وہاں پہنچ کر مولانا شوکت علی کی رہنمائی قبول کریں اور وہ منظر یقیناً نہایت
دردناک ہوگا جبکہ فرقہ وارانہ تصفیہ کے سوا دیگر اہم مسائل کے زیر بحث آنے پر مسلمانوں کا
سب سے بڑا لیڈر ایک راہ جا رہا ہوگا اور قوم کے نمائندوں کی بڑی جماعت سمت مخالف
کی طرف چل رہی ہوگی۔

مسلمانان اودھ کی نمائندگی کے لیے یادش بخیر سر سید وزیر حسن صاحب بھی امیدوار ہیں۔
معاصر عزیز معلومات کے اوراق پر سید صاحب کو پہلے مسٹر سی آر داس اور مولانا محمد علی کے ساتھ میں
قومی ہیرو ظاہر کر کے اُن جاہلانہ نعروں ہی کی نہیں بلکہ خود اس لفظ کی توہین کی گئی اور بعد کو اسمبلی کی
رکنیت کے لیے موزوں ترین شخص بتایا گیا۔ سید صاحب گذشتہ تیرہ سال سے قومی معاملات سے
بالکل الگ اہم سرکاری عہدوں پر رہے اس وجہ سے اس ساری مدت میں اُن کا ذکر ان
اوراق میں نہیں کیا گیا۔ مگر اب کہ وہ پھر اُسی میدان میں واپس آنا چاہتے ہیں جہاں سے ایک
دفعہ مرزا غالب کے ہمنوا ہو کر یہ کہتے ہوئے نکلے تھے کہ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے۔
بے محل نہ ہوگا اگر اُن کے سابقہ کارناموں کی یاد ایک مرتبہ پھر تازہ کر دی جائے۔

سید صاحب کی قانون دانی اور روپیہ پیدا کرنے کی قابلیت روز روشن کی طرح آشکارا ہے
اور قوم کی نمائندگی کا دارومدار اگر انہیں صفات پر ہوتا تو ہمیں اُن کے انتخاب سے قطعاً اختلاف
نہ ہوتا۔ مگر ایڈیٹر صاحب معلومات جو کئی سال تک آل انڈیا مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سکرٹری
رہ چکے ہیں، اچھی طرح جانتے ہیں کہ سید صاحب نے مسلم لیگ کے سکرٹری ہونے کے زمانہ میں قوم
کی بہبودی اور اپنے اخلاص و ایثار کے کیسے زریں کارنامے یادگار چھوڑے ہیں۔ لیکن [illegible]
[illegible] نہیں ہے۔ سالہا سال کے پرانے کاغذات بھی ممکن ہے کہ مرور زمانہ سے اب تلف

[illegible] نمائندہ منتخب کریں اور جو اصحاب ذاتی خوشنودیوں یا سید صاحب کی افسوسناک کاروائیوں کے
بدولت اُن کو اسمبلی میں بھیجنے کی کوشش کریں گے وہ مسلمانوں پر اور خود اپنے اوپر ظلم کریں گے اور
یہ یقینی ہے کہ بعد کو کفِ افسوس ملیں گے۔ جیسا کہ اُن کے دیگر حامیانِ سابق اب کر رہے ہیں۔

تحریر و تقریر کی قابلیت، قانون دانی، معاملہ فہمی وغیرہ قومی نمائندوں میں ضرور ہونا چاہیے لیکن
اس سے زیادہ اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ ہمارے نمائندوں کا دامن صرف قومی غداری سے پاک
نہ ہو بلکہ عملی تجربہ کی بنا پر اُن سے یہ اُمید بھی کی جاسکے کہ وہ قوم کے کندھوں پر سوار ہو کر کسی بلند
مقام پر فائز ہونے کے آرزومند نہیں اور قومی خدمت و دردمندی کی سچی تڑپ اپنے دل میں رکھتے ہیں

سید وزیر حسن صاحب کو سرکاری عہدہ دار بننے سے پیشتر کامل چھ سال تک اس کے پورے
مواقع حاصل رہے کہ وہ خدماتِ قومی کے لیے اپنی اہلیت کا عملی ثبوت بہم پہنچائیں مگر افسوس ہے کہ
تجربہ سے ثابت ہوا کہ قدرت نے اس اہلیت سے اُن کو سرفراز ہی نہیں کیا۔

سنہ ۱۶ء کے اجلاس لیگ کا وہ تماشہ ایڈیٹر صاحب معلومات کو فراموش نہ ہوا ہوگا جب سید صاحب
نے قیصر باغ کی بارہ دری کے اندر آخری نشست میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ مسلم لیگ کی سالانہ رپورٹ
منظور کی جائے۔ ایک رکن نے فی البدیہہ صدرِ جلسہ سے درخواست کی کہ جس رپورٹ کی منظوری
طلب کی جاتی ہے وہ کم سے کم صدر کے روبرو میز پر تو رکھی جائے۔ سید صاحب کے ایڈیٹر معلومات
جیسے دیگر احباب نے اس درخواست کو سنتے ہی ساری بارہ دری سر پر اُٹھالی تھی اور بہت ممکن تھا
کہ حق و صداقت کی جو آواز بلند کی گئی تھی اس ہنگامہ میں دب جاتی، مگر خدا بھلا کرے مسٹر جناح
کی ضابطہ پسندی کا کہ اُنھوں نے اس بھرے مجمع میں سید صاحب سے یہ تسلیم کرالیا کہ رپورٹ کا وجود عالمِ تخیل
میں ہو تو ہو، صفحۂ کاغذ پر نہیں ہے۔ مگر

یہ قصہ ہے تب کا کہ آتش جواں تھا

اُس وقت حکیم عبد الولی صاحب اگرچہ ایڈیٹر معلومات نہ تھے لیکن "نوا" میں مسلم لیگ کے قابضین
و مستبدین کے خلاف جو پُرزور سلسلۂ مضامین نکلا تھا اُس سے دلی اتفاق رکھتے اور حریت طلب و
آزادی پسند جماعت کے پورے ہم خیال تھے۔

سنہ ۱۷ء میں جب ضلع آرہ میں بیگناہ مسلمانوں کا خون بہا تو اُس وقت مسلم لیگ کی مجرمانہ خاموشی
نے تمام مسلمانوں کو بہت صدمہ پہنچایا۔ اور یاد ہوگا کہ جب کئی مہینے کے بعد دوسری سیاسی مجبوریوں
سے مسلم لیگ کا ایک جلسہ رفاہِ عام ہال میں منعقد ہوا تو مسلمانوں کے اس غم و رنج کے اظہار کی غرض سے

[illegible] کو لیگ کے عہدہ داروں کے خلاف [illegible] کی تحریک پیش کی تا ہم [illegible]
سے فوراً اپنا استعفا صدر جلسہ کی خدمت میں پیش کر دیا تھا - اور مفاد قومی کے لیے بہتر ہوتا کہ یہ استعفا
منظور کر لیا جاتا - مگر زمانہ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ مسٹر محمد وسیم بیرسٹر جو سید صاحب کی چہیتی [illegible]
میں سب سے زیادہ اُن کی عنایات بے پایاں سے سرفراز ہوئے اور اپنی اعلیٰ قابلیت کے باوجود جب
خواب میں بھی شاید جج کے عہدہ پر فائز ہونے کا خیال نہیں کر سکتے تھے اور اُن کے دیگر احباب ہی اُس
وقت سب سے زیادہ اس پر مُصر ہوئے کہ تحریک واپس لے لی جائے - اور بالآخر صدر جلسہ کی
درخواست پر ایسا ہی کرنا پڑا -

سنہ ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کے حسابات کی جانچ کے بعد جو واقعات پیش آئے اُن کا تفصیلی تذکرہ
جنوری سنہ ۱۹۱۹ء کے پرچہ میں موجود ہے - اس سلسلہ میں یہ لطیفہ بھی یاد دلانے کے قابل ہے کہ
حکیم عبدالوالی صاحب بی اے (ایڈیٹر معلومات) کئی برس سے مسلم لیگ میں ملازم تھے مگر سید وزیر حسن
صاحب نے ان کی علمی ادبی و استادی قابلیت کے باوجود کبھی ان کو لیگ میں کسی ذمہ دار خدمت پر متعین
نہ کیا اور یوسف خاں جو قابلیت کی ان سہ گانہ خصوصیات سے قطعاً معرا تھا محض سید صاحب
کے لطف و کرم سے اسسٹنٹ سکرٹری بنا ہوا لیگ کے دفتر کو ہر طرح اُلٹا کرتا رہا - حکیم صاحب تو
اُس وقت اس عہدہ پر فائز ہو سکے ہیں جب اُس بدبخت سے استعفا لینے پر سید صاحب بھی مجبور ہوئے"

مسلم لیگ کے سلسلہ میں سید صاحب کے جو بعض کارنامے معلومات میں بڑے طمطراق
سے درج کیے گئے ہیں ان کی حقیقت سے بھی وہ اصحاب بخوبی واقف ہیں جو لیگ کے کاموں میں
حصہ لیتے رہے ہیں - واقعہ یہ ہے کہ جب تک مولوی عزیز مرزا مرحوم لیگ کے سکرٹری رہے
وزیر حسن صاحب کو جوائنٹ سکرٹری ہونے کے باوجود لیگ کے دفتر سے کوئی سروکار نہیں تھا
اور وہ مرحوم ہمیشہ جھینکتے رہے کہ سید صاحب اُن کی ذرا امداد نہیں کرتے - اُن کے
انتقال کر جانے کے بعد سید صاحب سکرٹری مقرر ہو گئے تو جلسوں کے موقع پر ضرور دوڑ
لگے مگر لیگ کا کام کچھ بھی نہیں کرتے تھے - لیگ کی رونق جو کچھ تھی ہز ہائینس آغا خاں اور مہاراجہ صاحب م
کی زرپاشیوں کے بدولت - کہ الگ الگ دفتر قائم کیے ہوئے تھی اور سکرٹری کو مفت روپیہ
سے مہیا ہو جاتا تھا - یہی وجہ تھی کہ وہ طبقہ جو لیگ کو ایک فعال ادارہ بنانے کے لیے
تھا ہمیشہ سید صاحب سے بیزار رہا اور بار بار ایسی تحریکیں کی گئیں کہ اُن کو علیحدہ کر دیا جائے
کانگریس لیگ کے سمجھوتے کے متعلق معلومات کا یہ لکھنا کہ سر شفیع اور سید وزیر حسن صاحب

[illegible] ہے۔ سر شیخ، مہاراجہ صاحب محمود آباد اور لیگ کے [illegible] صاحب کے ساتھ تھا۔ جیسے کہ اعلان لیگ کے وقت علیحدہ ہو چکے تھے، جبکہ یہ شخص لیگ کے ساتھ آل پارٹی میں تھے۔ سر وزیر حسن کی اس وقت تک یہ منزلت بھی نہ تھی کہ ہندو مسلمان علیحدہ علیحدہ کی نظروں میں ان کی بات کا کوئی وزن ہوتا۔ بس سمجھنے کا سہرا اگر کسی ایک فرد کے سر باندھا جا سکتا ہے تو وہ مرحوم مہاراجہ صاحب محمود آباد تھے جو اس وقت لیگ کے مستقل صدر اور روح رواں تھے اور جن کی بے مثل دردمندی کی بدولت اکثر عقدہ ہائے لاینحل کی گرہ کشائی ہو جایا کرتی تھی۔

سر وزیر حسن، جن بزرگ کے مقابلہ میں اسمبلی کے لیے کھڑے ہوئے ہیں، اگر ایڈیٹر صاحب حقیقت کے نزدیک ان کی قابلیت و اہلیت مشتبہ ہے یا اسمبلی کے اندر گذشتہ سالوں میں جو خدمات انہوں نے انجام دی ہیں ان سے وہ ناواقف یا غیر مطمئن ہیں تو چاہیے تھا کہ کسی ایسے شخص کو میدان میں لاتے جو موجودہ رکن سے زیادہ قابل ہونے کے ساتھ ساتھ قومی دردمندی و اخلاص عمل میں بھی ان سے بڑھا ہوا۔ سید صاحب کی تائید کے سوا اس کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے کہ ذاتی تعلقات کی قربان گاہ پر اسلامی مفاد ذبح کر دیے جائیں ع تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ اخبار حقیقت مورخہ ۱۱ اکتوبر میں سید وزیر حسن صاحب کے حریف کا انتخابی اعلان شائع ہوا۔ مسلمانان اودھ کی رہنمائی و پشت پناہی کرنے والے جتنے اصحاب ہیں ان کی بیشتر جماعت منشی اظہر علی صاحب کی مؤید ہے۔ اور اسمبلی کے اندر ان کے سابقہ طرز عمل پر اپنا اطمینان ظاہر کرکے رائے دہندگان سے پرزور سفارش کرتی ہے کہ آئندہ بھی انہیں کو منتخب کریں۔

صرف طبقۂ علماء کے دستخطوں سے یہ اعلان خالی ہے۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جب تک سید وزیر حسن صاحب میڈیسن بورڈ کے صدر ہیں یہ تو گرفتاران بلا مجبور ہیں کہ اپنے دلی جذبات و احساسات کو دبائے رہیں بلکہ بعض اصحاب با دل ناخواستہ غالباً کم و بیش ان کی تائید بھی کریں۔

کل انڈیا مسلم لیگ کے سابق سکرٹری اور اودھ کے سابق چیف جج کی غیر ہر دلعزیزی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ ایک طرف صوبہ مسلم لیگ کے صدر اور سکرٹری اور دوسری طرف تعلقہ داروں اور [illegible] جماعت کے بیشتر نامور و با اثر حضرات میں سے کوئی بھی ان کی تائید کے لیے آمادہ نہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے

اسی خاطر تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

الناظر
لکھنؤ

ایڈیٹر: — ظفر الملک علوی

نمبر ۵	نومبر سنہ ۱۹۳۴ء	جلد ۳۸

فہرست

دیوانِ اثر - خواجہ میر درد کے بھائی سید میر اثر کا کلام
جو پہلی بار چھپا ہے - مع مقدمہ از مولوی تقی الدین احمد
[illegible] از پروفیسر آغا صاحب [illegible] قیمت ۔

دیوانِ تاباں - میر عبد الحی دہلوی تاباں کا قابلِ قدر
کلام جو پہلی بار شائع ہوا ہے - قیمت عہ

کلام الملوک - پروفیسر حبیب اللہ خاں نے تقریباً
[illegible] شاہزادوں کے اردو کلام کا یہ انتخاب مرتب کیا
ہے - قیمت

جذباتِ بسمل - مسٹر سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی کا
کلام قدیم و جدید رنگ میں
مع مقدمہ از سر عبد القادر
[illegible] سادہ و رنگین تصاویر
اور خوشنما جلی کتابت و
طباعت کا حسن دوبالا کر رہا
ہے - قیمت عہ

مطلع انوار
منشی [illegible] بہار [illegible] دہلوی بی اے کی نظموں کا دلآویز
مجموعہ - مع مقدمہ از جگت موہن لال رواں و دیباچہ
از [illegible] ندوی - قیمت عہ

پیامِ روح - مسٹر حامد اللہ افسر ایم اے میرٹھی کی
دلآویز نظموں کا باتصویر مجموعہ قیمت ۔

نغمہ زار - پنجاب کے نامور اور مشہور شاعر ابو الاثر حفیظ
جالندھری کا مجموعہ کلام - قیمت ۔

[illegible]ستاں - لکھنؤ کے مشہور مزاحیہ نگار اور شاعر شوکت
تھانوی کا مجموعہ کلام - جس میں غزلیات کے علاوہ
چند نعتیہ اور عارفانہ نظمیں بھی شامل ہیں - حجم ۲۰۰ صفحے
مع دو تصاویر کے - قیمت ۔

دنیائے راز - ابو الفاضل آزاد [illegible]
جدید طرز کی مختصر نظموں کا مجموعہ - قیمت ۱۰ر

تابشِ خیال - افسر صدیقی امروہوی کا مجموعہ غزلیات
مع مقدمہ از [illegible] و تصویر مصنف - قیمت عہ

لمعاتِ اختر - قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی
دلچسپ نظموں کا مجموعہ - قیمت ۸ر

زنگاری بیگم - انگریزی زبان کے مشہور مزاحیہ ڈرامہ
"لیڈی [illegible]" کا یہ منظوم ترجمہ
انگریزی خلاصہ کے توسط سے
مشہور شاعر و مضمون نگار مرزا
جعفر علی خاں اثر بی اے
لکھنوی نے کیا ہے - کتاب
خوشنما اور مجلد ہے قیمت ۱۲ر

اثرستان
مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی بی اے کا دیوان مع مقدمہ
از جناب عزیز لکھنوی قیمت عہ

شاہنامہ اسلام (جلد اول) یعنی اردو نظم میں تاریخ
اسلام کے ولولہ انگیز واقعات کا بیان شاہنامہ فردوسی
کے تتبع میں مسلمانوں کے افسردہ دلوں میں حرارت پیدا
کرنے کے لیے - از جناب حفیظ جالندھری - قسم اول ۔
قسم دوم ۔

سیپارۂ دل - قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی
غزلیات کا مجموعہ - مع تقریب از شاہ نظام الدین دلگیر ۔

مرآۃ الشعر
شعر کی حقیقت و ماہیت، اسکے اجزائے ترکیبی،
اسکے علوم معانی و بیان وغیرہ اور اسکے مباحث
پر اردو میں اپنی قسم کی پہلی اور قابلِ قدر کتاب
ہے - از پروفیسر عبد الرحمن - قیمت ۔

بہادر ہند، ہندستانی ہیروں سری کرشن اور ... کے سوانح حیات اور ان کی تعلیمات ۔ نیز ... رانا سانگا اور کبیر داس کے حالات پر ... ۔ عہد اکبری کے نامور ہندو امراء کے قابل دید حالات ۔ از مولوی سید احمد ماہروی ۔ قیمت ۸/

سیرۃ الغازی ۔ مصطفیٰ کمال پاشا کے سوانح اور تحریک آزادی اناطولیہ کی مکمل و مستند تاریخ مولفہ امین محمد سعید و کریم خلیل ثابت مصری کا ترجمہ از مولوی غلام ربانی لودی

قیمت ۸/

تاریخ صقلیہ (جلد اول) مولوی ریاست علی ندوی رفیق دار المصنفین نے صقلیہ میں اسلامی عہد حکومت کی مفصل تاریخ پہلی بار مرتب کی ہے جس سے عرب فاتحین کے عظیم الشان کارناموں کا حال معلوم ہوتا ہے ۔ حجم ۵۵۰ صفحے للعہ/

ترجمہ تاریخ فرشتہ ۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں، حکومتوں اور مشائخ کے حالات میں تاریخ فرشتہ نہایت مشہور و مستند کتاب ہے ۔ اسی کا ترجمہ اردو بڑے اہتمام سے دو جلدوں میں شائع ہوا ہے ۔ حجم ۱۲۰۰ صفحے ۔ صعہ/

سیرت طیبہ و دیگر مضامین ۔ مولوی غازی الدین احمد صاحب بی اے، ایچ ۔ سی ۔ ایس نے (جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک ہونہار فرزند ہیں) حضور رسول مقبول صلعم کی سیرت پاک پر چند مضامین لکھے ہیں ... ٹائپ میں چھپا ہے ۔ قیمت ۸/

صولت شیر شاہی ۔ سلطان عادل شیر شاہ ... کی مفصل سوانح عمری ۔ جس نے محض اپنی ہمت، شجاعت اور حسن تدبیر سے ہندوستان کی سلطنت حاصل کی اور بڑی قابلیت تدبر و انصاف سے حکومت کی اور بے نظیر آئین و قوانین وضع کیے ۔ قیمت عہ/

حیات حافظ رحمت خاں ۔ روہیلکھنڈ کے مشہور حکمراں حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی مفصل سوانح عمری ۔ مرتبہ سید الطاف علی بی اے بریلوی مع تصاویر دو جلد کے ۔ قیمت سعہ/

حیات محسن الملک

نواب محسن الملک مرحوم سابق سکرٹری علیگڈھ کالج و معتمد ریاست حیدرآباد دکن کے مفصل سوانح حیات اور ان کی عظیم قومی خدمات کا بیان از منشی محمد امین زبیری سابق ایڈیٹر ظل السلطان قیمت ۱۲/

معین الآثار ۔ مولفہ مولوی معین الدین احمد اکبرآبادی، جس میں آگرہ کی مشہور و معروف عمارت روضۂ تاج محل کی مبسوط تاریخ اور شاہجہاں کی چہیتی بیگم ممتاز محل ارجمند بانو بیگم کی سوانح عمری کے علاوہ دیگر عمارات ملحقہ کے حالات مہیا ہیں ۔ کتاب متعدد عکسی تصاویر اور نقشہ جات سے مزین ہے

قیمت ۸/

سیرۃ رسول اللہ

از نامور فاضل اور مشہور ادیب جناب سید ابو علی رضوی ایم اے پرنسپل بہاء الدین کالج جوناگڈھ مصنف تذکرۃ المصطفیٰ و معارج الدین وغیرہ نے احادیث کے قدیم ماخذوں کی مدد سے حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پاک میں یہ قابل قدر کتاب لکھی ہے ۔ کتابت طباعت نہایت دیدہ زیب ۔ حجم ۴۰۰ صفحے ۔ قیمت سعہ

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی ۔ لکھنؤ

ہیکل۔

صور کے بادشاہ حیرام نے اپنے لائق کاریگر بھیجے جنہوں نے لبنان کے جنگل سے دیودار اور صنوبر کے درخت کاٹ کر تختے تیار کیے جو سمندر کے راستے یافا کی بندرگاہ تک پہنچے اور وہاں سے یروشلیم لائے گئے

تجارت کے بڑے بڑے بیڑے جو شرق و مغرب میں گھومتے تھے اور ہر مقام کے عجائبات لا کر خانۂ خدا کی زیبائش و آرائش کا سامان فراہم کرتے تھے۔

ایک دستہ جہازات کا اقصائے بحر میں چکر لگاتا تھا اور ہر تیسرے برس ساحلِ کنعان پر لنگر انداز ہوتا تھا یہ بے شمار سونا چاندی ہاتھی دانت اور بندر اور مور لاتا تھا۔

دوسرا بیڑا بحر قلزم کے کنارے سے اوفیر تک گشت کرتا تھا جو شاید عمان کا کوئی بندرگاہ تھا یا افریقہ کا کوئی ساحلی شہر اور وہاں سے سیکڑوں من سونا لاتا تھا۔ یہ بیڑا بہت سے صندل کے درخت و بیش بہا جواہر لایا اور اسی صندل سے ستون اور بربط اور ستار بنوائے گئے۔ چندن کے ایسے درخت نہ کبھی آئے تھے اور نہ اُسکے بعد کبھی آج کے دن تک دکھائی دیئے۔ معدنوں سے بڑے بڑے بیش قیمت پتھر کھودے گئے تاکہ عمارت کی بنیاد گھڑے ہوئے پتھروں سے ڈالی جائے۔ حیرام کے معماروں اور جبلیوں نے پتھروں کو معادن کے قریب ہی تراشا اور لکڑیوں کے تختے جنگل ہی میں تیار کر لیے۔ یہ تاریخی واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس عالی شان عبادت گاہ کی تعمیر میں نہ تو ہتھوڑا نہ کلہاڑا نہ لوہے کے کسی اوزار کی آواز اُس گھر میں سُنائی دی" اور یہ وسیع و عالیشان عمارت مکمل ہو گئی

اس مقدس مکان کی لمبائی ۶۰ ہاتھ۔ چوڑائی ۲۰ ہاتھ اونچائی ۳۰ ہاتھ تھی اور ہیکل کے سامنے ایک برآمدہ ۲۰ ہاتھ لمبا ۱۰ ہاتھ چوڑا تھا اور اُسکے گردا گرد زائروں۔ عابدوں اور معتکفوں کے لیے بہت حجرے تھے۔

عمارت کے وسط میں "پاک ترین مقام" یعنی "الہام گاہ" بنایا گیا۔ اسکے ہر حصہ پر خالص سونا منڈھا گیا اور زیتون کی لکڑی کے دو فرشتے دس دس ہاتھ اونچے بنائے گئے جنکا ہر ایک بازو پانچ پانچ ہاتھ کا تھا اور دونوں پر سرتاپا سونا چڑھا ہوا تھا۔

اسرائیلیوں کے اجداد کی یادگار "تابوتِ سکینہ" مع "خیمۂ اجتماع" اور اُن سب مقدس ظروف کے جو عہد موسیٰ سے امانت تھے "الہام گاہ" میں اس طرح متمکن کیا گیا کہ فرشتوں کی مورتیں اپنے بازو

کو کھڑکیاں پر کشادہ رکھی تھیں اور اس کی چوبوں کو ڈھانکے ہوئے تھیں۔

دیواریں پتھر کی تھیں اور ان پر دیودار کے تختے جڑے ہوئے تھے۔ فرش بھی صنوبر کی خوشبودار لکڑی کا تھا۔ برآمدے میں "جھلکتے ہوئے" پیتل کے ستون "تاج۔ حوض۔ دیگیں۔ بیلچے۔ کٹورے۔ لوٹے۔ کرسیاں تھیں اور خوشنما شبیہیں شیروں بیلوں اور فرشتوں کی زیبائش کے لیے پیتل کو ڈھال کر بنائی گئی تھیں۔

مذبح سونے کا تھا۔ نذر کی روٹی رکھنے کے لیے میز سونے کا تھا۔ خالص سونے کے دس شمعدان الہام گاہ میں رکھے تھے۔ سونے کے پھول گلدان لے چراغ۔ بیچے۔ پیالے۔ گل تراش۔ کٹورے۔ چمچے۔ عود سوز۔ بخوردان وغیرہ عبادت کی ضرورتوں سے مہیا کیے گئے تھے

ہیکل کے دروازے طلائے خالص کے تھے اور سب دروازوں کے قبضے بھی سونے ہی کے بنائے گئے تھے

بیت مقدس کی تعمیر سے فراغت ہوئی تو چودہ دن تک جشن منایا گیا اور بادشاہ نے مذبح کے سامنے ایک فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا جس میں بیان تھا کہ یہ گھر خدا کی دائمی سکونت کے لیے بنایا ہے لیکن "کیا خدا فی الحقیقت زمین پر سکونت کرے گا؟ آسمان بلکہ آسمانوں کے آسمان میں بھی تو وہ سما نہیں سکتا۔ یہ گھر تو کچھ بھی نہیں ہے جو میں نے بنایا ہے" اور اس کے بعد مناجات تھی کہ جو دعا اس عمارت کی طرف رخ کر کے مانگی جائے وہ رحمت ایزدی سے قبول ہو جایا کرے

اس خدمت سے فارغ ہو کر ایک قصر شاہی اور ایک زنانہ محل اسی ساز و سامان سے تیار کیے گئے۔

جلوس کے لیے ایک عظیم الشان تخت ہاتھی دانت کا بنوایا گیا جس پر خالص سونا منڈھا ہوا تھا۔ اس تخت میں چھ سیڑھیاں تھیں اور ہر زینے کے دونوں طرف نیز نشست گاہ کے داہنے بائیں ایک ایک قوی ہیکل شیر کی صورت تھی۔

اس عہد سے پہلے کنعان میں گھوڑے نایاب تھے اب مصری نسل کے صبا رفتار اس کثرت سے جمع کیے گئے کہ شاہی اصطبل میں ۴۰ ہزار گھوڑے اور ۱۲ سو رتھ موجود رہتے تھے۔

عربستان کے قافلے ہر قسم کے خوشبودار مسالے لاتے تھے جو وہاں ہندوستان یا دوسرے شرقی ممالک سے آتے تھے۔

شاہی ظروف سب کے سب طلائے خالص کے تھے "چاندی کا ایک نہ تھا کیونکہ ان ایام میں چاندی کی کچھ قدر نہ رہی تھی"۔ افراط کے سبب سونا چاندی ایسے بے قدر ہو گئے تھے جیسے پتھر۔ اور

دیودار کی لکڑی ایسی کم قیمت تھی جیسے نشیب کے ملک میں گولر کے درخت"۔

غرض اس یُمن و برکت کے دَور میں یروشلم تمام مہذب دنیا کا مرکز تھا اور عالم کے ہر ایک گوشے کی نعمت کنعان میں موجود تھی۔ "اسرائیل کے لوگ کثرت میں سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند تھے، کھاتے پیتے تھے اور خوش رہتے تھے۔ دریائے فرات سے مصر کی سرحد تک اُن کی حکومت تھی اور "اُس کے چوگرد سب اطراف میں بادشاہ سے صلح تھی۔" کسی فوج کشی و کشور کشائی کی احتیاج نہ تھی۔ "بنی اسرائیل کا ایک ایک آدمی اپنے تاک اور انجیر کے درختوں کے نیچے دان سے بیرسبع تک امن سے رہتا تھا۔"

گر فردوس بر روئے زمین است ‌ ‌ ہمین است و ہمین است و ہمین است

گراں سعادت بادشاہ نے فرعون مصر کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ اس زبردست بادشاہ کی نورِ نظر کو بیوی بنا لیا جس کے اجداد نے بنی اسرائیل سے غلامی کی مشقت لی تھی۔ اُن کے بیٹوں کو قتل کرتا تھا اور بیٹیوں کو لونڈی بنانے کے لیے زندہ رکھتا تھا۔

بادشاہ نے اس ملکہ کے لیے ایک عالیشان محل تعمیر کرایا اور ارشاد کیا کہ "میری بیوی اسرائیل کے بادشاہ داؤد کے گھر میں نہیں رہے گی کیونکہ وہ مقام مقدس ہے جس میں خداوند کا صندوق آگیا ہے۔"[1] اس کے علاوہ موآبی، عمونی، ادومی، صیدانی، حِتّی وغیرہ مختلف اقوام کی شہزادیوں سے شادیاں کیں۔ ان کے محل میں [illegible] اور سب کو اپنے اپنے مراسم قومی بجا لانے اور اپنے آبائی پرستار بنے رہنے کی اجازت تھی۔ یہ مذہبی آزادی اور روشن خیالی خدا پرست اسرائیلیوں کو ناگوار تھی اور وہ جانتے تھے کہ "خداوند سلیمان سے ناراض ہوا اور کہا کہ تو نے میرے عہد کو نہیں مانا، اس لیے میں سلطنت کو ضرور تجھ سے چھین کر تیرے خادم کو دوں گا" لیکن اقبالمند بادشاہ کو ان بدفالیوں کی کچھ پروا نہ تھی۔

ملک سبا کی ملکہ نے (جسے نام عرب کے مورخ بلقیس بتاتے ہیں) بادشاہ کنعان کی شہرت سنی تو وہ بہت بڑے جلوس کے ساتھ یروشلم آئی اور اس کے ساتھ اونٹ تھے جن پر مسالے اور بہت سا سونا اور بیش بہا جواہر لدے تھے"۔ وہ پیچیدہ سوالات بادشاہ کی فراست کا امتحان کرنے کو لائی مگر علم لدنی کے رازداں نے ہر سوال کا جواب شافی دیا اور سب کو حل کر دیا۔ ملکہ نے شاہی دسترخوان کی نعمتوں۔ ملازموں کی نشست۔ خادموں کی حاضر باشی۔ درباریوں کی پوشاک۔ ساقیوں کی

[1] صحیفۂ تواریخ۔ باب ۸۔ آیت ۱۱۔

خوبصورتی۔ اور اُس سیڑھی کو دیکھا جس سے وہ خداوند کے گھر کو جاتا تھا تو اُس کے ہوش اُڑ گئے" اور ملکہ نے کہا کہ وہ
"سچی خبر تھی جو میں نے تیرے کاموں اور تیری حکمت کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی اور مجھے تو آدھا بھی نہیں بتایا گیا!
کیونکہ تیری اقبالمندی اس شہرت سے جو میں نے سنی بہت زیادہ ہے۔ خوش نصیب ہیں تیرے لوگ اور
خوش نصیب ہیں تیرے ملازم جو تیرے حضور کھڑے رہتے اور تیری حکمت سنتے ہیں۔ خداوند تیرا خدا مبارک ہو
کہ تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا! چونکہ خداوند نے اسرائیل سے سدا محبت رکھی ہے اس نے تجھے عدل و
انصاف کرنے کو بادشاہ بنایا۔"

اُس نے بادشاہ کو "ایک سو بیس قنطار سونا اور مسالے کا بہت بڑا انبار اور بیش بہا جواہر دیے اور
جیسے مسالے ملکۂ سبا نے بادشاہ کو دیے ویسے پھر کبھی ایسی افراط سے ساتھ نہیں آئے۔

بادشاہ نے بھی سبا کی ملکہ کو "سب کچھ جس کی وہ مشتاق ہوئی اور جو کچھ اُس نے مانگا دیا۔ علاوہ اس کے
اپنی شاہانہ سخاوت سے بھی عنایت کیا۔ پھر وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لوٹ گئی۔"

کتاب مقدس میں ملکہ کے معموں اور پہیلیوں کی تفصیل نہیں لیکن علمائے یہود کی مستند تالیفات میں
یہ سوالات درج ہیں ملکہ بلقیس کا پورا قصہ ہدہد کی غیر حاضری۔ اور جوابدہی۔ مشرق کا شہر [illegible]۔ حضرت
سلیمانؑ کا معنی خیز نامہ۔ ہدہد کی نامہ بری ملکہ کا اکابر و رؤسائے قوم سے مشورہ اور ارسال تحفہ و ہدایا۔
سفر یروشلم۔ شیشے کا مکان کشف ساقین وغیرہ وغیرہ جس طرح عرب کے مفسروں نے بیان کیا ہے
قریب قریب اُسی طرز پر "قاموس الحکایات" کی جلد سوم باب یازدہم میں مندرج ہے۔

بادشاہ کے علم و فضل۔ فہم و فراست کا یہ عالم تھا کہ "اُن کی حکمت سب اہل مشرق کی حکمت اور مصر کی ساری
حکمت پر فوقیت رکھتی تھی۔ اور دل کی وسعت ایسی تھی جیسے سمندر کے کنارے کی ریت ہوتی ہے" اُنھوں
نے تین ہزار ضرب المثلیں تصنیف کیں جن میں سے چند امثال کے نام سے "عہد عتیق کی ایک کتاب ہیں
اُنھوں نے ایک ہزار پانچ گیت بنائے جسکا ایک حصہ "غزل الغزلات" کے عنوان سے کتاب مقدس کی
زینت ہے۔

انکو علم نباتات پر عبور کامل تھا۔ "لبنان کے دیودار سے لیکر زوفا تک جو دیواروں پر اُگتا ہے سب کا
بیان اُنھوں نے کیا تھا۔

۱؎ اس کتاب کا نام "ستھو ینڈ لیجینڈز آف اینشنٹ اسرائیل" ہے اس کو "کرشیم پبلشنگ کمپنی" نے [illegible] میں شائع کیا ہے۔
اس کے مصنف کا نام انجیلو مایہ ش ہے اور اس کا ماخذ "تالمود" اور یہود کی دوسری کتابیں بزبان عبرانی و فرانسیسی
و لاطینی وغیرہ ہیں۔ ۱۲

وہ علم اسمِ الٰہیات میں کامل تھے" چوپایوں، پرندوں، رینگنے والے جانوروں اور مچھلیوں کا حال بیان کیا" اور "زمین کے سب بادشاہوں کی طرف سے لوگ اُن کی حکمت سننے آتے تھے" علم و عدالت شاہی اور دانشمندی دنیا میں مشہور تھی۔" دو عورتیں بادشاہ کے پاس آئیں اور اسکے آگے کھڑی ہوئیں۔ ایک کہنے لگی کہ میں اور یہ عورت دونوں ایک ہی گھر میں ہیں، دونوں حمل رکھتی تھیں۔ میرا ایک بچہ پیدا ہوا اور اسکے تیسرے دن اس عورت کے بھی بچہ ہوا مگر وہ اُسی رات کو مر گیا کیونکہ وہ اُس بچہ پر لیٹ گئی تھی۔ وہ آدھی رات کو اٹھی۔ میرے بیٹے کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور اپنا مردہ بچہ کو میری بغل میں ڈال دیا۔ صبح کو میں بیدار ہوئی تو دیکھتی ہوں کہ مردہ بچہ میری گود میں ہے۔ میں نے غور کیا تو پہچان لیا کہ یہ میرا بچہ نہیں ہے مگر دوسری عورت نے نہ مانا۔ وہ کہتی رہی کہ جو جیتا ہے میرا بیٹا ہے اور جو مر گیا وہ تیرا ہے۔

بادشاہ کے سامنے بھی وہ دونوں عورتیں حجت کرتی رہیں۔ دانشمند حاکم نے انصاف کیا کہ اس زندہ بچے کے دو ٹکڑے کیے جائیں اور آدھا آدھا دونوں جھگڑنے والیوں کو تقسیم کر دیا جائے۔ جس عورت کے دل میں لڑکے کی مامتا تھی وہ بیتاب ہو کر کہنے لگی اے میرے مالک یہ جیتا بچہ دوسری کو دے دے مگر جیتا بچہ نہ مار۔ وہ بولی کہ چیر ڈالو اور آدھا مجھ کو دیدو۔ بادشاہ نے پہچان لیا کہ دونوں میں کون سچا ہے اور حکم دیا کہ یہ بچہ اُسکو دیا جائے جسکے دل میں مامتا کا درد ہے۔"

مندرجہ بالا حکایات صحیفہ "سلاطین" کی مُہرِ تصدیق ثبت ہے لیکن اسکے علاوہ بہت سے افسانے کتبِ یہود میں درج ہیں جن میں سے چند "ناظر" کے آئندہ پرچے میں درج کیے جائیں گے۔ فی الحال ان عفریتوں، جنوں اور پریوں کا احوال سُنیے جنھوں نے علماء یہود کے قول کے مطابق ہیکل سلیمانی کی عالیشان عمارت قلیل مدت میں تیار کر دی تھی۔

یہ سب روایات "قاموس الحکایات" مذکورہ بالا کی جلد اول باب ۷، ۸، ۹ سے ماخوذ ہیں۔

بیت المقدس کی تعمیر شروع کرنے سے پہلے حضرت سلیمانؑ نے عہد کیا تھا کہ اس مقدس مکان کے بنانے میں لوہے کا کوئی اوزار استعمال نہیں کیا جائے گا۔ جب کام شروع ہونے کا وقت آیا تو متفکر ہوئے کہ اس عہد کو ایفا کس طرح ہو کیونکہ اس وقت تک کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں ہوا تھا جو لکڑی چیرنے اور پتھر کاٹنے کی خدمت بغیر لوہے کی مدد کے انجام دے سکے۔

علماء و احبار سے مشورہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں ایک کیڑا تھا جس کو

شامیر نکلتے تھے اور وہ سنگ آلود میں سوراخ بنایا کرتا تھا (اس آلہ کا نام توریت کی کتاب احبار اب ۵۰ آیت ۷ میں موجود ہے)

شامیر کی تلاش شروع ہوئی مگر پورے عالم پر اس کا نشان نہ ملا۔ احوال دادیہ کی رہنمائی سے شاہ بنعاس کے ایک عفریت تابع کیا گیا۔ اس سے شامیر کا پتہ پوچھا گیا۔ وہ بولا کہ شاہ دیواں اشمیدئی کے سوا کسی کو اس کا پتہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ تحقیق مزید سے معلوم ہوا کہ اشمیدئی کی جائے سکونت ایک پہاڑ ہے جہاں اس نے آبنوشی کے لیے ایک حوض بنایا ہے۔ وہ روزانہ الٰہیات کا درس لینے افلاک پہ جاتا ہے اور حوض کا منہ بند کر کے اپنی مہر لگا دیتا ہے جب آسمان سے واپس آتا ہے تو مہر توڑ کر حوض کھولتا ہے اور پانی سے سیراب ہوتا ہے

بادشاہ نے اپنے دانشوران معتبر بنایا بن یہوداع کو اس کی گرفتاری پر مامور کیا اور اس کو ایک طلسمی زنجیر عنایت کی جس کے حلقوں پر اسم اعظم کندہ تھا۔ بنایا نے بکریں چند مشکیں شراب کی اور ایک گٹھا اون کا لیکر اشمیدئی کی سکونت گاہ ڈھونڈنے نکلا۔ بڑی کوشش سے کوہ مقصود پر پہنچا۔ حوض تلاش کیا اُسکے نشیب میں دوسرا حوض بنایا اور بالائی سمت میں بھی ایک حوض کھودا۔ نالی بنا کر حوض خاص کا پانی نشیبی حوض میں گرایا اور بالائی حوض سے سوراخ بنا کر شراب کی مشکیں حوض خاص میں پہنچا دیں۔ دونوں جدید حوضوں کے نشانات مٹا دئے اور ایک گوشے میں پوشیدہ ہو کر اشمیدئی کی واپسی کا انتظار کرنے لگا

راجہ افلاک سے واپس آیا۔ مہر توڑ کر حوض کا منہ کھولا۔ پانی کی جگہ شراب دیکھ کر دریائے حیرت میں غرق ہو گیا۔ اُسکو شراب سے نفرت تھی مگر تشنگی نے بے تاب کر دیا تھا۔ پی اور سیر ہو کر پی۔ شراب نے خاصیت دکھائی شاہِ دیواں مدہوش ہوا اور حوض کے کنارے غافل ہو کر سو رہا۔ بنایا جو موقع کا منتظر تھا کمین گاہ سے نکلا۔ طلسمی زنجیر راجہ کے گلے میں ڈالی اور اُسکو ہوشیار کیا۔ وہ بیدار ہوا تو خود کو مجبورِ بلا دیکھ کر شیر کی طرح گرجنے لگا مگر زنجیر توڑنے کی قوت نہ تھی۔ اسم اعظم سے مغلوب تھا۔ بنایا کا تابع فرمان ہوا اور اُسکے ہمراہ دربار سلیمانی کی طرف گام زن ہوا۔

راستے میں ایک اندھا پیر مرد ملا جو شاہراہ سے بھٹک کر غلط جا رہا تھا۔ راجہ نے اُسکو صحیح راہ بتائی۔ آگے بڑھے تو ایک بدمست جوان ملا جو نشہ سے مخمور لڑکھڑاتا ہوا ٹیڑھی پگڈنڈی پر جا رہا تھا۔ راجہ نے اُسکو بھی شاہراہ کی رہنمائی کی۔

کچھ دور چل کر ایک برات ملی۔ دلہن بیاہ کر لا رہے تھے۔ گاتے بجاتے۔ خوشیاں مناتے راستہ کاٹ رہے تھے۔ راجہ اس مجمع کو دیکھ کر رونے لگا۔

اور آگے چلے تو دیکھا کہ ایک شخص موچی کو جوتا بنانے کا حکم دے رہا ہے اور وہ شرط لگاتا ہے کہ ایسی
اسکی مضبوطی ہونی چاہیے کہ سات برس تک اس کا ٹانکا نہ اُدھڑے۔ راجہ یہ گفتگو سن کر خوب ہنسا۔
چند قدم کے بعد ایک جادوگر ملا جو چوک میں بیٹھا ہوا سحر کے تماشے دکھا رہا تھا اور اخبار غیب بیان کرتا
تھا۔ راجہ اُس کو گالیاں دینے لگا۔

ان عجیب حرکات سے بابا کا پیمانۂ تحمل لبریز ہو چکا تھا۔ اُس نے اشمیدئی کو روکا اور
حیرت انگیز کارروائیوں کا موجب اور باعث دریافت کیا۔

شاہ دیوان نے کہا کہ رونا پیٹنا بڈھا ایک مرد صالح اور پرہیزگار ہے۔ میں نے ملکوت میں سنا ہے
کہ وہ آخرت میں بڑے مرتبے سے سرفراز ہوگا اور جو لوگ اُسکی مدد اس دنیا میں کریں گے اُنکو بھی عالم اُخروی
کی نعمات سے حصہ ملیگا۔ لہذا میں نے اُسکو صحیح راستہ بتایا۔ تاکہ حساب وکتاب کے دن اُسکے طفیل
میں میرے نامۂ اعمال کی سیاہی کچھ کم ہو جائے۔

وہ بدمست شرابی نہایت بدکار بدمعاش ہے مگر کبھی کبھی نیک افعال بھی اُس سے سرزد ہو جاتے
ہیں۔ میں نے اُس کے ساتھ نیکی کی اور سیدھا راستہ بتایا تاکہ اُسکی بھلائیوں کا معاوضہ اسی دنیا
میں مل جائے اور عاقبت کے لیے سوائے فساد اور خسران کے کچھ باقی نہ رہے

شادی کے باجے بج رہے تھے اور یہ نہ جانتے تھے کہ دولہا تیس دن میں مر جائے گا اور اُس کی دلہن کو
تیرہ برس تک بیوگی کے مصائب برداشت کرنے ہونگے تب اُسکے دولہا کا بھائی جو اس وقت بچہ ہے
بالغ ہوگا اور شریعت موسوی کے مطابق ازدواج سے عقد کرے گا اس لیے اُن کی غفلت اور بے محل
مسرت وشادمانی پر مجھ کو عبرت ہوئی اور میرے آنسو نکل آئے۔

جو شخص جوتا بنانے کی فرمائش کر رہا تھا اور ایسی پاپوش کا خواستگار تھا کہ سات برس تک کام
دے اس بات سے ناواقف تھا کہ سات دن بھی اُسکے جینے کی امید نہیں ہے لہذا اُس کی نادانی پر مجھ کو
ہنسی آئی۔

وہ بے وقوف ساحر غیب کی خبریں بیان کرتا تھا اور اتنا بھی نہ جانتا تھا کہ جس مقام پر بیٹھا ہے
اُسکے نیچے بڑا خزانہ دفن ہے جو نکالا جائے تو کئی خاندانوں کی پرورش کو کافی ہو۔ اس واسطے مجھے اُسکی
لاف زنی پر غصہ آیا اور میں نے اُس کو گالیاں دیں۔

المختصر یہ غیب داں راجہ گرفتار کرکے یروشلم لایا گیا اور "شامیر" کا پتہ دریافت کیا گیا۔ اُس نے
بتایا کہ "شامیر" تحت البحر کے ایک جن کی نگرانی میں ہے اور ایک مرغ صحرائی کے سپرد ہے جو اُس

کیونکہ یہ پہاڑ کی چٹانوں کو تراشتا ہے اور ان میں خوراک کا سامان فراہم کر کے اپنے انڈے سیکتا ہے۔ اطاعت گزار بنایا مرغ صحرائی کی جستجو میں نکلا اور اس کا کوہستانی آشیانہ تلاش کیا۔ حسبِ حکم مرغ کی غیبت میں اس آشیانہ پر شیشے کی مضبوط چادر جڑ دی اور پوشیدہ ہو کر اس صحرائی پرند کی واپسی کا انتظار کیا۔ جب وہ جانور آیا تو دیکھا کہ گھونسلے کا منہ شیشے سے بند ہے۔ بچے نظر آتے ہیں مگر ان تک رسائی ممکن نہیں۔ وہ "شامیر" کو مقام محفوظ سے لایا تاکہ اس کے ذریعہ سے شیشہ تراشا جائے۔ جیسے ہی مرغ "شامیر" کو لیکر پہنچا بنایا نے ایسا ہیبت ناک نعرہ لگایا کہ مرغ نے خوف زدہ ہو کر "شامیر" کو گرا دیا۔ بنایا نے لپک کر شامیر کو اپنے قبضہ میں کیا اور یہ نایاب تحفہ بادشاہ بنی اسرائیل کی خدمت میں حاضر کر دیا۔

"حضرت اشمیدئی اور شامیر کے" تمام ارواح لطیف سکانِ کرۂ ہوا و خطۂ ارض و تحت الارض اور تمام دیو حضرت سلیمانؑ کے تابع تھے اور انہیں کی مدد سے ہیکل سلیمانی کی تعمیر ہوئی"۔

جب عمارت کی بنیاد رکھی گئی تو ایک شیطان "ارنیاس" نام نے شرارت شروع کی۔ وہ روزانہ شام کے وقت کاریگروں کے پاس آتا چودھری کے چھوٹے لڑکے کی آدھی خوراک کھا جاتا اور اس کے داہنے ہاتھ کے انگوٹھے سے تھوڑا خون پی لیتا تھا۔ لڑکا آہستہ آہستہ سوکھنے لگا۔ معمار فکرمند ہے۔ بادشاہ نے سنا تو ان کو بھی رنج ہوا اور اس عفریت پر قابو پانے کے لیے درگاہ مالک الملک میں التجا کی۔ سرکار لایزال و لم یزل سے ایک انگوٹھی عنایت ہوئی جس پر اسم اعظم منقوش تھا یعنی پانچ "الف" کھدے ہوئے تھے۔ (ااااا) اس انگشتری کی خاصیت تھی کہ جس وقت تک وہ دست مبارک میں رہے تمام دیو جن پری شیطان مطیع و فرماں بردار رہیں۔ یہ انگوٹھی داستان نگاروں کی عنایت سے "خاتم سلیمان" کے نام سے دنیا میں مشہور ہوئی اور اس کے گم ہونے سے ایک دردناک سانحہ پیش آیا جس کا بیان آئندہ اوراق میں نذر ناظرین ہوگا۔

قصہ مختصر۔ اس خاتم کی طاقت سے "ارنیاس" گرفتار کیا گیا طلسمی زنجیروں سے جکڑ کر عبادت گاہ کے لیے پتھر گھڑنے کی خدمت پر مامور ہوا اور چودھری کے لڑکے نے دوبارہ زندگی پائی۔

اتفاقاً ایک بڑے کاریگر نے بادشاہ کے حضور میں اپنے بیٹے کی نافرمانی اور گستاخی کی شکایت کی اور عرض پرداز ہوا کہ شریعت موسوی کے مطابق بے ادب لڑکا قتل کر دیا جائے۔ ارنیاس یہ عرضداشت سن کر خوب ہنسا۔ بادشاہ نے قہقہہ بے ہنگام کا سبب پوچھا۔ "ارنیاس" نے کہا کہ یہ بے خبر باپ اپنے بیٹے کو مروانا چاہتا ہے مگر اس کو معلوم نہیں کہ تین دن میں یہ لڑکا خود بخود مر جائے گا اور اس کی موت پر سب سے زیادہ غم والم اسی بڈھے کو ہوگا۔ بادشاہ نے دریافت کیا کہ شیطان کو یہ خبر غیب کیونکر معلوم ہوئی۔ عرض کی کہ

ہم شیاطین اکثر آسمانوں پر صعود کرتے ہیں اور وہاں فرشتوں اور ستاروں کے درمیان فلک اعلیٰ کے نیچے
ہوا میں اڑتے ہیں۔ بنی آدم کے متعلق دفتر قضا و قدر سے جو احکام صادر ہوتے ہیں وہ بیشتر ہم کو معلوم ہو جاتے
ہیں مگر اس کرۂ ہوا میں کوئی جگہ ہمارے لیے آرام کرنے یا ٹیک لگانے کی نہیں ہے تھوڑی ہی دیر میں
ہماری قوت سلب ہو جاتی ہے اور ہم کمزور ہو کر ٹوٹنے والی بجلی کی طرح یا درختوں سے گرنے والے پتوں کی
مثال زمین پر یکایک آ جاتے ہیں۔ جاہل سمجھتے ہیں کہ ستارے ٹوٹ رہے ہیں مگر دراصل یہ معاملہ نہیں ہے
ستارے آسمان میں جڑے ہیں اور گر نہیں سکتے ہمارے نزول پر انکو ستاروں کے گرنے کا خیال ہوتا ہے۔
بادشاہ کو یہ عجائب و غرائب سن کر تعجب ہوا اور پیر مرد کو حکم دیا کہ وہ اپنے گھر واپس جائے۔ اس کی
درخواست پر پانچ دن کے بعد احکام صادر ہوں گے۔ جب مقررہ میعاد گزر گئی اور بڈھا نہ آیا تو بادشاہ نے
اس کو طلب کیا وہ گریبان چاک کیے افسردہ و مغموم آیا اور بیان کیا کہ اسکے گھر کا چراغ دو دن ہوئے گل
ہو گیا۔ بادشاہ کو یقین ہوا کہ ارناس نے سچ کہا تھا اور واقعی شیاطین کو اخبار غیب بعض اوقات معلوم
ہو جاتے ہیں۔

شیاطین اور جنات کے بیشمار افسانے کتب یہود میں محفوظ ہیں اگر سب بیان کیے جائیں تو بوستان
خیال کی ایک نئی جلد تیار ہو۔ بطور مشتے نمونہ از خروارے چند عفریتوں کے خواص و اعمال بطور تفنن طبع نقل کیے
جاتے ہیں

(۱) دیوزادوں کا بادشاہ "بیلزی بب" آگ کے شعلے دہن ناپاک سے نکالتا ہوا دربار میں حاضر ہوا
اور اقبال سلیمانی کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ظالموں کا پشت پناہ ہے اور کشت و خون سے
بنی آدم کو تباہ کرنا اسکے لیے محبوب ترین لذت ہے۔ بادشاہ نے سنگ مرمر تراشنے کی خدمت اسکے سپرد کی۔

(۲) ایک دیونی "انا سکلیس" نام آئی۔ اس کے والدین "جنگل" اور "آواز بازگشت" تھے۔ وہ
گھاٹیوں اور عمیق غاروں میں رہتی تھی۔ عورت کا بھیس بنا کر مردوں میں باہم جنگ کرانا اس کا خاص کام تھا۔
بادشاہ نے اس کو گرفتار کیا اور معماروں کے لیے سن بٹنے کی خدمت اس کے سپرد کی

(۳) ایک شریر دیو "اسموڈیس" نام آیا۔ وہ نئے بیاہے ہوئے جوڑوں میں نفاق ڈالتا اور انکی
باہمی الفت کا رشتہ توڑا کرتا تھا۔ کبھی عورت کو بیمار ڈال کر ایسا بدصورت بناتا کہ شوہر اس سے نفرت کرنے
لگے اور کبھی شوہر کو بدکاری سکھا کر دوسری عورتوں سے مانوس کرتا کہ بیاہتا بیوی سے دل ہٹ جائے۔
بادشاہ نے لوہے کی مار ہ داری۔ عبادت خانہ کے لیے پانی کے گھڑے بھر بھر کر لانے اور گارا بنانے
کی مشقت اس کو دی۔

(۴) "آذمی دیو" آیا جسکا سر بلند تھا اور بقیہ حصہ سانپ کی کنڈلی کی طرح تھا۔ کہ عادات چھوٹا تھا۔ موسم گرما میں بادشاہ سے گرد و غبار کے طوفان لاتا۔ اسکو بہت عزیز تھا بادشاہ نے اُس دیو کو بڑے بڑے پتھر زمین سے اٹھا کر بلندی تک لانے اور گردوں سے کی خدمت عنایت کی۔

(۵) سات خوبصورت اور نازک اندام پریاں آئیں۔ ایک کا نام "فریب" تھا۔ تھی۔ تیسری "لڑائی" تھی۔ چوتھی بولی کہ میرا نام "رشک" ہے۔ میں آدمیوں کی عقل چھین کر آپس میں دشمنی کا بیج بوتی ہوں۔ جب "جھگڑا" بھی میرے ساتھ ہوتی ہے تو میاں بیوی بھن میں تنازع پیدا کر کے اپنا دل خوش کرتی ہوں۔ پانچویں نے بتایا کہ میرا نام "طاقت" کی مدد کرتی ہوں۔ اغنیوں کا ساتھ دیتی ہوں۔ جو بد اقبال جو سے تباہ ہوتے ہیں اور جنکا نصیبہ سلطنتوں کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں۔

چھٹی کا نام "خطا" تھا۔ وہ بنی آدم کو گناہگاری پر مستعد کرتی تھی۔ چوروں کو ظلم آدمیوں کو بدی کے راستے بتاتی تھی۔

ساتویں کا نام "بدترین" تھا اور اُس کو سب سے زیادہ لطف اس کھیل میں ملتا تھا۔

بادشاہ نے ان ساتوں پریوں کو عبادت خانے کی بنیاد تیار کرنے کے لیے مستعد

(۶) ایک عجیب الخلقت دیو آیا۔ جسکے ہاتھ پاؤں سب اعضا آدمیوں کے سے دوسروں کے سر کھایا کرتا تھا تاکہ اپنے جسم پر سر پیدا کرے۔ موقع پا کر دوسروں کے سر ان پر چسپاں کرتا تھا مگر اُس کی گردن سے تیز شعلے آگ کے ہر وقت نکلتے رہتے کر دیتے تھے۔ اُس کے آنکھیں نہ تھیں۔ قوتِ لامسہ سے دیکھنے کا کام لیتا تھا۔ منہ سے آواز نکلتی تھی۔

اُس کا نام "حسد" تھا۔ بادشاہ نے اُس کو عبادت خانے کے سامنے استادہ اُسکی گردن سے نکلنے والے شعلے دن اور رات میں حاسدوں کو روشنی کا کام دیں۔

(۷) ایک دیو "عصا" نام آیا۔ اُس کی صورت شکاری کتے کی سی تھی۔ "حسد" کی نگرانی پر متعین کیا۔ اسی دیو نے بادشاہ کو سبز پتھر کی ایک کان بتائی جس۔ عبادت خانے میں لگایا گیا۔

(۸) ایک دیو گرجتا ہوا شیر کی صورت میں چنگھاڑتا ہوا آیا۔ اس کی روح ایسی لطیف تھی کہ وہ ظاہر میں نظر آسکتا تھا اور اُس کا فرض منصبی یہ تھا کہ بیماروں کو کمزور بنایا کرے۔ بادشاہ نے اُس کو حکم دیا کہ وہ اپنے دانتوں سے لکڑی چیر کر معماروں کے لیے سوختہ تیار کرے۔

(۹) ایک دیو آیا جس کی شکل تین سر والے اژدہے کی سی تھی۔ وہ بچوں کو رحم مادر میں اندھا گونگا اور بہرا بنا تا تھا۔ اور یہ خدمت بھی اُس کو پسند تھی کہ آدمیوں کو بلندی سے گرایا کرے اور اُن کی پسلیاں توڑ ڈالا کرے۔ بادشاہ نے اُس کو حکم دیا کہ وہ عبادت خانہ کے لیے آتش بنائے۔

(۱۰) ایک پری حاضر ہوئی جسکے جسم کا کوئی حصہ سوائے سر کے نظر نہ آتا تھا۔ اور اسکے بال پریشان تھے۔ وہ بولی کہ میرا نام "اوبیزت" ہے۔ میں کبھی سوتی نہیں۔ ہر وقت دُنیا کا گشت کرتی رہتی ہوں اور اس کوشش میں سرگرم رہتی ہوں کہ جس عورت کے بچہ پیدا ہو رہا ہو اس کو تکلیف دوں اور بچہ کو گلا دبا کر ہلاک کر دوں۔ اگر ایک جگہ میری سعی ناکام ہوئی تو دوسری جگہ پہنچتی ہوں۔ اور ہر وقت اپنے اسی دلپسند مشغلہ میں مصروف رہتی ہوں۔ بادشاہ نے دریافت کیا کہ اُس خوفناک پری کا دشمن کون ہے۔ بولی کہ "افاروفت" یعنی رافیل" میرا مخالف ہے اگر کوئی شخص اس نام سے واقف ہو اور عورت کے قلم پر زچگی کے وقت یہ منحوس نام لکھ دے تو میں اُس عورت سے دور بھاگتی ہوں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس موذیہ کے بال باندھے جائیں اور وہ عبادت خانہ کے سامنے عبرت کے لیے لٹکا دی جائے!

(۱۱) ایک جن آیا جسکا بدن اژدہے کا سا تھا مگر چہرہ اور پاؤں مثل آدمیوں کے تھے۔ اُسکی پشت پر اُڑنے کے لیے پنکھے اور اُس کی سانس کی شعلہ باری سے لکڑی میں خود بخود آگ لگتی تھی۔ بادشاہ نے اُس کو سنگ مرمر کے کاٹنے پر مامور کیا۔

(۱۲) ایک جن آیا جو آگے سے گھوڑا اور پیچھے سے مچھلی معلوم ہوتا تھا۔ وہ جہازوں کو غرق کر کے سمندر میں غرق کرتا تھا مگر بغیر پانی کے زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ بادشاہ نے ایک شیشے میں سمندر کا پانی بھر وا کر اُسکو شیشے میں قید کیا اور وہ آبگینہ عبادت خانے میں رکھوا دیا۔

(۱۳) ۳۶ بدشکل روحیں آئیں۔ کسی کا چہرہ مثل بیل کے۔ کسی کا مثل گدھے کے اور کوئی چڑیوں کے مانند۔ وہ سب "اندھیری کی رانیاں" تھیں۔ بادشاہ نے اُن کو عبادت خانے میں طہارت کے لیے پانی جمع کرنے کی خدمت پر تعینات کیا۔

(۱۴) عربستان کے ایک حاکم کی فرمائش سے وہ عیب دیو چمڑے کی مشک میں قید کیا گیا جو عربستان میں باد سموم چلاتا تھا۔ اس دیو کا نام افیبس تھا اور وہ پہاڑوں کو اُڑا سکتا تھا۔ جب وہ گرفتار ہو کر

تھا جو ہیکل کی عمارت تکمیل کے قریب تھی۔ ایک وزنی پتھر گزشتہ عمارت پر نصب کرنا تھا اور کوئی دیو جن یہ طاقت نہ رکھتا تھا کہ اس سنگ گراں کو عمارت کے بالائی حصہ تک پہنچا سکے۔ بادشاہ نے خاص ایک دیو کو حکم دیا کہ وہ اس بھاری پتھر کو چھت کی بلندی تک پہنچا دے۔ اسی وقت جبرئیل امین کا ایک زبردست [illegible] ہوا میں سے زور شور کی ہوا چلائی جو مستحکم ستون بن گئی اور اس پتھر کو ہوا میں روک لیا۔ وہ معلق پتھر جو ہوا کے ستون پر قائم کیا گیا تھا اس وقت تک بیت مقدس میں موجود ہے۔

کلامِ عظیم

(از جناب منشی علی عظیم صاحب عظیم تنہوی عظیم آبادی)

جو شخص صادق ہے کوئی ڈھونڈے تو پھر دنیا میں کیا نہیں ہے
اجل ہی لیکن دوا ہے اسکی ہے وہ مرض کہ جسکی دوا نہیں ہے

بتا جو گلو کو خوب دیکھا ذرا بھی ان میں وفا نہیں ہے
سمجھ کے دشمن ہی دیکھ لیجیے کوئی بھی ایسا ملا نہیں ہے

نہ تم وہ تم ہو نہ ہم وہ ہم ہیں خلوص باہم ذرا نہیں ہے
زمانہ بدلا نگاہ بدلی بتوں سے اسکا گلا نہیں ہے

کریم ہے وہ رحیم ہے وہ عطا کی حد انتہا نہیں ہے
جو بخش دیتا ہے بے طلب بھی تو احتیاج دعا نہیں ہے

یہ طے شدہ ہے کہ دہر فانی کسی کو اس میں بقا نہیں ہے
مگر وہ ذات خدائے واحد ہے جسکو ہرگز فنا نہیں ہے

فضول بیٹھے ہو منہ بنائے تمہیں تو ہم بھی کہا نہیں ہے
فقط ہوں قسمت کا اپنی شاکی کسی سے کوئی گلا نہیں ہے

فروغ از تمام ہوتا مگر نہ اتنا کہ دیکھتے ہیں
ابھی تک انکے رخ حسیں سے حجاب شاید اٹھا نہیں ہے

ابھی سے آنسو بہاتے دیکھو ابھی سے ماتم مناتے ہو کیوں
ابھی ہے عاشق میں جان باقی ابھی جنازہ اٹھا نہیں ہے

جو میں نہ ہونگا تو روح میری تمہاری الفت کا دم بھرے گی
یہی وہ شے ہے کہ جسکو ہرگز فنا نہیں ہے فنا نہیں ہے

کہا جو ان سے کہ اے مسیحا کرو علاج اس مریض غم کا
تو ہنس کے بولے ہمارے بس میں ترے مرض کی دوا نہیں ہے

بقا ہے بعد فنا جو حاصل تو اس فنا کو فنا نہ کہیے
فنا حقیقت میں وہ فنا ہے کہ بعد جسکے بقا نہیں ہے

یہ ہم نے مانا کہ اک زمانہ مخالفت پر تلا ہوا ہے
نہیں ہے پرسانِ حال کوئی تو کیا ہمارا خدا نہیں ہے

نگاہیں نیچی ہیں خشم آگیں مگر ہے لب پر حیا تبسم
تو اس ادا کو جفا کہوں کیا یہ سب وفا ہے جفا نہیں ہے

ہمیں سے باتیں بنا بنا کر صفائی اپنی دکھا رہے ہو
لیا ہے ہنس ہنس کے دل ہمارا یہ کیا فریب و دغا نہیں ہے

بڑی صفت ہے وہ حسن صورت جو حسن باطن سے متصف ہو
نہیں تو گل ہی نہیں ہے وہ گل کہ جس میں [illegible] نہیں ہے

حرم میں جا جا کے ہم نے دیکھا صنم کدے میں بھی خوب ڈھونڈا
خدا ہی جانے کہ ہو گیا کیا کہیں بھی دل کا پتا نہیں ہے

[illegible] ادا شناس عظیم ہوں میں
بروں میں ہر چند وہ برا ہے بھلوں میں لیکن برا نہیں ہے

سیرت مرزا

(از جناب منشی ممتاز حسین صاحب شائق - ایڈیٹر اودھ پنچ - لکھنؤ)

(بسلسلۂ الناظر ماہ ستمبر)

وزیر گنج سے اُٹھ کے جناب مرزا نے کلّن کی لاٹ کے قریب نوّے سال کے ٹھیکے پر ایک زمین لی اُس میں نہایت خوبصورت بنگلا بنوایا۔ فرن ہوس تیار کیے پھولوں کے نفیس گملے لگائے فرنیچر بھی اپنی بضاعت کے موافق خریدا میز کرسی الماریاں الم غلم سب کچھ تھا۔ مگر دوسروں کے لیے۔ یعنی جب کوئی آجاتا تو وہاں بٹھایا جاتا۔ اپنے مطالعہ کی کوٹھری میں چٹائی، گاؤ تکیہ، اگالدان، پیچوان، لالٹین، ٹھیا پھوس چراغ ہی رکھا۔ (پھولوں اور درختوں کا عمر بھر شوق رہا) اس زمانے میں کیمیا سازی کا شوق باقی نہ رہا تھا محض شاعری کی دھن تھی۔ مرقع لیلیٰ مجنوں اسی مقام پر تصنیف ہو کے مطبع شوکت جعفری گولا گنج میں بہ اہتمام قاری یعقوب علیخاں مرحوم نصرت چھپا۔ اس زمانے میں بندہ آپکی خدمت میں زیادہ حاضری نہ دے سکا۔ اور میں نے سنا کہ سرکار نے یک لخت بنگلے کو سلام کیا۔ مالک زمین کے مالک کے حوالے کی۔ اور گھسیاری منڈی میں گنگ صاحب کے اسپتال کے محاذی سکونت اختیار کی۔ اس مکان سے قریب محمد مرزا صاحب موج رہتے تھے۔ اُنکی فرمائش اور اپنے ذوق سے مثنوی امید و بیم تصنیف کی جسکے بعض اجزا جناب ہمزہ نے اپنے مضمون مندرجہ "زمانہ" کانپور میں نقل کیے ہیں۔ محمد مرزا موج ایک پریس کے مالک تھے۔ ہم محلہ ہونے کے سبب سے انکی آمد و رفت رہتی تھی۔ ایک رسالہ "مطلع فرق" بھی انکے یہاں سے نکلتا تھا "افشائے راز حرف غریب خانہ" غالباً انہیں کے پریس میں چھپا۔ یہ جناب مرزا کا پہلا ناول ہے۔ محترمی جناب ن۔ م۔ الماجد بی۔ اے مشہور فلسفی نے اپنے مضمون (رسالہ ہندوستانی "حقیقت") میں اسکے نمونے جابجا سے پیش کیے ہیں۔ غالباً گھسیاری منڈی میں قیام کی وجہ یہ ہوئی کہ ازابیلا تھوبرن کالج میں شب کو ایک گھنٹہ پڑھانے کی ملازمت کرلی تھی اور وہ گھسیاری منڈی سے نزدیک تھا۔ ان دو تصنیفوں کے سوا جہاں تک مجھے یاد ہے یہاں کے قیام میں اور کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی ـــ دفعۃً سنا کہ جناب مرزا نے کالج کی نوکری چھوڑ دی اور گولا گنج ہی میں چلے آئے (میں اُدھر ایک مدت سے گیا نہیں خدا جانے جنگو خاں کی گلی اب ہے یا اُسکا نقشہ بدل گیا) قاری یعقوب علیخاں نصرت [illegible]

مرحوم شیو دت سنوا، بھیرو میر دھیان آگر برہم ملازم ریاست محمود آباد و سید محمد عسکری بسمل مرحوم یہ لوگ جناب مرزا کے پڑوسی تھے۔ میں بھی اس مکان سے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر رہتا تھا اور یہاں سے اودھ پنچ کا دفتر بھی دو سو قدم یا اس سے فرلانگ کھنچا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جناب مرزا کے نقل مکان کی خبر منشی محمد سجاد حسین مرحوم سابق مالک اودھ پنچ نے بطور ایک مژدہ کے سنی تھی۔

"ہاں! مرزا صاحب اس قدر قریب آگئے۔ بھئی خوب ہوا"

اس مکان میں جناب مرزا پر افلاس غالب تھی۔ خرچ زیادہ تھا۔ ایک نوکری چھوڑنے سے آمدنی کم ہو گئی تھی۔ اسکی کسر ناول نویسی کے پیسے سے نکالی جاتی تھی۔ — بابو پرشاد دوڑا ہر وقت حاضر رہتے تھے: "استاد! کاتب پریشان کرتا ہے۔ امراؤ جان ادا کو جلد ہی ختم کر دیجیے"۔ یہ آوازیں ہر وقت سنی جاتی تھیں۔ اکثر منشی سجاد حسین مرحوم بھی تشریف لاتے تھے (مکان قریب ہونے کی وجہ سے) مولوی شرر، نواب محمد شفیع علیخاں عرف نواب بڈھن صاحب (یہ جناب مرزا کے مخصوص احباب میں سے ہیں) آغا حاذق اور دیگر حضرات بھی گاہے ماہے شریک صحبت ہوتے تھے۔ دوسری سمجھ میں مشکل سے آتا کہ ایک آدمی کتنے کام ان دنوں میں کر ڈالتا تھا۔ امراؤ جان ادا۔ ذات شریف۔ شریف زادہ ایک یونانی ڈرامہ کا ترجمہ (طلسم اسرار حسن یا افلاطون کے ... ریاست ... کا تذکرہ ہے) یہ جلد تصنیفیں یہیں کی یادگار ہیں۔ "ربع مرزائی" یہیں شروع ہوئی۔ کئی اصطرلاب اسی جگہ بنائے گئے۔ بنگلہ یا مختلف تھا۔ ایک اصطرلاب تین فٹ کے قطر کا صفحات برنجی پر گڑھا گیا۔ یہ مجھے اس وجہ سے یاد ہے کہ اسکی ساخت کی حالت میں مجھ غریب پر ایک بالائی مصیبت نازل ہوئی۔ یعنی میں مرزا کے حکم سے قوسوں کو پیمائش کر رہا تھا اور خطوط جہاں پر گڑے تھے وہاں نشان لگا رہا تھا کہ پڑوس میں دو شاعر مضامین شعری کی طرح لڑے۔ مگر مسجد کا بازار بنا۔ سنگ باری شروع ہوئی۔ ایک بڑا سا پتھر میری پشت پر اس زور سے پڑا کہ میں پھر اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا گر گیا۔ آج تک گومڑا ہوا ہے یہ چوٹ ابھری ہے۔ رسالہ ربع مجیب و اعمال ربع مجیب، اصطرلاب سازی یہیں مرتب ہوا۔ علم ہیئت کے انہماک نے کالج سے لغزت دلائی۔ جناب مرزا نے چھ مہینے کی رخصت کالج سے لی اور اپنی جگہ پر سراج الدین ابو بکر علامہ فدا حسین بن عیش تیمی اموی کو عوضی کے طور پر (ماہانہ بیس شاہرہ) مقرر کرا دیا۔ یہ چوتھائی تنخواہ گمشت ملی اور ایک ہی ہفتے میں صرف ہو گئی ——

۱۔ عشرت۔ نادوکشتہ نے گھر الگ کرایا، اگر وہ تھا کہ تو رزیل نہ آیا — وہی خوشدلی وہی

تھا جیسا کہ جبری پابو کی جگہ مطلب کرتے تھے۔ اُن کا علاج ہوا۔ ڈاکٹر نے لاکھ چاہا کہ ارنیا میں اگر کسی طرح
کوئی ایک افیون کا نسخہ قبول نہ کیا۔ نسخہ دیکھتے اور اگر کوئی ایسا جزو نظر آتا تو فوراً پھینک کر دیتے۔ دیکھتے ہی طبیعت اور صحت ہوگئی تھی
دو ہفتے میں وہ قیم الحروف اپنے نفس کو ملامت کرتا یا جناب مرزا کی خوشامد میں وکام تھے۔ جن پر وہ ہنستے
تھے۔ آخر ایک روز فرمانے لگے کہ میں نے آپ کے فرمانے سے افیم نہیں چھوڑی۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ والد
مرحوم نے مجھے نصیحت کی اور فرمایا کہ خبردار افیون کبھی نہ کھانا۔ تمہاری ہجو پہ مجھے اُن مرحوم کی نصیحت یاد
آگئی۔ تم کیوں کڑھتے ہو۔

دو تین ماہ تک ترک افیون کے بعد اُن کی صحت بحال رہی۔ گویا پھر سے جوان ہوگئے۔ گالوں پر سرخی
ڈیل میں توانائی، غذا میں ترقی، اعضا میں چستی۔ مگر اس قلیل مدت کے بعد ضیق النفس کا پرانا مرض عود
کر آیا۔ پھر تو اللہ دے بندہ لے۔ ایک دریا رطوبات کا سینے سے جاری ہوگیا۔ آنکھوں سے ہر وقت
آنسو بہتے۔ یہ کیفیت ایسی تھی کہ ڈاکٹروں اور حکیموں نے بالاتفاق افیون تجویز کر دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ آپ
کی زندگی افیون کھانے پر منحصر ہے۔ نہ کھائیے گا تو یہ ایک نوع کی خودکشی ہوگی۔ جب شرعی حیثیت سے
مجبور ہوئے تو استعمال بہ ہدایت حکیم کا پھر شروع کرنا پڑا۔

اس زمانے میں میرے والد مرحوم نے اپنے ایک گاؤں (جبری ضلع بارہ بنکی میں جو مسلمانوں سے آباد ہے)
میں مسجد اور کنویں کی ڈالی۔ میں نے جناب مرزا کو کہتے سنا تھا کہ یہاں کی اکثر مسجدیں سمت قبلے
سے منحرف ہیں اس وجہ سے کہ وہ قطب تارے یا قطب نما کی مدد سے بنی ہیں اور انھیں سے خط مشرق و
مغرب نکال کے مسجدیں بنائی گئیں۔ حالانکہ سمت قبلہ یہاں کے عرض البلد کے حساب سے ٹھیک مغرب
کی جانب نہیں تخمیناً دس بجے کا فرق ہے۔ ۵ درجے کہہ دینے کو تو کوئی حقیقت نہیں رکھتے لیکن ہزاروں میل
کا تفاوت ہوجاتا ہے۔ میں نے والد مرحوم سے درخواست کی کہ سمت قبلہ درست کرنے کے لیے جناب
مرزا سے فرمائش کی جائے۔ جناب مرزا کے پاس اُس وقت آلاتِ رصدیہ میں سے کوئی علاوہ آلہ بجز چند
خود ساختہ دوربینوں کے اور ایک چھوٹے سے رُبع مجیب کے نہ تھا۔ جب اہل قبلہ کا یہ ڈیپوٹیشن گاؤں
پہونچا تو شب ہوگئی تھی۔ معمار صاحب مسجد کی نیو بھر چکے تھے۔ جناب مرزا نے قطب تارے کو داہنی طرف
رکھے ہوئے انگارے خط شعاعی کے محاذی رکھے۔ اور قبلہ کی سمت کی بنیاد پر ایک سہاول کا
ڈورا انھیں انگاروں کے برابر پھیلانا شروع کیا۔ یہ عمل سربسجود ہونے کی حالت میں پورا کیا جاتا تھا۔
عجب سماں تھا۔ ایک انگارا رکھا۔ ایک آنکھ بند کی۔ کلا نیو پر رکھا۔ اس کے بعد دوسرا انگارا ایک بالشت
کے فاصلے پر رکھا۔ اب دونوں انگاروں سے خط شعاعی تارے کا ملانا اور ڈورا بالشت بڑھانا ا۔

نصف النہار کھینچا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ قطب کی سمت اور دیوار کی سمت ٹھیک معلوم ہو گئی۔ یہ عمل میری سمجھ میں نہ
آیا۔ مگر یہ معلوم ہوا کہ اگلے زمانے میں اسی طرح سمت دریافت کی جاتی تھی۔ حضور نے جہاں قطب تارا دیکھا
۔ جناب مرزا نے فرمایا کہ باعتبار قطب تو یہ دیوار صحیح ہے مگر یہی دلیل ہے اس کی کہ قبلے سے منحرف ہے۔
شب گزری۔ دن نکلا۔ تو قطب تارے نے اس خط میں جو ڈورے اور انگاروں کی وجہ سے کھینچا گیا تھا کوئی
دو سمت کا فرق نکالا۔ اب اس نمونے کے اتار پر ایک جگہ سطح کی گئی۔ چنانچہ سے آناہیں پڑنے کے بعد
سطح پر ایک دائرہ کھینچا گیا۔ شرح چغمینی ملخص الہیأۃ پڑھ چکا تھا لہذا سمجھ میں آگیا کہ دائرہ ہندیہ کی مدد
سے ایک خط مشرق و مغرب جنوب و شمال نکالنا مقصود ہے۔ دن بھر اسی تاپ جوکھم میں صرف ہوا۔ اب
نگاہوں سے چلئے تو میں نے انہیں متفکر پایا جس کی وجہ سمجھ میں آئی۔ لیکن دوسرے دن معلوم ہوا کہ جو
خط سمت قبلہ پر مرزا کے واسطے دکھانے گئے تھے انہوں نے شوق ہیأت کے جوش میں پھر سے
آگ لگا دی۔ کھلاڑی ہوئی چنگاریاں پھر بھڑک اٹھیں۔ مکان پر ایک نفر بمعنی تختے چبوترا اور چوتھائی
دائرے کی شکل میں بنا ہوا تھا۔ ایک بڑا ربع مجیب تیار ہو رہا تھا۔ جناب مرزا مسطح و جنوبی و شمالی
کی فکر میں تھے۔ متعدد پرکار اور اوزار پھیلے ہوئے تھے۔ ۔ ۔ جے کاٹے جا رہے تھے۔ سنگ مرمر کی ایک
بیز کا چکنا تختہ زمین پر دھوپ گھڑی کے واسطے نصب ہو رہا تھا۔ ساعات و دقائق کے نشان کھینچے
جارہے تھے۔ پاس سے شاہی زمانے اگلا تاریخی زمانے سے پیشتر کی پیتل کی ایک بڑی سی گول
قندیل آگئی تھی۔ اس کی کاوش بیچ سے پوری تھی یعنی کرہ بنا ہوا تھا۔ لیپ کے ٹھیک ٹکڑے تاروں
متعدد چھوٹے بڑے سطحے چھت میں آویزاں تھے گویا تمام آسمان مع نجوم کے ساتھ اس بالشت بھر
پر اتر آیا تھا۔

خدا جانے جناب مرزا کو کہاں سے کتابیں دستیاب ہو جاتی تھیں۔ زیچ کوشیار۔ زیچ الغ بیگی
زیچ ملک شاہی۔ زیچ بہادر خانی۔ جامع بہادر خانی۔ مرایا و مناظر اقلیدس۔ رسالہ صنعت کرہ از علم
الجغری الرومی۔ جدول اسامی کواکب و معرفت طول و عرض و جہت۔ رسالہ معرفت اصطرلاب از محقق طوسی
چند کتب سنسکرت ایک سمت ڈھیر ہیں۔ صفحہ عنکبوتیہ کی تشبیک ہوئی۔ پھر وہی صفحہ شیشے کا گڑھا
کہ تشبیک کی ضرورت نہ رہے۔ حجرہ الگ تصنیف ہو رہا ہے۔ بیک وقت حضرت مرزا پڑھتے
بھی پاس پہنچتے ہیں معمار کا کام بھی دیکھتے ہیں۔ حساب بھی لگاتے ہیں دستکاری میں بھی مصروف
ہیں۔ چند کام احباب کے سپرد کیے گئے ہیں یعنی لینا امتیاز حسین صاحب زیدی بڑے بھائی کا

اں سُگتے میاں تم بیٹھے کیا کرتے ہو۔ ذری سامامات کے نشان نیچے کرو۔ اسے بھئی ننھے (آغا ولی مرزا کے بڑے صاحبزادے) تم سے باریک تار منگایا تھا۔ ابھی تک نہ لائے۔ اب میں ملتوں بیٹھے کیا کروں؟ اجی (شاہ جہاں مرزا) تم انیس آدمی ہو۔ بیر کا چھلکا کنویں میں آنا سنے والے۔ ذری اس گھڑی کو چھیلا تو سہی۔ جو سامنے آیا اسی کارخانے میں بھرتی کر دیا گیا۔ دماغی کے تمام اعمال سکوت و فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر یہاں جمعیت حواس کی وہ فراوانی ہے کہ لطیفے بھی ساتھ ساتھ ہوتے جاتے ہیں کیا مجال جو ساتھ والوں کا جی گھبرا سکے۔ ٹوٹی ہوئی گھڑیوں کے سینکڑوں پرزے ایک کھلے ہوئے بکس میں رکھے ہیں۔ سوراخ کرنے، ڈانکلٹے، پینے، پیچ بنانے، نرہ تراشنے کے اوزار چھوٹی بڑی آریاں، رندے ایک بکس میں، نیا تیار سے آلات ایک بکس میں۔

ہاتھ رکھنے کے لیے سان بنانے کی فکر ہوئی۔ خیال آیا کہ بابا جی سے پوچھیں۔ پھر کچھ سوچ کے ڈونڈا لگن گلے میں ڈالی فرمایا آؤ تمنے میاں تمھیں اپنے والد کے ایک دوست سے ملا دیں۔ یہ گھڑی سازی اور دنداں سازی کا کام کرتے تھے۔ مکان انکا جبوائی ٹولے اسی طرف اونچی سیڑھیوں والی گلی کے سامنے نالے کے اوپر تھا۔ بھلا سا نام تھا حافظ رحمت خاں یا رحیم خاں۔ یا رحمت اللہ خاں۔ اسی برس کے قریب عمر تھی۔ ٹھیک ٹھیک دوپہر اُنکے گھر پہنچے۔ وہ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ ”ارے بھئی کہاں چلے؟“ کہنے لگے جی ہاں۔ سان بنانا چاہتا ہوں نسخہ بتا دیجیے۔ انھوں نے کہا کرنڈ کا پسا ہوا چھوڑے لو اور چپڑا لاکھ۔ لاکھ گرم کرو اور کرنڈ ملاکے بناؤ۔ بس سوال جواب کے ساتھ ملاقات ختم۔ سیدھے اپنے نالے آئے۔ کرنڈ مول لیا۔ لاکھ خریدی۔ جلدی کا خدا بھلا کرے لاکھ پگھلی کرنڈ ملایا چپاتی کی طرح چنکیر بنانے لگے۔ بھلا گرم لاکھ اور گوشت کا مقابلہ ہی کیا۔ انگلیوں میں کئی چھالے پڑ گئے ہوا جو لگی تو لاکھ انگیٹھے کے ٹھنڈی پڑ گئی۔ ایک ٹیڑھا میڑھا سا بن کے رہ گیا۔ (اسی طرح سان بنتے دیکھ چکے تھے) میں اس حرکت پر ہنس پڑا، تو جھلا کے ”واہ آپ ہنستے ہیں یہاں ہاتھ جھلس گیا“ میں نے کہا کہ مضمون نہ تو کیا کروں۔ بار بار ہاتھ جلے گا، کان کھینچنے ہونگے۔ بنی بنائی سان خریدیے۔ آپ تو اگلے زمانے کی صنعتی ڈھکوسلوں میں بیکار پھنستے ہیں۔ کہنے لگے پھر؟ آپ کوئی آسان ترکیب بتائیے۔ میں نے کہا ایک بوتل اسپرٹ کی منگائیے۔ بس اتنا سنتے ہی میری پشت پر ہاتھ مارا۔ خوش ہو گئے کہ خوب سوجھی لاکھ اسپرٹ میں ڈال کے دھوپ میں رکھ دی جب وہ پگھل گئی تو کرنڈ ملا کے ایسی عمدہ گول سڈول سان بنائی کہ اس فن کے ماہر کیا بنائیں گے۔ کئی ٹکیاں کئی سائز تیار ہو گئیں۔

سان جو گھٹے میں جڑی جا رہی تھی کہ شمس العلما خواجہ حالی مرحوم ملاقات کی غرض سے تشریف لائے

خواجہ غلام الثقلین مرحوم انکے ہمراہ تھے۔ بہت مشکل سے کرکری خانہ جو پھیلا ہوا تھا سمیٹا گیا تب
آنکھ بیٹھنے کی جگہ ملی۔ اب شاعری چھڑ گئی۔

سامان کا سامان پیکنگ تھے تو واپسی میں پہاڑ کی طرح امرود کی جیلی میں رنگ بھرنے کے لیے گرم پانی
بھی مول لیا گیا تھا۔ جناب مرزا بعض چیزیں خوب پکاتے تھے۔ آم کا پناؤ، امرود کی جیلی۔ کوکو کباب
فرنگی جیلی کھائی گئی۔ اور خواجہ کے استفسار پر ان آلات رصدیہ کے مقاصد و فوائد بیان ہوئے
یہاں عجیب سے صبح وقت بغیر گھڑی دیکھے بتا دیا۔ آخر صبح شب کی یہ صحبت برخاست ہوئی۔ (یہ
تذکرہ غالباً ۱۹۰۸ء کا ہے)

غالباً ۱۹۱۰ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس یہاں ہوا تھا۔ نواب محسن الملک نواب وقار الملک
سر آغا خاں، نواب احمد خاں - پروفیسر ضیاء الدین - سید جعفر حسین انجینیر (یہ مرزا کے ساتھ کے پڑھے ہوئے
صادق دوستوں میں سے تھے) ایک فٹن گاڑی پر سوار روانہ ہوئے اور اس بابت میں مشورہ ہوا
کہ یہاں کے مولویوں نے کانفرنس کے بائیکاٹ کا حکم دیا ہے اسکا علاج کیا ہے۔ کوئی ایسی تدبیر ہے
کہ یہ لوگ راضی ہو جائیں؟ جناب مرزا نے ہامی بھری کہ میں کوشش کرونگا۔ خیر یہ تو الگ بات میں
بات مکمل آئی۔ مگر اسی کانفرنس میں حسین آباد ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مرزا حبیب حسین بی اے نے
اپنے ترتیب دیے ہوئے اردو شارٹ ہینڈ پر تقریر کی۔ اثنائے تقریر میں فرمایا کہ "آپ لوگوں کو کچھ بھی
پروا نہیں۔ میں نے اس فن کی ایجاد میں راتوں کی نیند حرام کی، اپنے کندھوں پر اینٹیں
اٹھائی ہیں"۔ راقم الحروف اور جناب مرزا دونوں قریب ہی بیٹھے تھے جناب مرزا نے مجھ سے فرمایا کہ "یعنی
شب بیداری تو خیر متفکر آدمی سے بعید نہیں۔ یہ اینٹوں کی ضرورت کیا تھی۔ شارٹ ہینڈ بھی کوئی زیر تعمیر محل
ہے؟" میں چپ ہو رہا۔ جلسہ کوئی شام کو پانچ بجے ختم ہوا۔ گھر لوٹے تو سیدھے راستے سے نہیں بلکہ قیصر باغ
سے امین آباد آئے اور نولکشور روڈ کے سپلر کے یہاں سے انگریزی شارٹ ہینڈ مینول مول لی۔ مکان پر
پہونچے اسکا مطالعہ کیا۔ مجھ سے فرمایا کہ "واللہ اس میں ایک قلم اور تھوڑے سے کاغذ کے سوا ہرگز اینٹوں
کی ضرورت نہیں"۔ راقم الحروف نے اسی دن اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ اب اردو شارٹ ہینڈ ضرور
ایجاد ہو جائے گا۔ چنانچہ اس ہینڈ کی خبر ۱۹۱۱ء کے آخر میں نکلی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مجھے بھی عارضی طور پر کچھ روپیہ کی ضرورت تھی۔ میں ایک مقدمہ ہار گیا، اسکا خرچ
پندرہ سو کے قریب میرے ذمے عائد ہوا۔ کھانے پینے کی تو فکر نہ تھی مگر اس بار عظیم نے جسے میں اپنے والد پر

مرحوم اور خواجہ غلام السبطین (سلمہ اللہ) نے خیرپور سندھ میں اتالیقی کی ایک جگہ خالی تھی وہ میرے واسطے تجویز کی۔ دو سو روپیہ ماہوار سے ہوا اور تقرر منظور بھی ہوگیا۔ شمس العلماء مولانا حالی مرحوم نے عربی و فارسی پروفیسر کی جگہ سیوائی کالج جے پور میں ڈھونڈھ نکالی۔ ارادہ ہوا کہ وطن چھوڑوں مگر جناب مرزا نے روکا: کہاں جاؤگے۔ یہیں پیارنگی (طباعت) کرو انشاء اللہ ملیگا۔ تیس روپیہ ماہوار ایک گھنٹا روزانہ کام کرنے پر یہاں بھی مل سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ مسٹر ینڈلی (پرنسپل پٹنہ کالج) حکومت آگرہ و اودھ سے اردو شارٹ ہینڈ تیار کرنے کی اجازت لے آئے ہیں۔ یہ کام میرے اور مسٹر مہی لال گھوش (شارٹ ہینڈ پروفیسر) کے متعلق ہوا ہے۔ میں اصطلاحات وضع کر رہا ہوں۔ مسٹر گھوش اوٹ لائن تجویز کرینگے تم قواعد کے متعلق شقیں بنانا روابط (گرامالوگ) وغیرہ وغیرہ جیسے بنانا۔ اردو میں جو حرف زیادہ آتے ہیں اُنکے واسطے آسان علامت مقرر کرنا۔ جو الفاظ کثرت سے آتے ہیں اُن کی فہرست تیار کرنا کہ اُنکی تخفیفی صورت ایجاد ہو۔ سلسلے سے تحقیق یہ کرنا کہ اردو میں کون حرف کس حرف کے ساتھ کبھی جمع نہیں ہوتا۔ اور مختلف صورتوں میں ملاپ کرا دینے کے بعد التباس ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ کام تمہیں کرنا پڑیگا۔ تمہارے واسطے آسان ہے۔ دوسروں کے لیے مشکل۔ اچھا یہ ایک سال گزر جائے گا اسکے بعد ایک جگہ ضرور مدرسی کی بھی نکلیگی اور تنخواہ بڑھ جائیگی۔ حاصل کلام یہ کہ انھوں نے مجھے روک لیا۔ مگر میں نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ مشن کا کام ہے ہمیں اُجرت کا نہ تو معقول ملیگا۔ نہ بدیں یا شکایت کیے جائیں گے ہوا تو یہی جو میں نے کہا تھا۔ یہی غنیمت ہے کہ جناب مرزا کا اور میرا نام اردو شارٹ ہینڈ میں نظر آتا ہے ورنہ مشن نے میری غیر حاضری میں اس سے بھی گریز کرنے کی ٹھان لی تھی (دسمبر ۱۹۰۹ء میں ملتبی یا بقول مرزا "بیارگشی" کی ضرورت سے مجھے میرٹھ جانا پڑا۔ کتاب چھاپی گئی اور سرورق سے میرا نام اُڑا دیا گیا۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے میرٹھ سے جب باقاعدہ نوٹس دیا تو پبلیکیشن میں نام درج ہوا) اس کام کے عوض میں جناب مرزا کو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار علاوہ کالج کی تنخواہ کے ملتے تھے۔

[illegible] ہی میں مولانا محی الدین ابوالکلام آزاد نے ٹائپ کی بورڈ اور ٹائپ کا وضع کرکے جناب مرزا کے حوالے کیا مگر نامکمل تھا۔ اور جب بعض الفاظ کے جوڑ ملائے گئے تو ٹھیک نہ اُترے حروف کی صورت بھی جیسی کچھ کہ چاہیے قائم نہ رہی۔ کچھ اور بھی ہوگی۔ غالباً مولانا ٹائپ رائٹر کی مشین سے واقف نہ تھے۔
جناب مرزا کو بھی شوق ہوا کہ اردو ٹائپ رائٹر کسی طرح بن جائے۔ اتفاق سے گورنمنٹ نے پولیس کالج میں پولیس کو سکھانے کے لیے ریمنگٹن مالکۃ الکتابۃ (ٹائپ رائٹر) کی چار کلیں بھیجیں۔ یہ عربی حروف کی تھیں۔ صرف ٹ۔ پ۔ ڈ۔ چ وغیرہ اس میں بڑھا دی گئی تھیں۔ مسٹر [illegible] صاحب پرنسپل نے ریمنگٹن کمپنی

پہنچ جاتے۔ رصد کا وقت بیلو یا ایک ساون کا ہوکے تھا اس سے حاضر ہونے پر کبھی کا بھی شغل تھا۔ زیچ مرزائی اس زمانے میں تو تکمیل تک پہنچ جاتی تھی۔ کالے پہاڑوں پر ایک پرانی مسجد ہے۔ بڑا برج عجیب اُس پر نصب کر دیا گیا۔ یہ اندیشہ بھی دوستوں نے ظاہر کیا کہ مبادا کوئی چرا لیجائے۔ فرمایا کہ چند تختے ہیں اگر کسی کا بھلا اس میں ہو تو لیجائے۔ قیمتی چیزیں مثلاً دوربین۔ سماور۔ چٹائی۔ جانماز۔ کتابیں۔ پیالی۔ آفتابہ۔ سامانِ تحریر وغیرہ کو خادم مسجد پہنچاتا، رات کو واپس لاتا۔ ہُو کا مقام تھا۔ بوئے عمرانیات سے محروم۔ کھیتوں کو روند کے راہ بنانی پڑتی تھی۔ اکثر امرود کے کچھ دوستوں کا شغل ہوتا۔ ساتھیں بھی مجبوداً زیچ کی دشواری میں دخل تمام ہے۔ کالے پہاڑوں سے پلٹ کے جب باغ میں آتے تو رات میں شاعری ہوتی۔ ایک نے کہا ع نہ آکے کالے پہاڑوں کو دیکھو۔ دوسرے نے مصرعہ لگایا ع ہمیں دیکھو اور ان پہاڑوں کو دیکھو۔

۱۹۱۰ء تک یہ زیچ مکمل ہوگئی۔ مذاہب سے جان چھوٹی۔ اسکے بعد مذہبی کتابوں کا پھر دور ہوا۔ غالباً ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء میں جناب مرزا نے دوبارہ سفر حیدرآباد کیا اور اس خیال سے کہ مبادا وہاں بھی نہ لگے، دیکر حیدرآباد کالج سے چھٹی لی استعفا نہیں دیا۔ ہر کالج میں انہوں نے فلسفہ، طبیعیات، تاریخ، ریاضی، عربی، فارسی ہر مضمون میں کام کیا۔ نہایت نیکنام رہے۔ ہر ایک پرنسپل ان کا مداح۔ ہر طالب علم انکا بہی خواہ۔ اکثر ایسا ہوا کہ بیمار پڑے تو پرنسپل نے اجازت دے دی کہ مولوی صاحب کے گھر پر جا کے پڑھ لو۔ یہ بات کسی پروفیسر کو حاصل نہ تھی۔ کہ جب جی چاہے جائے جب مرضی ہو نہ جائے۔ درخواست عارضی مہلت کی اکثر لکھتے ہی نہ تھے۔ کسی دوست سے کہدیا چلے جاؤ۔ آسان سبق فارسی عربی کے ہیں پڑھا دینا۔ یا ماسٹر کے بیٹے آ آ کبھی تنخواہ بڑھ جاتی کبھی گھٹ جاتی بہرحال وہ خوش رہتے۔ اکثر شاگردان کالج ہر دن بدل وا جود گھر پر انکے پڑھ جاتے۔ انہیں بالکل بخل نہ تھا۔ عادت یہ تھی کہ اگر دوستوں میں سے کسی نے نادانی کی بات کہی تو اکیلے میں اُس غلطی کو نہایت ہمدردی کے ساتھ سمجھا دیتے۔

چنانچہ دسمبر ۱۹۱۰ء میں بتقریب جلسہ انجمن جعفریہ۔ مظفرنگر یا مشتہ نگر جانے کا اتفاق ہوا۔ میں بھی ہمراہ تھا۔ مظفرنگر پہنچ کے معلوم ہوا کہ چار روز قبل ہم لوگ پہنچے۔ رسالہ ترقی لاہور جو پنجاب ریلیجس سوسائٹی نکالتی تھی۔ اسکے اڈیٹر مسٹر فضل مسیح تھے سوسائٹی نے تاریخ مذہب کا ایک مستقل عنوان قرار دیا تھا اور بذریعہ تحریر بعض مذاہب کی تاریخ مجھسے لکھنے کی فرمائش کی تھی — اُجرت میرے نزدیک تھوڑی تھی۔ ہم نے چاہا کہ لاہور جا کے بالمشافہ اجرت طے کریں۔ عین کرسمس کے روز لاہور پہنچے۔ معاملہ طے ہو گیا۔ واپس آئے۔ مظفرنگر کے جلسوں میں منشی نذیر حسین صاحب سخا اور سید محمد علی صاحب اصفہانی داعی اسلام

وہاں بعد تھیر نظام (حاجی دکن) سے ملاقات ہوگئی۔ ان لوگوں کو دہلی میں ایک کام تھا۔ انکے ہمراہ ہم بھی دہلی گئے۔ مجھ سے والد مرحوم نے فرمائش کی تھی ایک جوڑا سلیم شاہی لیتے آنا۔ ہم سب مسافر دہلی تھے بیٹھے تھے۔ دکان پر گئے دکاندار نے بہت آؤ بھگت سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جب میں ایک جوڑا خرید چکا تو صاحب زادے دکان دار نے گھوڑے ہو کے منہ سے سیٹی بجائی اور انگلیاں ٹیڑھی کرکے چلے جانے کا اشارہ کیا ساتھ میں ایک گنوار دل دیہاتی بھی تھے۔ انھیں تاؤ آگیا اور دکان دار کے منہ پر تڑ سے ایک تھپڑ رسید کر بیٹھے۔ تھپڑ انھیں سے شامت کی فوج کی شکل کیسے۔ دس بارہ دکان دار اپنی دکانوں سے اتر پڑے لپا لیا۔ نوبت [illegible]۔ خیریت ہوئی کہ جناب مرزا کے ایک دوست ڈاکٹر مرزا آقا سمع علی کوٹھے پر سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے جناب مرزا لے۔ ادھیڑ بڑھاپا تھی، اس وجہ سے انھیں سنبھلنے میں کسی قدر دشواری پڑی۔ مگر ہنگامہ دیکھ کے جلدی سے نیچے اترے ڈاکٹر صاحب کا اس محلہ پر اثر تھا۔ تمام دکان داروں کو [illegible]۔ تم لوگ انتہا کے بے مروت ہو۔ یہ چند مسافر آکے دکان پر بیٹھ گئے تھے۔ کچھ ایسی بات نہ تھی جس کا [illegible] کیا تھے۔ آپ لوگ میرے ساتھ۔

رسید [illegible] بخیر گذشت

ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں پہنچنے کے بعد جناب مرزا نے اپنے دیہاتی کرم فرما سے صرف اس قدر باز پرس کی کہ "حضرت یہ آپ کا گاؤں نہیں ہے۔ دلی کا بازار ہے۔ آج آپ نے وہ حرکت کی تھی کہ جتنے سلیم شاہی ان دکانوں پر تھے سب ہم لوگوں کی چندیا پر ٹوٹتے۔" یہ چند کلمے ایسے موثر ہوئے کہ دیہاتی غریب آبدیدہ ہوگیا۔

کیسی ہی کسی سے شکایت ہو، ادنیٰ معذرت پر دل صاف پھر عمر بھر اس بات کے متعلق ایک حرف زبان پر نہ لاتے۔

نہایت منکسر المزاج ساتھ ہی اسکے غیور و خوددار۔ احسان لینے سے دور بھاگتے۔

دوسروں کے ذاتی معاملات میں کبھی دخل نہ دیتے۔

کسی بات پر اصرار نہ کرتے۔

جھوٹ سے بہت نفرت تھی۔

وعدہ کرکے حیلہ حوالے اور وعدہ کبھی نہ پھرتے — ہاں معقول عذر ہو تو انکی بات ہی دوسری تھی۔

وطن کی محبت رکھتے تھے۔ انگریزی وضع قطع سے بہت گھبراتے تھے۔ ہمیشہ الگ سے رکھا۔

[illegible]

قلم لکھ لیا۔

ظاہری اور اضافی صفات یا القاب سے بے پرواہ تھے۔

کیسی ہی حیثیت کی چیز ہو اگر کھو گئی تو زیادہ افسوس نہ کرتے تھے۔ ایک حضرت بی ضلع کا ڈپلوما اور سارٹیفکیٹ چرا لے گئے۔ جعلی طور پر اپنا نام اس میں بنوا لیے تھے کہ پکڑے گئے۔ مقدمہ چلا۔ مرزا کچہری میں طلب ہوئے۔ ایسی گواہی دی کہ ملزم صاحب چھوٹ گئے۔

حیدرآباد میں تھے۔ فلسفۂ قدیم و جدید کے تقابل پر ایک مبسوط کتاب انگریزی میں لکھی۔ امریکن یونیورسٹی نے سکے صلے میں پی ایچ ڈی کا خطاب دیا۔ یہ ڈپلوما بھی لکھنؤ میں چوری گیا۔ اور پانچ سو روپیہ بھی اسکے ساتھ ۔۔ مگر کچھ نہیں۔ نقل بھی نہ منگوائی۔

غیبت نہ کرتے تھے نہ سنتے تھے۔

ایجاد و اختراع کا شوق بہت تھا۔ کئی آلے رصد کے نئے بنائے۔

دوست پرست تھے۔ کبھی کسی کی غرض اٹکنے پر منہ نہیں موڑا۔

بزرگوں کا بہت ادب کرتے تھے۔ مثلاً انکے رشتے کے ماموں مرزا علی حسین یا چچا زاد بھائی حسین مرزا جو جھیناتھ کی چوکی پر شہر کے باہر رہتے تھے یا خسر[1] صاحب اگر اتفاق سے مرزا کے یہاں آ گئے تو پھر مرزا اس وقت تک آواز بلند بات نہ کرتے جب تک وہ بیٹھے رہتے

دور کی رشتہ داری بھی کسی سے ہوتی تو پاس صلۂ رحم اسے نباہتے۔

کینہ پرور نہ تھے جیسا ہی کسی نے نقصان پہنچایا ہو۔ جب آنکھ چار ہوئی تو کوئی شکایت نہیں۔

پنجوقتہ نماز التزام سے ہمیشہ پڑھا کیے۔

بدگمانی کی عادت نہ تھی۔

دو بچہ زور دوست تھے۔ ملنے سب سے اس طرح گویا دلی کیفیت ہے مگر بے تکلف مخصوص دوستوں کے سوا کسی سے نہ ہوتے۔

سال میں دو مرتبہ والدین کی قبر پر فاتحہ پڑھنے ضرور جاتے۔ اس فرض کے ادا کرنے کو خصوصاً مارچ اور محرم کی تعطیلیں میں حیدرآباد سے سیکڑوں روپیہ صرف کر کے آتے۔ قبریں خاندانی ... میں جو [illegible] خاں کی کربلا کے قریب ہے۔ جب چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تو پینس پر بیٹھ کے گئے۔

تنہا خور نہ تھے۔ اگر کوئی مزے کی چیز پکی تو خاص دوستوں کو تلاش کر کے کھلاتے۔ وہ انکے ساتھ کھاتے۔

جب تک لکھنؤ میں مستقل قیام رہا دریا کے کنارے دو ایک دوستوں میں آم خوری اور کنکوا بازی کی

---

[1] مرزا کے خسر کا نام مرزا اصغر حسین مرحوم تھا۔ یہ علامہ مرزا محمد اخباری کے نواسے تھے۔

...کرتی تھی۔ اہم مدا یں اُن کے خاص خوان سے کھائے جاتے۔ آپس میں بے دلی بھی ہوتی رہتی۔
[illegible] تھے وہ میرے مکان کے متصل مقیم ہوئے اُسی وقت سے نماز پابندی کے ساتھ پڑھنے
[illegible] نہیں چھوڑی۔ جب تک طاقت بحال رہی روزے بھی رکھے۔ طاقت گھٹی اور بیٹھ کے
پڑھنے لگے تو تعقیبات و اوراد گھٹا دیے۔ اس سے پیشتر کا حال میں نہیں جانتا۔ کسی سماعی بات پر میں
اعتماد نہیں رکھتا۔ جو کہتا ہوں وہ دیکھی ہوئی۔

انصاف مزاج میں تھا۔ غلطی پر فوراً قائل ہو جاتے۔ چنانچہ جب اودھ اخبار پر ہتک عزت کا مقدمہ چلا تو جناب مرزا نے اڈیٹر کے خلاف گواہی دی اور لفظ نازک بدن کو زنانہ وصف قرار دیا۔ اس زمانے میں کاتب الحروف کو اودھ پنچ کی مصروفیت جناب مرزا سے زیادہ ملنے کی مہلت نہ دیتی تھی اور وہ جلد جلد مکان بھی بدل رہے تھے۔ کبھی گولہ گنج میں آئے کبھی سنا کمہاروں کے پل پر مکان لیا ہے، کبھی امین آباد میں۔ میں نے جناب مرزا کی خدمت میں ایک عریضہ اس مضمون کا لکھا۔ کہ ہم اخبار نویس اکثر شریر اشخاص کے مخالف و موافق مضامین لکھنے پر مجبور ہیں۔ بحیثیت ماہر زبان کے آپ اسی طرح گواہیاں دیتے پھریں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ کا قول معتبر ہے پس یہ بھی ضرور ہے کہ جناب کی گواہی پھندا بن کے ہم لوگوں کی گردن میں پھنسے۔ منشی فخر الدین اور مولوی فضل الرحمٰن صاحب نے دفاع میں مجھ سے گواہی دینے کی خواہش کی ہے۔ میں ضرور جاؤں گا۔ اور آپ کے استاد جناب مرزا دبیر مرحوم کا یہ بند پیش کروں گا ؎

مرے غیور، مرے کم سخن علی اکبر — مرے دلیر مرے صف شکن علی اکبر
مرے غریب مرے بے وطن علی اکبر — مرے حسین مرے نازک بدن علی اکبر

بڑے سعید ہوئے اور بڑے رشید ہوئے
پہ رکے بڑے جوانی میں تم شہید ہوئے

(ملاحظہ ہو جلد نہم دفتر ماتم مطبوعہ نولکشور پریس) یہ بند زبان حال حضرت امام حسینؑ سے۔ کیا یہ مدح مردوں کی نہیں؟ کیا یہ کسی خاتون کی مدح میں ہے۔ کیا اس میں اوصاف شجاعت و محاسن بدنی ایک جگہ جمع نہیں ہیں؟ کیا مرزا دبیر مرحوم باوجود آپ کے استاد ہونے کے اتنا بھی سلیقہ نہ رکھتے تھے کہ مرد و زن کے اوصاف میں امتیاز کر سکتے؟

اب مجھے اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر خدانخواستہ کبھی میں پھنسا تو آپ اپنی مہارت زبان کا وار مجھ پر بھی کریں گے۔ تو دو حاضر ہونے سے معذور ہوں۔ حال دل تحریر کر دیا ہے۔ جواب کا منتظر ممتاز

جناب مرزا نے فوراً جواب دیا کہ میں بے وفا نہیں ہوں جو ممتاز حسین سے دوست پر حملہ کروں۔

اس پر یہ ہے کہ میں نے استاد مرزا دبیر مرحوم اعلی اللہ مقامہ کا یہ مرثیہ نہیں بند کیا تھا۔ اب اگر آپ کے یہاں منشی فخرالدین صاحب یا دیگر علماء میں سے کوئی صاحب مجھے جرح کے لیے طلب کریں گے تو میں اپنی اس غلطی کا اعتراف کر لوں گا۔ بصورت دیگر میں اس پر بھی راضی ہوں کہ گواہی میں ترمیم کی درخواست کروں۔ کسی کو میرے پاس بھیج دیجیے۔ یقین رکھیے کہ مجھے اپنی کوتاہی نظر کا افسوس ہے۔ میرے پاس جلد ہفتم دفتر ماتم نہیں ہے۔ مگر آپ بہتر ہیں۔ مرزا آپ نے یہ بند دیکھا ہوگا۔ خفا نہ ہوجیے۔ غصہ تھوک دیجیے

اس مقدمے کی پیروی بری ہوئی۔ نتیجہ دونوں صاحبوں کے حق میں برا نکلا نہ جناب مرزا سے جرستا کی نہ مجھے پیش آیا نہ اُن سے تقریر لی۔

اتنی جلدی اپنی غلطی کو تسلیم کر لینا پاک باطنی اور منصف مزاجی کی دلیل ہے۔

میں ان کے نظم و نثر تصانیف پر تبصرہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ لہذا قصہ مختصر کرتا ہوں (مولانا عبدالماجد کی تحریر اور ارشادات کا ان پورا ملاحظہ ہو)

حیدرآباد میں مستقل قیام کے بعد انھوں نے فلسفے کی کئی کتابیں ترجمہ کیں۔ جن کی تفصیل دارالترجمہ کی رپورٹ سے مل سکتی ہے۔ ایک مستقل کتاب بحث رؤیا (خواب) پر لکھی جس کے دو تین جزو خیابان لکھنؤ میں شائع ہوئے۔ وہاں پہونچنے کے بعد غزل گوئی سے اجتناب رہا۔ چند سلام اور مرثیے لکھے۔ کلام نظم کے بارے میں جو حال جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز نے لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ وہ کبھی جمع نہیں ہوا۔ اور جن لوگوں نے جمع کیا تھا وہ قائل ہیں کہ تلف ہو گیا۔ والعلم عند اللہ۔ (جناب مرزا وجود روح غیبی کے قائل تھے۔ اس کتاب الرؤیا میں کچھ انکا بھی ذکر ہے۔ ابتدا میں خواب کا نظریہ بیان کیا ہے)

چند ناول مثلاً خونی وکیل وغیرہ انکی جانب منسوب ہیں مگر اُن کا محض (پلاٹ) صرف انکا ترتیب دیا ہوا ہے خدا جانے کس نے لکھے ہیں — ممکن ہے کہ انھوں نے بعض ابواب املا کرا دیے ہوں۔ میں نے اس بارے میں ان سے بارہا پوچھا مگر کبھی جواب شافی نہ ملا۔

میں ۱۳ یا ۱۴ تاریخ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو اتفاقاً حیدرآباد میں وارد ہوا۔ میں وہاں کیوں گیا، یہ بہت سے پیچ واقعہ سے متعلق ہے۔ بیس روز قبل جناب مرزا لکھنؤ میں تھے۔ میں نے ان سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں آؤں گا۔ وہ اپنے ساتھ ہی لے چلنے پر مُصر تھے مگر میں مجبور تھا۔ جب میں وہاں پہونچا تو وہ ضعف پیری کے علاوہ کسی بیماری میں مبتلا نہ تھے۔ میرے پہونچتے ہی وہ مجھے دارالترجمہ اپنے ساتھ لے گئے حسب دستور کام کیا۔ ہاں میری خاطر سے کسی قدر جلدی کام ختم کر دیا۔ (حسب معمول قدیم کچھ مجھ سے بھی لکھوایا)

[illegible] مجھے معلوم ہوا کہ گھر میں میرزا ذوالفقار حسین صاحب مرحوم (جناب مرزا کے کارپرداز) کا بچہ
[illegible] چند روز سے مبتلا ہے۔ جب میں نے اُسے دیکھا تو اُس کی حالت اچھی نہ تھی۔ جناب مرحوم
[illegible] کہ مجھے اس بچے سے بہت اُنس ہو گیا ہے۔ میں نے مرزا کا عرض کیا کہ اپنے بچوں سے تو کبھی آپ
[illegible] نہ تھے شاید سے

بطفلی خدمتِ پیرے نکردی　　　بپیری خدمتِ طفلے ضرور است

پر عمل فرمایا ہو۔ ہنسنے لگے۔ بچے کے والد سامنے کھڑے تھے اس وجہ سے آہستگی مجھ سے پوچھا کہ بچے کی
امید ہے؟ میں نے جواب دیا بظاہر تو نہیں لیکن خدا قادر ہے۔ سُن کے چُپ ہو رہے۔ تیسرے روز بچہ قضا
کر گیا۔ اور چوتھے روز وہ خود بھی اسی عارضہ مرض میں مبتلا ہو گئے۔ بڑھاپا دم اور ایسی سخت بیماری۔ صدمہ
بھی تھا۔ آخر چند روز مرض کی سختی جھیلنے کے بعد ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء روز چہار شنبہ دس بجے دن کو انتقال
فرمایا۔ وکفیٰ بالموت واعظاً۔ چار بجے ترپ بازار مُرلی دھر کے باغ سے متصل جو گورستان ہے اُسی
میں دفن ہوئے۔ عمائد حیدرآباد سے کئی آدمی شریک جنازہ ہوئے۔

ایک مرتبہ زندگی میں بہت بڑا ذخیرہ کتابوں کا مدرسۃ الواعظین کو دے چکے تھے۔ حیدرآباد کے قیام
کے زمانے میں چار پانچ سو مجلد اور جمع ہو گئے تھے وہ بھی مدرسۃ الواعظین کی نذر کر گئے۔ سب نام اللہ کا۔
ممکن ہے کہ طول کلام باعثِ وحشتِ ناظرین ہو۔ لیکن میں نے تو اپنے نزدیک نہایت اختصار سے
کام لیا ہے۔ صدہا واقعات جو اس نفسِ محترم کی علالتِ قدر پر دلالت کرتے اور جو مردوں کی سیرت
پر عمدہ اثر کرنے والے تھے چھوڑ دیے۔ ان چند سطروں میں ان کے بعض صفات کے مختصر حالات اور
اُن کے مذاق علمی کی تھوڑی سی روداد کے سوا اور کچھ نہیں۔ جناب عزیزی اور مولانا عبدالماجد دریابادی
کے مضامین سے مدد لے کے اگر کوئی اس عنوان کی تکمیل کرنی چاہے تو ایک چھوٹی سی کتاب تیار ہو سکتی ہے

ربنا ما نعلم منہ إلا خیراً فارحم علیہ واغفر لہ۔

جو اوصاف مرنے والے کے میں نے بیان کیے ہیں اُن میں سے بعض کا تجربہ آپ کو
(اڈیٹر صاحب الناظر کو) بذاتہ ہو چکا ہے۔ جب آپ نے الناظر جاری کیا تو وہ کس قدر خوش ہوئے
تھے۔ کتنی ہمت بڑھائی تھی۔ کیسی محبت سے پیش آتے تھے —— مرقع لیلیٰ مجنوں کے دوبارہ
طبع کرنے کی اجازت کس درجہ خوشدلی کے ساتھ دی تھی —— جب کبھی آپ ملتے تھے تو کیا پُر خلوص
انداز ہوتا تھا —
[illegible] جب تک اردو زبان باقی ہے اُن اصطلاحات علمیہ کی وجہ سے جن کا رواج

ان کی اولاد کا سنت گزار ہے نام ضرور باقی رہے گا۔ اگر یہ اُن کی اولاد میں سے کوئی فرد نام کے بقا کا سبب نہ ہو سکا۔ سقراط نے درجۂ شہادت پانے سے قبل قاتلوں سے کہا تھا "اے میرے قاتلو۔ تم مجھے اور میری تعلیم کو برا سمجھتے ہو۔ اس برائی کا سچا انتقام یہی ہے کہ میرے مرنے کے بعد میرے بچوں کو اسی ڈھرے پر لگا دینا جو میں نے تمہارے بچوں کو گمراہ کرنے کے لیے نکالا تھا۔"

جناب مرزا فرماتے ہیں

بڑے ہیں ہم مگر ایسے بڑے بھی کم ہوں گے
کسی زمانے کے اچھے ہیں کریں گے یاد

نغماتِ آرزو

(از جناب منشی سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

قسم تو کھائی مگر اجتناب ہو نہ سکا — گنہگار ہوا کامیاب ہو نہ سکا
جہانِ شوق کا اللہ رے اختلافِ مذاق — قبولِ عام کوئی انتخاب ہو نہ سکا
جمال ہوشربا خود ہے پردہ دار اپنا — نقاب اُٹھا کے بھی وہ بے نقاب ہو نہ سکا
لبِ خموش سے ٹکرائی بھی فغاں تو نہ سُوں — سوال خود پلٹ آیا جواب ہو نہ سکا
جو کوئی حد معیّن تو شوق شوق نہیں — وہ کامیاب ہے جو کامیاب ہو نہ سکا
غریب کا بھی خدا ہے خدائے خوئے کرم — عتاب آ تو گیا تھا عتاب ہو نہ سکا
دلِ گداختہ بے کیف ہے تو پانی ہے — پگھل گیا مگر شیشۂ شراب ہو نہ سکا
سوا تھا دستِ طلب سے ایک میرِ شاہِ حسن — ہزار ہاتھ کے پھیلے اجتناب ہو نہ سکا
بچا نہ جذبِ محبت سے زورِ نازِ غرور — جواب بن کے خود آگئے جواب ہو نہ سکا
بدی سرشت نہ بدلی جگہ بدلنے سے — چمن میں آ کے بھی کانٹا گلاب ہو نہ سکا
جبیں سے عزو گنہ پر ٹپک پڑا جو عرق — مٹا ملے ہوئے اتنے حساب ہو نہ سکا
نگاہ و طوق نہ تھی رو شناسِ جلوۂ ذات — میں در تک آ تو گیا باریاب ہو نہ سکا

سکوتِ آرزو اُلٹا ہے حرفِ بے آواز
مرے سوال کا یعنی جواب ہو نہ سکا

اصطلاحاتِ فلسفہ پر ایک نظر

(از جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی اے)

میں نے رسالۂ آئینۂ فطرت ماہ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں مضمون "اصطلاحاتِ فلسفہ پر تنقید" از محمد اجمل خان صاحب ایم اے ایل ایل بی نہایت دلچسپی اور غور سے پڑھا۔ چونکہ مجھ کو بھی جدید الفاظ کے ترجمے سے خاص دلچسپی ہے لہذا یہ ضرور عرض کروں گا کہ اصل مضمون پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مترجم صاحب یعنی مولوی عبدالباری صاحب ندوی اور ناقد صاحب یعنی محمد اجمل خاں صاحب ایم اے ایل ایل بی (جو اس مضمون میں علی الترتیب "مترجم" اور "ناقد" کے لفظ سے یاد کیے گئے ہیں) دونوں اصحاب نے بعض اصطلاحات کے ترجمہ میں عجب تسامح فرمایا ہے جو ایسے صاحبانِ علم و فضل سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ میں اس مضمون میں ایک نقشہ کی صورت میں اصل ترجمہ مع تنقید اور نیز اپنی تجویز کے پیش کرنا چاہتا ہوں جو امید ہے کہ نظرِ استحسان سے دیکھا جائیگا۔

قبل اصطلاحات سے بحث کرنے کے اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ زبان انگریزی کے الفاظ کے اردو ترجمہ میں یہ قیاس ہرگز صحیح اور قابلِ عمل نہیں ہے کہ ترجمہ میں عام پسند اور عام فہم اردو الفاظ میں کیا جائے۔ اگر اس پر عمل کیا جائے گا تو خوف ہے کہ بجائے فی صدی علمی اصطلاحات یوں ہی بغیر ترجمہ کے رہ جائینگے۔ اردو تو اردو میرے نزدیک فارسی بھی علمی الفاظ کا صحیح مفہوم مختصر اور جامع الفاظ میں ادا کرنے سے معذور ہے اور نہیں ہو سکتی یہ شرف صرف زبان عربی ہی کو حاصل ہے۔ صحیح مرادف مغربی کلاسکل زبانوں مثلاً یونانی اور لاطینی کے اگر کچھ لیں گے یا وضع ہو سکیں گے تو صرف مشرقی کلاسکل زبانیں عربی اور سنسکرت ہی اس معاملہ میں کچھ مدد دے سکتی ہیں۔ دیگر ملکی زبانوں اور ڈکشنریوں سے اس بارے میں کچھ امید رکھنا فضول ہے۔

زبان عربی میں علمی تراجم کی خاص صلاحیت ہے اور اسکے متعدد وجوہ ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یونانی فلسفہ کی بیشتر کتابوں کا ترجمہ ہماری ہدایت کیلیے پیشتر سے موجود ہے جس کی پیروی میں ہم اسی قسم کے جدید الفاظ تراش سکتے ہیں اور اُن پر کوئی حرف گیری بھی نہیں کر سکتا۔ ہم عربی ابواب کی خصوصیات سے بھی ایک خاص فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جن سے وضعِ اصطلاح میں باعتبار اختصار لفظی کے بہت کچھ مدد ملے گی۔ اب رہا اشکال اور عام فہم نہ ہونے کا جھگڑا، تو ہر نئی اصطلاح بلکہ ہر جدید لفظ یا محاورہ پہلے پہل غیر مانوس مشکل اور کانوں کو ناگوار معلوم ہوتا ہے مگر بعد کو جب کان عادی ہو جاتے ہیں تو وہ اشکال اور ندرت جاتی رہتی ہے اور ہماری زبان سے وہ جدید الفاظ بے تکلف نکلنے لگتے ہیں۔ یہی حالت مثلاً اُن طبی اصطلاحوں کی ہے جو کسی

زمانہ میں ضرور غیر مانوس رہی ہوگی مگر اب بے تکلف زبانوں پر جاری ہیں۔ مثلاً "اُم جانیہ" دماغ کی ایک جھلی انگریزی لفظ ڈیورا میٹر کا ترجمہ ناقد صاحب نے مثال پیش کیا ہے اور اسکو غلط سمجھ کر اس کی جگہ "سخت غلاف" بتایا ہے۔ مگر وہ نہیں خیال رکھا کہ "اُم" کے معنی ایسے موقعوں پر "ماں" کے نہیں لیے جاتے بلکہ "اصل" کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ام الامراض۔ ام القریٰ (مکہ)۔ ام الخبائث (شراب)۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

آن تلخ وش کہ صوفی ام الخبائث خواند ‖ احلیٰ لنا و اشہیٰ من قبلۃ العذارا

غرضکہ "اُم الجانیہ" کی اجنبیت (اگر کسی کو بری بھی معلوم ہو) ہرگز اصلی اصطلاح کو مٹا نہیں سکتی۔

اب میں ایک نقشہ پیش کرتا ہوں کہ اس فہرست اصطلاحات میں جو اصل مضمون میں دی گئی ہے مترجم صاحب اور ناقد صاحب نے کتنے کتنے الفاظ عربی فارسی اور اردو کے استعمال کیے ہیں۔

وضع کردہ	کل الفاظ	معرب یا مفرس	عربی	فارسی	اردو	کل تعداد
مترجم	۵۵	۴	۵۴	۸	×	۶۶
ناقد	۵۵	×	۴۵	۲۸	۹	۸۲

اس نقشہ میں ایک لفظ کے دو معنی جہاں ہیں وہاں دو لفظ قرار دیے گئے ہیں۔ مثلاً ضرورت اور وجوبیت ایک ہی انگریزی لفظ کا ترجمہ ہے۔ ہم نے انکو دو لفظ قرار دیا ہے۔ الفاظ مرکب کو جو مضاف مضاف الیہ یا صفت موصوف کی صورت میں ہیں اگر دونوں جزو عربی ہیں تو عربی رکھا ہے گو کہ ان کا استعمال بجز فارسی یا اردو کے ہوتا ہو۔ مثلاً صائب واقعی۔ غیر متعصب۔ جرمی علوم وغیرہ ایسے مرکب الفاظ جن میں ایک فارسی دوسرا ہندی ہے ان کو ہندی شمار کیا ہے مثلاً دھوکہ باز۔ اس نقشہ سے نتائج ذیل نکل سکتے ہیں۔

(۱) مترجم صاحب قاعدۂ تعریب و تفریس کے قائل ہیں جیسا کہ بعض الفاظ سے ظاہر ہے۔ برخلاف ناقد صاحب کے کہ وہ اس عمل کو بالکل پسند نہیں کرتے۔

(۲) عربی الفاظ دونوں اصحاب کے یہاں بکثرت ہیں اور ناقد صاحب باوجود اپنی اردو دوستی کے بھی عربی الفاظ بکثرت لکھنے پر مجبور ہوئے۔ اس پر ہم کو مرزا غالب کے دو مزیدار شعر یاد آگئے ؎

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام ‖ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ‖ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مترجم صاحب اور ناقد صاحب بلکہ کل کارکنان دارالترجمہ اور واضعین اصطلاحات علمیہ سے میری گزارش

ہے اور اصرار گذارش ہے کہ اصطلاحات کے ترجمہ میں اجنبی اور غیر مانوس ہونے کا ذیادہ خیال نہ فرمائیں بشرطیکہ اصل لفظ مترجم منہ کا صحیح مفہوم بالکلیہ ادا ہو جائے۔ اگر وہ مفہوم کسی مانوس اور سہل ذریعہ سے ادا ہوتا ہو تو سبحان اللہ۔ اس سے بڑھ کر کیا بات ہے۔ اُس لفظ کو ضرور اختیار کیجیے۔ مثلاً علم برق میں "پازیٹو کرنٹ" اور "نگیٹو کرنٹ" کا اردو ترجمہ "مثبت رَو" اور "منفی رو" سے ایسی خوبی سے نہیں ہو سکتا جیسے "گرم تار" اور "ٹھنڈا تار" سے ہو سکتا ہے اور یہی سہل لفظیں ہمارے بجلی کے کاریگروں اور مستریوں کی زبان پر جاری ہیں اور وہ کبھی بھی ثقیل اور غیر مانوس الفاظ "مثبت اور منفی رَو" نہیں بولیں گے۔ لہذا ایسے سہل الفاظ کو ضرور رواج دینا چاہیے نہ کہ انکا عربی ترجمہ "سالک حار" اور "سالک بارد" کہ اس میں بھی کچھ بو آتی ہے۔

میں ایک حد تک مرحوم مولوی وحید الدین صاحب سلیم کے تراشیدہ الفاظ کو بھی پسند کرتا ہوں مثلاً اُنھوں نے انگریزی لفظ "الکٹریفائی" کا ترجمہ "برقانا" یا "برقیانا" تجویز کیا تھا جو بہت اچھا اور کار آمد لفظ ہے۔ مگر انھیں کے ایجاد کردہ "مستقبلاحی" کو میں ہرگز ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں میں نے الناظر میں اس عجیب غریب لفظ کو "سیتاجی" پڑھا تھا اور دیر تک اسکے معنی سمجھ میں نہیں آئے۔ بالآخر مکرمی مولانا ظفر الملک صاحب نے ایک کتاب دکھا کر یہ مسئلہ حل کیا۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کوئی شخص جس نے یہ لفظ پیشتر سے نہ سُنا ہو ہرگز اس کے مفہوم کو سمجھ نہیں سکتا۔ اب مجھے سنیے یہ لفظ الفاظ "سابق" اور "لاحق" کے حروف ابتدائی کے امتزاج سے ترکیب پاکر لفظ "مرکب" کے مفہوم کو ادا کرتا ہے مگر خود ایک چیستاں ہو جاتا ہے مولوی صاحب مرحوم نے اس کی مثال میں الفاظ "پین اسلامزم" اور "پین جرمن" کو پیش کیا ہے اور ترجمہ "کُل اسلام" اور "کُل جرمن" فرمایا ہے۔ اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ ان الفاظ میں "مستقبلاحیت" کیا ہے اور امتزاج حروف کہاں ہے۔ دونوں لفظ "کُل" اور "اسلام" یا "کُل" اور "جرمن" اپنی حالت پر رہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ ایک مرکب صورت میں ہو گئے۔ پس ایسے لفظوں کو "مرکب" کیوں نہیں کہہ سکتے۔

اب میں اصل اصطلاحات کی طرف رجوع کرتا ہوں اور اُسی نقشہ کی صورت میں انکو پیش کروں گا جو الناظر میں شایع ہوا ہے۔

اصطلاح انگریزی	اصل ترجمہ (از مولوی عبدالباری ندوی)	ترجمہ جدید (از محمد جمیل خانصاحب)	مجوزہ ترجمہ
Altruism	اخوانیت	ایثار۔ غیر پرستی	ذیل کا نوٹ ملاحظہ ہو

نوٹ: یہ لفظ فرنچ altruisme کی انگریزی صورت ہے۔ یہ نو ایجاد لفظ ہے۔ اس کو
فرانسیسی فلسفی کومت نے وضع کیا تھا۔ یہ اس کی جدید فلسفہ پازیٹیوزم کی اساس ہے۔ کومت
کے زمانہ میں مشہور انگریزی فلسفی جان اسٹوارٹ مل کی فلسفہ کا دور دورہ تھا۔ مل کا شمار متکلمین فلاسفہ
میں ہے اور اس کی فلسفہ Utilitarianism یعنی فلسفۂ خود غرضی کے نام سے مشہور ہے
کومت اور مل ہمعصر تھے۔ مل کی ساری فلسفہ شخصی یا ذاتی نفع کے اصول پر مبنی ہے۔ اس کا یہ دعویٰ
ہے کہ انسان جبلی طور پر اپنا آرام اور نفع ڈھونڈتا ہے۔ مل کا اصل اصول "انا ولا غیری" ہے۔ کومت
نے مل کے اس نظریہ کو الٹ کر اپنا اصول "غیری ولا انا" قرار دیا اور بمقابلہ شخص یا ذات کے پوری
سوسائٹی یعنی نظام بشری کو ایک یونٹ قرار دیا۔ جس طرح مل انتفاع شخصی کا قائل ہے اسی طرح
کومت انتفاع جمعی کا قائل ہے۔ پس لفظ "التروئزم" کا صحیح مرادف "غیریت" ہو سکتا ہے بمقابلہ
Egoism (انانیت) کے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ مگر چونکہ یہ لفظ "غیریت" میں معنی معکوس سے
ملتبس ہوتا ہے اور ہم لوگ اسی قسم کے التباس اور پہلوئے ذم وغیرہ سے بہت ڈرتے ہیں اسکو ایک
ہوّا سمجھتے ہیں اور مگر زندہ قوموں مثلاً فرنچ جرمن وغیرہ کی طرح ہم میں کوئی ایجادی جرأت اور
دلیری نہیں ہے کہ مفید کاموں میں قوم عالم کی مطلق پرواہ نہ کریں لہٰذا میں اسی قومی کمزوری کے
خیال سے "غیریت" کی جگہ "غیر پرستی" کو پسند کرتا ہوں۔ مگر "اخوانیت" اور "ایثار" دونوں صحیح نہیں۔
اصل مفہوم سے بالکل دور ہیں۔

اگسٹ کومت، مشہور فرنچ فلسفی (ولادت ۱۷۹۸ء لغایت ۱۸۵۷ء) "پازیٹیوزم" کا بانی ہے
پازیٹیوزم کو اجتماعیت، انتفاع بشری یا نفع عامہ سے ہم تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس فلسفہ کا لب لباب
یہ ہے کہ نوع انسانی من حیث القوم ایک وجود خاص رکھتی ہے۔ وہ ایک Entity ہے جو ترقی
و تنزل پذیر ہے۔ اجتماعِ انسانی یعنی سوسائٹی اگر اس میں اتفاق ہے تو ترقی پذیر اور اگر تفرق و انتشار ہے
تو تنزل پذیر ہے۔ کومت نے ایک درجہ اور آگے بڑھ کر اسی نوع انسانی کو قابل تعظیم بلکہ قابل پرستش
قرار دیا تھا یعنی "پازیٹیوزم" کو فلسفہ کی حد سے بڑھا کر ایک مذہب قرار دیا تھا۔ اور خود اس کا پیرو بھی تھا
مگر اور لوگوں نے "پازیٹیوزم" کو صرف فلسفہ کی حد تک ہی مانا مگر آگے قدم بڑھا نہ سکے۔ خود کومت کے خاص
شاگرد بھی اس نئے مذہب کے قائل نہ ہوئے بلکہ ایک خاص جماعت نے جس کا سرگروہ لِٹرے
(Littré) تھا اس سے صاف مخالفت کی۔

(دیکھو کیوی یر کا فلسفۂ کومت۔ ترجمۂ انگریزی)

اصطلاح انگریزی	اصل ترجمہ [illegible]	ترجمۂ جدید [illegible]	مجوزہ ترجمہ
Ascetic	مرتاض	زاہد	مرتاض صحیح ہے۔
Asceticism	مرتاضیت	زہد	مرتاضیت صحیح ہے مگر ریاضت بہتر ہے۔
Attainment	حصول ذہنی	حصول خبر	اس لفظ کا صحیح مفہوم جب تک کوئی کتاب دیکھی جائے سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر حصول ذہنی سے حصول نجائی بہتر معلوم ہوتا ہے
Catastrophe			کیونکہ Catastrophe اس واقعۂ ہائلہ کو کہتے ہیں جس سے یکبارگی کوئی عظیم تغیر پیدا ہو جائے جیسے زلزلہ۔
Causal	کازسائیہ	ضمیر پرست	اس انگریزی اصطلاح کے لکھنے میں سخت غلطی ہوئی ہے Causal Casual کا کوئی لفظ نہیں ہے بلکہ Casuist ہے جس کا صحیح ترجمہ "مغالطہ" یا "تاویل" ہو سکتا ہے کازسائیہ اور ضمیر پرست دونوں صحیح نہیں۔
Causistry	کازسائیت	ضمیر پرستی	Casuistry سے یہ مطلب ہے کہ مذہب یا اخلاق کے عام اصول کسی خاص معاملہ پر عائد کیے جائیں اور رائے دینے والا اپنی ذاتی رائے یا قیاس کو بھی اس میں دخل دے۔ یہ پورا خیال "تاویل" سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے اور چونکہ اس قسم کی تاویلیں گونا مشتبہ اور مشکوک الفاظ سے ظاہر کی جاتی ہیں جن سے لوگوں کو مغالطہ ہوتا ہے۔ لہذا "مغالطہ" بھی اسکا ترجمہ ہو سکتا ہے۔
Beyond good or evil	ماورائے خیر و شر	نیکی یا بدی سے آگے	اصل ترجمہ مناسب ہے۔ مگر یہ کوئی اصطلاح نہیں ہے
Conduct	کردار	چلن	میرے نزدیک "عمل" زیادہ مناسب ہے۔ اور چونکہ Conduct سے Character کا مجموعہ ہے لہذا Character کو ہم

			'اعمال' کہہ سکتے ہیں۔ عام طور پر بھی Character Book کو 'اعمال نامہ' کہتے ہیں'
Categorical	اطلاقی	قطعی حتمی	یہ کانٹ کی اصطلاح ہے نہ کہ اخلاق کی۔ اس سے ایسا کلیہ مراد ہے جس پر کسی قسم کی شرط یا نسبت نہ پائی جائے لہذا "قطعی" اور "غیر مشروط" اس کا ترجمہ ہونا چاہیے۔
Celibacy	تجرد۔ عزبت	کنوارا پن	"تجرد" صحیح ہے۔
Cosmopolitan	ہمہ وطن	جہاں باشی۔ غیر متعصب	اس لفظ سے کوئی ایسا شخص یا چیز مراد ہے جس کا کوئی خاص وطن یا مسکن نہ ہو یا کسی مخصوص مقام سے اس کا تعلق نہ ہو بلکہ وہ مختلف مقامات میں پائی جائے۔ اس لحاظ سے "جہاں باشی" صحیح ہے اور "بے تعصبی" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔
Cosmopolitanism	ہمہ وطنیت	جہاں باشی۔ بے تعصبی	
Decision	عزیمت	فیصلہ	میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معمولی لفظ میں اصطلاح ہونے کی کون سی صلاحیت ہے۔ ہر ڈکشنری میں اسکے معنی "فیصلہ" کے ملیں گے
Discipline	قاعدہ	نظام	یہ بھی کوئی اصطلاح نہیں ہے "نظام" صحیح ترجمہ ہے۔
Evil	شر	بدی۔ بد۔ برائی	"شر" صحیح ہے۔ چونکہ یہ لفظ ایک اصطلاح کی حیثیت سے رکھا گیا ہے لہذا اس کا ترجمہ لفظ "شر" سے زیادہ مناسب ہے بمقابلہ Good کے جس کا ترجمہ "خیر" سے کیا گیا ہے۔
Egoism	انائیت	خودی۔ خود پرستی۔ اہتمام ذاتی	"انائیت" بالکل صحیح ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا نوٹ Altruism پر۔
Ethnology	علم الاقوام۔ قومیات	نسلیات	"علم الاقوام" بالکل صحیح ہے اور "قومیات" غلط ہے کیونکہ "قومیات" آج کل کی اصطلاح میں اس مجموعہ نظم کا نام ہے جس میں قومی نظمیں جمع کی جائیں۔

			تعجب ہے کہ ناقد صاحب باوجود قوم اور نسل میں فرق کرنے کے بھی اس کا ترجمہ "نسلیات" سے کرتے ہیں جو بالکل صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قوم اور نسل بہ زمین و آسمان کا فرق ہے۔
Ethology Fanatic	علم السیرت جوش مند	اخلاقیات نیت جوشیلا	ہم اس لفظ کو "علم الاخلاق" نے کیوں نہ ادا کریں "متعصب" اور "متشدد" صحیح ہے نہ "خوشمند" اور "جوشیلا"۔ میں نے آج تک "جوش مند" کا لفظ نہیں سنا ہے
Good	خیر	نیک اور نیکی	"خیر" بالکل صحیح ہے۔ تعجب ہے کہ ناقد صاحب اسم کا ترجمہ صفت سے بھی کر جاتے ہیں۔
Good Will	ارادۂ خیر	نیک ارنشی	میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لفظ کو علم الاخلاق سے کیا واسطہ ہے۔ اگر کسی مقام پر Will کو Good کے ساتھ متصف کیا ہے تو ارادۂ خیر کہا جا سکتا ہے مگر میں نے آج تک یہ ترکیب نہیں دیکھی جہاں تک مجھکو علم ہے Good Will ایک تجارتی اصطلاح ہے اس کا ترجمہ اسم متعارف یا مشہور نام ہو سکتا ہے۔
Idea	تصور	خیال۔ پندار	اگر فلسفہ و منطق کی اصطلاح ہے تو "تصور" صحیح ہے ورنہ معمولی لفظ "خیال" بھی ہو سکتا ہے۔ "پندار" بالکل غلط ہے۔
Ideal	نصب العین	خیالی	"نصب العین" صحیح ہے کیونکہ آجکل یہی متعارف اصطلاح ہے۔ جدید فارسی میں اسکو "ایدہ آل۔ ارمان۔ کمال مطلوب" بھی کہتے ہیں۔ (دیکھو صفحہ ۲۲۴ سخنوران ایران در عصر حاضر)

Idealism Idealist	تصوریت تصوریہ	خیالیت خیالیہ	مترجم صاحب کا ترجمہ صحیح ہے مگر کیا "ذہنی" اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتا۔ اصل یہ ہے کہ Materialism Idealism کی ضد ہے۔ مثلاً برکلے جسکے حالات خود مترجم صاحب نے لکھے ہیں ایک آئیڈیلسٹ فلسفی تھا۔ وہ Matter یعنی مادہ کا قائل نہ تھا اب اختیار ہے کہ ایسے شخص کو آپ "تصوریہ" کہیے یا "ذہنیہ" یا "خیالیہ"۔
Imperati	امر	لازم۔ ضروری	تعجب ہے کہ مترجم صاحب نے اس لفظ کو علم الاخلاق کی اصطلاح قرار دیا مگر ترجمہ "امر" سے کیا جو صرف کی اصطلاح ہے۔ اگر کوئی اصطلاح ہی ڈھونڈنا ہے تو "واجب" پیشتر سے موجود ہے۔
Intuition Intuitionis Intuitionism	وجدان وجدانیہ وجدانیت	حدس حدسیہ حدسیت	میں اس کا ترجمہ "بدیہی" کرونگا۔ تعجب ہے کہ ناقد صاحب باوجود اسکے کہ غیر مانوس الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں اور مشہور و متعارف الفاظ ڈھونڈتے ہیں انھوں نے اسکے لیے ایک ایسا غیر مانوس عربی لفظ رکھا ہے جو سوائے علمائے کبار کے معمولی آدمیوں کے فہم سے بالاتر ہے اور اسکا التباس بھی ایک ایسے لفظ سے ہوتا ہے جسکے کچھ اور معنی ہیں۔
Incomplete	بے کمالی	نقص	معلوم نہیں یہ کونسی اصطلاح ہے۔ "نقص" صحیح ہے۔
Individua	انفرادیت	فردیت	میرے نزدیک "شخصیت" اور "خودغرضی" زیادہ موزوں ہیں۔
Instinct	جبلت	محرک فطری	"جبلت" صحیح ہے۔ انگریزی میں یہ لفظ

		طبیعت۔ جبلت	Reason کی ضد ہے جو انسان کے لیے مخصوص ہے۔
Infinite.	لامحدود	بے پایاں	دونوں ہو سکتے ہیں۔
Impulse	تہیج	محرک۔ خواہش	بجائے تہیج کے "ہیج" اور محرک صحیح ہے۔ جذبۂ فوری بھی کہہ سکتے ہیں۔
Institutions	شعائر	ادارات	یہ لفظ اصطلاح نہیں ہے بلکہ ایک عام لفظ ہے۔ "ادارہ" صحیح ہے۔
Liberty	اختیار	آزادی	"اختیار" صحیح ہے۔
Luxury	عیش پرستی	تنعم	یہ بھی کوئی اصطلاح نہیں ہے۔ عیش و آرام
Necessitarianism	تعیش		الات۔ امیرانہ ٹھاٹ جو چاہیے رکھیے تنعم بھی ہو سکتا ہے۔
Necessitarianism	ضروریت۔ وجوبیت	قدر۔ اختیار	تعجب ہے دونوں حضرات نے عجب عجب
Necessitarians	ضروریہ۔ جوبیہ	قدریہ	الفاظ اس کے متعلق استعمال کیے ہیں اور معروف لفظ جبر اور جبریہ نہیں ارشاد فرمایا۔ ناقد صاحب سے سخت تعجب ہے کہ بالکل معکوس الفاظ یعنی قدر اور قدریہ تجویز فرمائے۔
Objective Right	صائب واقعی	حق ظاہری	میں "حق خارجی" اور "حق داخلی" کو
Subjective Right	صائب شخصی	حق باطنی	پسند کرتا ہوں۔
Perseverance	استقلال۔ ثبات	ثبات۔ استقلال	یہ اصطلاحیں نہیں ہیں جو الفاظ موقع پر مناسب
Prudence	حزم۔ دانائی	حسن تدبیر	ہوں رکھے جائیں۔
Pedagogics	تعلیمات	اتالیقیت	اس لفظ کے املا میں غلطی کی گئی ہے۔ Pedagogue ہونا چاہیے۔ یونانی زبان میں اس غلام یا ملازم کو کہتے تھے جو اپنے مالک کے بچوں کو ساتھ لے کر مدرسہ جاتا تھا۔ پھر اس کے معنی معلم کے ہو گئے مگر ایسا معلم جو بچوں کو پڑھائے اور بڑے شفقت سے

			کو نہ پہنچ سکے۔ مگر اردو میں سوفسطائی سے ایسی حکمت یا فلسفہ مراد ہے جس کی بنیاد نفسی حقائق پر نہ ہو محض قیاس و وہم پر قائم ہو۔
Satisfaction	تشفی	اطمینان۔ تسلی	مع کبھی میں نفی حقائق میں تھا سوفسطائی (ذوق) اس میں کوئی اصطلاح نہیں ہے۔ تشفی۔ اطمینان سب ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک "آسودگی" زیادہ مناسب ہے۔
Utopia	یوٹوپیا	جنت خیال	یہ ایک یونانی لفظ ہے جس سے یہ مطلب ہے کہ کوئی ایسا خیالی مقام جہاں کی حکومت، معاشرت، قوانین سب کمل اور اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے ہیں گرچہ کہ کوئی ایسا مقام فی الواقع عالم وجود میں نہیں ہے لہذا اسکے لیے بہترین لفظ "خیالی دنیا" ہو سکتا ہے نہ کہ "جنت خیال" جو غالباً مرزا غالب سے لیا ہوگا۔ اسی لفظ کے قریب المعنی ایک۔۔ اور لفظ ہے Eldorado اسکے بھی تقریباً یہی معنی ہیں۔
Wisdom	حکمت	عقل	خدا کو معلوم اس لفظ میں اصطلاح کی کیا بات ہے کہ اس کو بھی داخل فہرست کیا گیا عقل و حکمت دونوں صحیح ہیں۔ اب بھی "حکمت" عقل کے معنی میں بے تکلف بولا جاتا ہے۔

(اس مضمون کی وجہ سے تنقید نگار کی تحریر کا دوسرا جز جس میں منطق اور مابعد الطبیعیات کی اصطلاحات سے بحث کی گئی ہے کتابت ہو چکنے کے بعد روک لینا پڑا۔ بعض اور احباب نے اس بحث میں حصہ لینے کا ارادہ ظاہر فرمایا ہے۔ اگر علم الاخلاق کی اصطلاحات پر کوئی مضمون جلد وصول ہو گیا تو انشاءاللہ آئندہ نمبر میں درج ہو گا۔ ورنہ اصل مضمون کی اشاعت کے بعد سب کے شائع کیے جا سکیں گے۔ ایڈیٹر)

شاعری میں چوری

(از پروفیسر سید حامد حسن صاحب قادری آگرہ یونیورسٹی)

ستمبر کے الناظر میں جناب جلیل قدوائی نے حضرت رضی بدایونی کے اس شعر کو

صدا ذاتِ حسن سے بیگانے رہ گئے ۔۔ یہ امتیازِ معنی و صورت لیے ہوئے

حضرت اصغر گونڈوی کے اس شعر کی صدائے بازگشت بتایا ہے :۔

صدا تو لطفِ مے سے بھی محروم رہ گئے ۔۔ یہ امتیازِ ساغر و مینا لیے ہوئے

جلیل صاحب کو اس سرقہ پر بہت جلال آیا ہے۔ مجھے اس پر مزہ آیا۔ اور میں نے کہا

صدا تو حظِ شعر سے محروم رہ گئے ۔۔ یہ امتیازِ اصغر و اکبر لیے ہوئے

جس نے چوری کی اور جس کی چوری کی ہے۔ دیکھی اور جس نے چوری پکڑی ہے ان تینوں میں سے ایک کی بھی کبھی صورت نہیں دیکھی اور نہ مجھے عدالتِ شاعری کی کرسی نشینی کا دعویٰ ہے۔ جلیل صاحب کی پولیس والوں کی سی دھمکی (کہ آجکل کے شعرا آخر پڑھنے والوں کو اندھا کیوں سمجھتے ہیں؟) اور مجسٹریٹ کے سے فیصلے (رضی صاحب کو اپنے قصور کا اعتراف کرنا ہوگا) کے جواب دہ رضی صاحب ہیں۔ میں تو اپنے خیالات لکھے دیتا ہوں جو اس وقت ذہن پر ہجوم کر آئے ہیں۔

جلیل صاحب کی یہ ترمیم بالکل صحیح و مناسب ہے کہ رضی صاحب کے مصرعۂ اولیٰ میں "بیگانے" کی جگہ "بیگانہ" زیادہ فصیح و برجستہ ہوتا۔ باقی مضمون شعر کے سرقہ کے متعلق میرا خیال ہے کہ مضمون یا شعر ماخوذ کو دیکھنا چاہیے کہ ماخذ کے مقابلہ میں کیسا ہے۔ اگر بہتر ہے یا برابر بھی ہے تو جائز رکھنا چاہیے۔ پھر آخذ کو بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ کس حیثیت کا ہے۔ رضی صاحب واقعی خوشگو شاعر ہیں۔ اگرچہ جلیل صاحب نے اپنے غصہ میں ان کی خوشگوئی کا پورا اعتراف نہیں کیا۔ وہ اصغر صاحب کے لیے بھی نہ کہتے کہ اصغر صاحب ایک خوشگو شاعر کی حیثیت سے اچھی غزلیں کہتے ہیں۔ رضی صاحب نے شعر متنازعہ فیہ والی غزل میں بھی اچھے شعر نکالے ہیں۔ اس لیے ان کو اس شعر کے سرقہ سے اپنی غزل و شاعری کو چمکانا مقصود نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شعر کو دیکھ کر شاعر کے ذہن میں اسی کے مثل یا اس سے بہتر مضمون آتا ہے اور وہ نظم کر دیتا ہے۔ اگر نہ کہے تو زبان و ادب میں وسعت و ترقی مسدود ہوئی جاتی ہے۔ ایک مضمون سے دوسرا مضمون، ایک بات سے دوسری بات

سبب تغیر رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے (مومن)

غالب و تسکین کے شعر دیکھیے :-

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد — سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا (غالب)

کوچۂ یار میں میں نے تسکین — پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا (تسکین)

امیر و داغ کی سنیے :

میری فریاد رائیگاں تو نہ ہو — بت ہی سن لیں اگر خدا نہ سنے (امیر)

میری فریاد دوسرا نہ سنے — تم سنو اے بتو، خدا نہ سنے (داغ)

یہاں توارد کا [illegible] ہے ان دو شعروں میں بھی توارد ہی ہے :-

زنگ آلودہ اک آئینہ سہی — دل کی آخر کوئی قیمت ہوگی (صفی لکھنوی)

اک نگاہ غلط انداز سہی — دل کی آخر کوئی قیمت ہوگی (صفدر مرزاپوری)

یہ ممکن ہے کہ دوسرا مصرع طرح کا مصرع ہو اور اس پر صفی و صفدر نے اپنی اپنی جگہ مصرعے چسپاں کیے ہوں۔ حضرت صفی لکھنوی بزرگ تر اور مسلّم استاد ہیں لیکن یہاں دونوں شاعروں کی ذہنیت و تخیل کا فرق صاف عجیب نظر آتا ہے۔ دوسرا مصرع دو باتیں سمجھا رہا تھا۔ یعنی (۱) دل کی ناقص حالت کا اعتراف کر کے اس کے لیے کسی ادنیٰ سی قیمت کا مطالبہ کیا جائے۔ یا (۲) اس ادنیٰ قیمت کا تعین کر دیا جائے۔ صفی صاحب نے پہلی شق لی اور صفدر صاحب مرحوم نے دوسری۔ میری رائے میں دوسری بات زیادہ لطیف و دلچسپ ہے۔ اس لیے کہ دل کا ناقص ہونا تو مصرع طرح کے الفاظ ہی سے ظاہر ہے، اسی لیے کہا ہے "آخر کوئی قیمت ہوگی" اس حالت کا تعین دشوار نہ تھا۔ زنگ آلود آئینہ، ٹوٹا ہوا پیالہ، مرجھایا ہوا پھول، جو چاہیے کہہ سکتے ہیں۔ قیمت کی تجویز پر البتہ زیادہ لطف ہے۔

اخذ و سرقہ کی اور مثالیں دیکھیے۔ مومن خاں کا بہت مشہور شعر اور ان کے نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے — ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے

صفدر مرزاپوری نے بھی اسی قافیہ و ردیف میں ایک شعر کہا ہے :-

گھر سے تجھے تنہا تو نہ جانے دینگے — صبح کو ہم ترے ساتھ اے شب ہجراں ہونگے

صفدر مرحوم نے داغ کے بھی ایک مطلع سے استفادہ کیا ہے -

شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری ۔ غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری (غالب)
مجھ سے اُس سے اتنی ہے محبت میری غیر کے گھر نہیں جاتی شبِ فرقت میری (مضطر)

[illegible] غالب کے ایک مشہور مضمون سے تمنا شاہجہانپوری نے مضمون نکالا ہے۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں (غالب)
سرحدِ ادراک سے ملحق ہے اُس کا آستاں ختم یہ منزل جہاں ہو سر وہیں خم کیجیے (تمنا)

اور دیکھیے، غالب کا یہ شعر کس قدر مقبول ہے اور اس پر غالب کی جدتِ ادا کی کس قدر تعریف ہے

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور؟

لیکن یہ بات میر حسن دہلوی غالب سے پچاس برس پہلے کہہ گئے ہیں :-

میں حشر کو کیا روؤں کہ اُٹھ جانے سے تیرے برپا ہوئی اک مجھ پہ قیامت تو یہیں اور

اس سے بھی زیادہ عجیب اور دلچسپ مثال سنیے، اُردو زبان کے سب سے قدیم غزل گو شاعر حضرت مخدوم کمال الدین سعدی کاکوروی (متوفی ۱۰۰۲ھ / ۱۵۹۳ء) کی غزل کا شعر ہے :-

ہم نا تم کو دل دیا، تم دل لیا اور دُکھ دیا ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ پیت ہے

میرزا رفیع سودا دہلوی کا یہ شعر اس کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہے :-

میں نے تم کو دل دیا، تم نے مجھے رسوا کیا میں نے تم سے کیا کیا، اور تم نے مجھ سے کیا کیا

یہ فہرست زیادہ طویل ہو سکتی ہے، لیکن اس قدر بھی کافی ہے۔ اسی طرح میری یاد میں اُردو کے ایسے اشعار بھی بہت سے موجود ہیں جو فارسی اشعار سے ہم معنی یا متوارد یا مسروق ہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ غالب کا یہ شعر

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل جو تری بزم سے نکلا، وہ پریشاں نکلا

فارسی کے اس شعر کا سرقہ ہے :-

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل ہر چہ از بزمِ تو برخاست، پریشاں برخاست

لیکن میں نے اُن کا یقین نہیں کیا، اور یہ سمجھا کہ اُنھوں نے غالب کے شعر کو فارسی میں ترجمہ کر دیا ہے اس لیے کہ وہ فارسی شاعر کا نام نہ بتا سکے اور میں اُن کے دعوے کی تحقیق نہ کر سکا۔ بہرحال غالب باوجود لاکلام غالب ہونے کے دوسروں سے مضامین اخذ کرتے تھے، مثلاً اُن کا یہ مطلع :

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

کمال اسمٰعیل اصفہانی کے اس مطلع سے ماخوذ ہے :-

ناخن عمر فزون است مشتاقان را | اگر نہ عمر شمارند روز ہجراں را

مولوی وحشت آبادی نے تو کمال کیا ہے کہ نظیری نیشاپوری کا شعر بعینہٖ اپنی زبان میں لے لیا ہے

چناں گرفتہ با تو میان جان شیریں | کہ تواں ترا و جاں را ز ہم امتیاز کردن (نظیری)

ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جی میں | مشکل ہے جی سوں تجھ کو اب امتیاز کرنا (ولی)

پرانے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو۔ تاہم اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اگر اخذ و استفادہ سے اجتناب کا قانون شروع ہی سے رائج ہوتا تو میر حسن کے شعر کے بعد غالب کا شعر پیدا نہ ہوتا۔ دیکھیے یہ خوش انداز بیان ہاتھ سے جاتا ہے۔ اسی طرح سعدی کا گو، وہی کا مضمون سودا کے شعر میں نظر آتا۔ دیکھیے کہ قدامت رواں سے قطع نظر کرنے بھی سودا نے اس مضمون کو اپنے الفاظ کی ترتیب سے کس قدر لطیف و دلکش بنا دیا ہے۔ اسی طرح میر کی معمولی تخئیل سے مومن کی نزاکت تخئیل نہ نکلتی۔ اس پر ایسے سب اشعار و مضامین کو قیاس کرنا چاہیے۔ اور اگر کسی متاخر نے اپنے متقدم سے بہتر ہو پر مضمون نکال لیا ہے تو اس کو معاف رکھنا چاہیے۔ بلاشبہ ایک اسلوب بیان، انتخاب الفاظ اور شعر کی ہیئت مجموعی کسی موجد کی ملکیت خصوصی ہوتی ہے اور اس کا اخذ لائق مواخذہ اور اس کا سرقہ قابل گرفت ہے، لیکن اس کا فیصلہ آخذ یا سارق کی نیت و حیثیت پر رکھنا چاہیے۔ اور اس معاملہ میں بھی ذاتیات سے بڑھ کر ادبیات کی بحث پیش نظر رکھنی چاہیے۔

اس اخذ و استفادہ یا توارد و سرقہ کی وارداتیں کیا عصر حاضر میں پیش نہیں آتیں؟ مولانا حسرت موہانی کا ایک مطلع ہے۔

نظر اس رخ پہ ہے ادب کے خلاف | دل ہے اس فیصلے میں سب کے خلاف

عرفی شیرازی کہتا ہے۔

قبول خاطر معشوق شرط دیدار است | بحکم شوق تماشا مکن کہ بے ادبی است

پر حسن ظن یہ ہے کہ حسرت صاحب نے عرفی کا شعر دیکھ کر نہ لکھا ہوگا۔ لیکن اگر دیکھا ہو تب بھی میرے نزدیک اُن کو ضرور لکھنا چاہیے تھا، اس لیے کہ مولانا حسرت عرفی کی رائے سے اختلاف کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا کے اس شعر میں ایک عجیب بات پیدا ہو گئی ہے۔ خدا جانے وہ بات "فی بطن الشاعر" ہے یا نہیں، بہرحال مجھے نظر آتی ہے۔ یعنی یہ شعر اس قبیل سے ہے جیسے غالب نے چند شعر لکھے ہیں جن کے دو معنی نکلتے ہیں۔ مثلاً

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز | کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

مولانا حسرت کے مطلع کے بھی دو معنی ہو سکتے ہیں (۱) "نظر اس رخ پہ ہے ادب کے خلاف" یہ سب کا فیصلہ ہے اور دل اس فیصلے میں سب کے خلاف ہے۔ دل کے نزدیک اس رخ پر نظر ادب کے خلاف نہیں ہے۔ (۲) یہ دل کا فیصلہ ہے اور دل اس فیصلے میں سب کے خلاف ہے سب اس رخ پر نظر کرنا ادب کے خلاف نہیں سمجھتے دل ادب کے خلاف جانتا ہے۔

اسی ستمبر کے الناظر میں جگر مراد آبادی کی غزل شایع ہوئی ہے اُس کا ایک شعر ہے:-

قسمتوں سے ملا ہے ... میں   کہیں تو ... م باں نہ ہو جائے

یہاں جگر صاحب نے اپنے اُستاد حضرت داغ کے اس شعر سے فیض پایا ہے۔-

لذت عشق الٰہی مٹ جائے   درد ارمان ہو جانے ہے

دیکھیے "مرکزی خیال" ایک ہی ہے۔ لیکن اُستاد اُستاد ہی ہے۔ پہلے مصرع کا انداز داغ کے سوا دوسرا پیدا نہیں کر سکتا تھا۔

غرض جلیل صاحب آج کل کے شعرا میں سے کس کس کو پڑھنے والوں کے نزدیک چور ہونے کا یقین دلائیں گے اور اعتراف قصور پر مجبور کریں گے۔

غزل ثاقب

(از جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی)

سب ہے میخانے میں لیکن مجھے آرام نہیں   جب میں جاتا ہوں تو یا مے نہیں یا جام نہیں

کیوں ہے آنکھوں میں اندھیرا کہ ابھی شام نہیں   وہ لب بام نہیں خورشید لب بام نہیں

اب پھنس گیا ہوں میں تڑپنے میں مدد کیجئے درد   دل میں ٹھانی ہے کہ یا میں نہیں یا دام نہیں

اپنے ہنسنے کی خبر لے مرے رونے کو نہ دیکھ   میں تو اس نالہ و فریاد سے بدنام نہیں

دل کے پیچھے ہے زمانے کا زمانہ لیکن   کوچۂ عشق کوئی رہگزر عام نہیں

مانگئے مجھ سے نہ اب چپکے سوال اور جواب   تیر ہے آپ کا بھیجا ہوا پیغام نہیں

کیا رہوں منتظر حشر لحد میں ثاقب
میرے مرنے کا کسی ایک پہ الزام نہیں

مولانا حسرت موہانی کی عجیب تشریح

(از جناب منشی قرباں علی صاحب قمری)

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

غالب کے مرقومہ بالا شعر کی شرح مولانا حسرت موہانی نے یوں فرمائی ہے۔ کہ "عرض کیجے یعنی پیش کیجیے۔ جوہر اندیشہ کی گرمی کا بیان یہ ہے کہ وحشت کا صرف خیال آیا تھا کہ اسکے اثر سے صحرا جل گیا۔ یعنی چونکہ وحشت کی حالت میں صحرا نوردی کی نوبت ضرور آتی ہے اسلیے خیال وحشت سے صحرا جل گیا۔"

حیران ہوں کہ اس تحریر کو کیا کہوں۔ شعر کا مطلب اگر مشکل تھا تو اس شرح کا سمجھنا مشکل تر ہے شعر کے لفظی معنی کو اگر شرح کہا جائے تو لفظ شرح بے معنی ہو جائے گا۔ ایسی تحریر یا کلام کے لیے شرح کی ضرورت ہوتی ہے جس کا مطلب لفظی معنی سے واضح نہ ہوتا ہو۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اگر کسی تحریر یا تقریر یا شعر کے لفظی معنی شرح سمجھے جائیں تو لفظ "شرح" کے معنی لفظی معنی ہوں گے اور یہ غلط ہے۔ حسرت صاحب کی تحریر سے شعر کا مطلب واضح ہونے کی بجائے خبط ہو کر رہ گیا ہے فرماتے ہیں کہ جوہر اندیشہ کی گرمی کا بیان یہ ہے کہ وحشت کا صرف خیال آیا تھا کہ اسکے اثر سے صحرا جل گیا۔ اور اس جملہ کا مطلب یوں واضح کرتے ہیں کہ "چونکہ وحشت کی حالت میں صحرا نوردی کی نوبت ضرور آتی ہے اسلیے خیال وحشت سے صحرا جل گیا۔" اس تحریر کو پڑھ کر بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ "کمال ہے" مجھے اس وقت غالب کی وہ مشہور رباعی یاد آ رہی ہے

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنوران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اس میں سخنوران کامل کی ترکیب اور چوتھے مصرع "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" پر غور کرتا ہوں تو وہی دو الفاظ زبان پر آ جاتے ہیں یعنی "کمال ہے" اسکے بعد اس کا یہ مطلع پیش نظر ہو جاتا ہے

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

یہ شعر زیر بحث کی صورت خیال ختم ہو کر ردیف "جل گیا" پر جاتا ہے ساتھ ہی ساتھ دیگر اساتذہ کے

اندیشہ کی گرمی کے ظاہر کرنے کے ارادہ کا صحرا جل گیا متحمل نہ ہوا لہذا مجھے یہ ثابت کرتا ہے کہ گرمیٔ خیال کے
ظاہر کرنے کا ارادہ "کہاں" سے لایا گیا۔ لیکن یہ کچھ مشکل نہیں۔ کیونکہ میں خود اس وقت دیوانگی کر رہا ہوں
بیٹھے بٹھائے ایک دردِ سر مول لے رہا ہوں مجھے ایسی کیا پڑی تھی کہ مولانا حسرت موہانی کی شرح پر تبصرہ
لکھوں۔ لہذا یہ جو کچھ تحریر کر رہا ہوں دیوانگی یا بلفظ دیگر وحشت ہے۔ لیکن مجبور ہوں لکھنا ہی پڑتا ہے میں اس
وقت اپنے خیالات ظاہر کر رہا ہوں، اور لکھ رہا ہوں کہ یہ دیوانگی ہے میری "وحشت" کا انجام اُس وقت
معلوم ہوگا جب مضمون دفتر الناظر میں پہنچے گا اور شائع ہوگا۔ مگر غالب میری طرح نا عاقبت اندیش نہ تھا
اُس نے ابھی خیال ہی کیا تھا کہ ایسا کروں (وحشت) کہ نتیجہ ظاہر ہو گیا اور صحرا میں آگ لگ گئی۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آگ ہی لگانی تھی (بقول مولانا حسرت موہانی) تو صحرا میں
جانے کی کون سی ضرورت تھی جہاں جلنے کے واسطے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے شہروں اور
آبادیوں میں جلنے جلانے کی کل چیزیں ہوتی ہیں تعجب یہ ہے کہ وہ گرمیٔ خیال کیسی تھی جس نے صحرا میں جلنے
کا مادہ پیدا کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنی گرمیٔ خیال کی شدت ثابت کرنے کے واسطے صحرا کا
ذکر کیا ہے یعنی ایسی جگہ جہاں جس کا مادہ نہیں ہوتا وہاں بھی میری گرمیٔ خیال نے اثر پیدا کیا۔ کہتا ہے

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں

اس مصرع میں لفظ "کہاں" غور طلب ہے۔ یعنی اپنی گرمیٔ خیال کا ذکر اب کہاں کروں جبکہ صحرا میں بھی
جہاں جس کا مادہ نہیں ہوتا اسکے بیان کرنے کا ابھی ارادہ ہی کیا تھا کہ آگ لگ گئی

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی — وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

یادِ رفتگاں

جہاں میں اب نہ قیس و وامق و فرہاد کا باقی — نہ اہلِ وفا لیکن رہا "ذکرِ وفا" باقی
نہ کوئی تمنا باقی نہ کوئی مدعا باقی — سرِ محشر تھا وہ بت رہا پیشِ خدا باقی
مریضِ غم کو مرنا بھی نہ چھوڑا اِن دواؤں نے — پسِ مردن کفن میں رہ گئی خاکِ شفا باقی
شکایت اُن کے دشمن کی وہ آزردہ ہوئے مجھسے — کیا تفریق دونوں کو تو یہ حاصل ہوا باقی
مٹا دیا - قیامت آگئی - وہ مٹ گئی دنیا — اکیلا تھا خدا اور پھر اکیلا رہ گیا باقی
فنا سے دو آئیں اور میں قدموں پہ جاں دیدوں — سراپا مٹ چکا ہوں ہے یہی رسمِ فنا باقی
پسِ مردن نشانِ قدردانی وہ یہ لکھتے ہیں — نہیں کوئی عزیز آشنا سا آشنا باقی

(محمد عبدالعزیز عزیز - کالپی)

تاریخہائے وفات ریاض مرحوم

(از جناب مولانا شاہ محمد ابوالاشرف صاحب پھلواروی مہاجر)

ریاض شاعر معجز بیان نادر تھا
گیا جہاں سے رہا ہے اب اُسکا افسانہ

چہک رہا تھا وہ باغ سخن میں مثل ہزار
وہ باغ ہو گیا جاتے ہی اُس کے ویرانہ

زبان شوخ، بیاں شوخ اور طبیعت شوخ
پری کلام بھی دیوان بھی پری خانہ

بلا کا ہو لیے سرمست شاہد معنی
کہ جس پہ پڑ گیا سایہ ہُوا وہ دیوانہ

وہ اپنی طرز میں یکتا وہ اپنے طور میں فرد
صدف میں بحر سخن کے وہ دُرِّ یکدانہ

وہ اپنے رنگ میں ہر بادہ خوار کا مرشد
وہ مست جام معانی وہ پیر میخانہ

وہ پی کے بادہ تمام اُٹھا کیف میں ہشیار
وہ سب پیے ہوئے مدہوش اور مستانہ

نکال کے ظرف میں اُسکے شراب بینائی
وہ اپنی مے کے لیے آپ اپنا پیمانہ

سفید ریش اور اُس پر بلا کی زندہ دلی
بزرگ شکل مگر صاحب طبع طفلانہ

وہ پیر کہنہ مگر دل جوان ہے مست الست
وہ پاک و صاف مگر دُختِ رز سے یارانہ

زباں میں لذت و خوبی ادا میں لطف و مزہ
بیاں میں ندرت و شوخی کلام رندانہ

سخن کے جوش جنوں میں وہ اسکی گویائی
زبان نہ کھول سکا جیسے آگے فرزانہ

بلند و پست سخن دونوں میں بیان کا لطف
نباہ ہوا دونوں کا ایک پیمانہ

وہ مالک سخن ہیں اک سند لسان الملک
سند ہے اُن کے لیے یہ زباں کا پروانہ

کمال یہ ہے کہ اپنوں ہی پر نہیں موقوف
معترف اس کا ہے اپنوں کی طرح بیگانہ

قبول خلق میں اُس کے کوئی کلام نہیں
قبول حق بھی ہو۔ جنت میں پائے کاشانہ

شرف ہے مصرعۂ سال وفات درد انگیز
بنا ریاض اور اب آہ آج ویرانہ

۱۳ ھ ۵۳

ایضاً

دل سب اہل سخن کے ہیں پُر داغ
غم مرگ ریاض بے حد ہے

پھول تربت کے بن گئے وہ دل
دیکھنا کیا بہار مرقد ہے

کہوں نہ ہو کس کی ہے یہ تربت خاص — وہ جو آلِ رسولِ امجد ہے
لقب اس کو ملا لسان الملک — نام سید ریاض احمد ہے
کہہ دو مدفن پہ اسکے یہ تاریخ — لالہ زارِ ریاض احمد ہے

۱۳ ھ ۵۳

ایضاً

ریاض چل بسا۔ دل نے کہا اک آہ کے ساتھ — کہ لو بس اب سخن شاعراں کا لطف گیا
کسی ظریف نے بھی تاریخ آہ آہ کے ساتھ — ریاض کیا گیا گویا زباں کا لطف گیا

۱۳ ھ ۵۳

ایضاً رباعی

اردو کی بہار تھا ریاضِ اردو — باقی اس تک رہا ریاضِ اردو
فانی دنیا سے جب ہوا وہ رخصت — تاریخ ہوئی۔ تھا ریاضِ اردو

۱۳ ھ ۵۳

ایضاً

تھا اہل سخن میں کیا ریاض مرحوم — آپ اپنی نظیر تھا ریاض مرحوم
کہہ دیجیے تاریخ وفات اب اسکی — لکھ دیجیے۔ چل دیا ریاض مرحوم

۱۳ ھ ۵۳

ایضاً

دنیا سے گیا ریاض خوشگو خوشخو — دھوم اس کی زباں کی ہند میں تھی ہر سو
کانٹے سے ہوئے سخن کے گل بوٹے شرف — بن ہو گیا آہ کیا ریاضِ اردو

۱۳ ھ ۵۳

رسید کتب

(۱) کتاب [illegible] (ذوالاصل) از [illegible] مکتبہ ابراہیمیہ [illegible]
(۲) علم القرآن (قواعد عربی) " ۲ر
(۳) اردو کا پہلا ناول نگار - از [illegible] ۸ر
(۴) غالب شکن - از مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی ۲ر
(۵) کچھ رنگین رباعیاں - از جناب محمود اسرائیلی ۱ر
(۶) بچوں کا تحفہ (دو حصے) از مولوی محمد شفیع [illegible] ۸ر

نظرے خوش گزرے

اسی ماہ کے شروع میں علی گڑھ جانا ہوا۔ برسوں کے بعد مسلم یونیورسٹی میں چار دن رہنے کا موقع ملا۔ قاضی عدیل عباسی وکیل بستی نے جو علی گڑھ کے پرانے طالب علم ہیں، کبھی اخبار نویسی کرتے تھے اور تحریک خلافت سے بھی وابستہ رہ چکے ہیں حال ہی میں یونیورسٹی پر الحاد و دہریت کی یورش کا شکوہ اخباروں میں چھپوایا تھا اس لیے قدرتاً اس باب میں تجسس کا خیال پیش نظر رہا۔ بعض احباب سے براہ راست سوالات کیے گئے، بعض نے اثنائے گفتگو میں خود ہی تبصرہ کیا۔ سب کا ماحصل یہ تھا کہ مغربی زندگی کی وبا جو ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہے، یہاں بھی مسلط ہے اور مسلمان حکومت کھو کر اب اپنے مال و متاع دین و دنیا کا نیلام کرنے میں مصروف ہیں۔

ذمہ داران مختار اور کارکنان مجبور دونوں اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں کہ طلبا جیسے دماغ و افکار لے کر گھر سے آتے اور جن خیالات و عادات کے خوگر ہوتے ہیں وہی یہاں نشوونما پاتے ہیں۔ نواب محسن الملک مرحوم نے ایک بار ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر یہاں ایک تقریر میں یہی فرمایا تھا۔ لیکن یہ تاویلات اصل حقیقت کی پردہ پوش نہیں بن سکتیں اور نہ عام مسلمانوں کی ان باتوں سے تشفی ہو سکتی ہے۔

یونیورسٹی اُن لوگوں کے چندے سے قائم ہوئی ہے جو مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں، اُس کا نظم و نسق جن چیدہ افراد کے ہاتھ میں ہے وہ بھی مسلمان کہے جاتے ہیں، اساتذہ اور کارکن بیشتر مسلمان ہی ہیں۔ طلبا جب یونیورسٹی میں آتے اور اُس کے ماتحت اداروں میں داخل ہوتے ہیں تو جس طرح وہ علوم دنیا سے بے بہرہ ہوتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ دین و مذہب کی باتوں سے بھی کورے ہوں پھر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جہاں ریاضی، تاریخ، فلسفہ، سائنس، ادب اور مختلف السنہ کی تعلیم دے کر وہ دنیاوی کامرانیوں کے قابل بنائے جاتے ہیں وہاں اُن کی تربیت پر بھی کامل توجہ کی جائے اور وہ اس لائق بنا دیے جائیں کہ دنیا میں دیندار مسلمان بن کر رہیں۔

مسلم یونیورسٹی قانون سازی کے لحاظ سے ایم اے او کالج سے زیادہ بااختیار ہے۔ جس طرح علوم و السنہ کی تعلیم میں کامیابی کے لیے ایک معیار مقرر ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ مذہبی تربیت اور عملی زندگی میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کی غرض سے بھی کوئی معیار مقرر کر دیا جائے جس کی تکمیل کے بغیر کوئی سند نہ دی جائے۔

ایک دن یونیورسٹی کی مسجد میں نماز فجر کے وقت حاضری ہوئی۔ راستے میں دیکھا کہ ایک شخص ہاتھ

کے [illegible] لیے زور زور سے گھنٹا بجا۔ میں گشت کر رہا ہے اور کچھ دیر تک یہ شغل جاری رہا۔ شاندار مسجد کے [illegible] اصل [illegible] دری کی عمدہ جانمازیں بچھی ہوئی، وسط میں خوشنما جھاڑ لگا ہوا، برقی روشنی ہو رہی ہے مگر آدمی کوئی نہیں۔ ایک جانب بیٹھ گیا کچھ دیر میں امام صاحب تشریف لائے اور سنتیں پڑھ کر وظیفہ میں مصروف ہو گئے۔ دفعتاً کان میں اقامت کی آواز آئی دیکھا تو موذن صاحب اور امام صاحب کے ساتھ شریک ہونے کے لیے میرے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ نماز کے بعد سلام پھیرا تو نصف درجن اصحاب اور نظر آئے جو درمیان میں شامل ہو گئے تھے۔ غور سے دیکھا تو ان میں بیشتر ادھیڑ عمر کے غالباً یونیورسٹی کے ملازمین تھے، صرف ایک نوجوان وضع قطع سے طالب علم معلوم ہوئے دعا کے بعد مسجد سے نکل کر اسٹریچی ہال کے پیچھے والے میدان میں ٹہلنے لگا۔ اور تقریباً طلوع آفتاب تک وہیں رہا۔ اس اثنا میں بورڈنگ کے کمروں کی طرف بار بار حسرت سے دیکھا۔ کہیں کہیں برقی روشنی کے آثار دیکھ کر یہ سمجھا کہ اب طلبا جاگے ہیں لیکن عام طور پر سب طرف سناٹا ہی رہا۔ اور یہ معلوم ہوا کہ اس اسلامی بستی میں طلوع آفتاب سے قبل صبح نہیں ہوتی۔ اس سے پیشتر بارہا یونیورسٹی کے بورڈنگ ہی میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور مسجد میں فجر کی نماز بھی ادا کی گئی مگر آٹھ دس سال پیشتر تک یہ صورت نہ تھی۔

گذشتہ اپریل میں نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا وہ خطبۂ صدارت دیکھنے میں آیا تھا جو صوبۂ متحدہ کی ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ میرٹھ میں پڑھا گیا تھا۔ نواب صاحب کا تعلق علیگڑھ تحریک سے بہت دیرینہ ہے اور ان کا یہ اعتراف کس درجہ پُر حسرت ہے:—

"جب مسلمانوں نے گذشتہ صدی کے نصف آخر میں سرسید کی تحریک سے انگریزی تعلیم پاچکی تو اُن کے دل خوشگوار امیدوں سے معمور تھے اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ جدید تعلیم کے بعد مسلمانوں کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔ یعنی علمی اخلاقی تمدنی اور مالی حیثیت سے ان کا مرتبہ بلند ہو جائے گا اور وہ انتظام مملکت میں شریک کار ہو کر اپنی اصلی پوزیشن حاصل کریں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ امیدیں پوری نہیں ہوئیں بلکہ حالات زیادہ ابتر ہو گئے اور ہم نے اس تعلیم سے جو کچھ حاصل کیا اس سے زیادہ ضائع کر دیا!

بودیم طلبگار سود و کردیم زیاں   تعجیل نمودیم ز تدبیر ستدیم

یہ واقعہ ہے کہ اس تعلیم پر ہم نے اپنی صحت، دولت کے علاوہ اسلامی تہذیب و شائستگی، مشرقی علوم و فنون، قومی غیرت و عصبیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلامی روح کو بھی قربان کر دیا۔ اور یہ سب کچھ قربان کرنے کے بعد چند ڈگریاں حاصل کیں جن کی بازار میں جو قیمت ہے وہ ظاہر ہے ..."

اس عام اعتراف کی موجودگی میں موجودہ عارضی وائس چانسلر نواب اسمٰعیل خاں کے متعلق جو کچھ عباسی صاحب

[illegible] نہیں ہے کہ ہمیں پھر اس دور تہذیب و ترقی میں مقابلہ ہے۔ خیالات و رجحانات کے طبعی تنوعات
[illegible] وہ مذہبی تحلیل و طرز معاشرت کی منافرت دوسری طرف اس امر کا موقع نہیں دیتی کہ پوری
[illegible] کام ہے۔ کہنے کو سب مسلمان ہیں، سب یونیورسٹی کے دردمند ہیں، سب مسلمانوں کے
بہی خواہ ہیں، مگر کتنے ان میں سے ایسے ہیں جو خود شعائر اسلامی کے پابند ہوں یا مسلم یونیورسٹی کے طلبہ
کو دیندار بنانے کے متمنی۔ جو خود اپنے اجتہاد یا غفلت کی بنا پر اسلامی زندگی بسر نہ کرتے ہوں ان سے
کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ قوم کے نونہالوں کو مذہبی پابندیوں میں جکڑا پسند کریں گے۔ وہ چند اراکین جو [illegible]
خیال کے ہیں اور اپنی قدیم تربیت یا دینی اقلیت کے بدولت اب تک اکثر کے تغیر سے بچے ہوئے ہیں اور
جو سمجھتے ہیں کہ ہر مسلمان کو وہ طالب علم ہو یا استاد، یونیورسٹی کی جماعت منتظمہ کا رکن ہو یا ناظم اعلیٰ،
غریب ہو یا امیر، نوکر ہو یا آقا، والی ملک ہو یا خود مختار بادشاہ، مسلمان ہونے کا شرف اسی وقت حاصل
ہو سکتا ہے جب دل سے خدائے واحد کا پرستار اور اس کے پیغمبر برحق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلقہ
بگوش ہو اور عمل سے احکام الٰہی کی فرماں برداری اور فرمان رسالت کی بجا آوری کا نمونہ پیش کرے اس
نقارخانہ میں ان کی آواز غالباً طوطی سے بھی کم سنائی دیتی ہوگی۔

اور جب تک مسلم یونیورسٹی کے اراکین منتظمہ اور معلمین و اساتذہ کی اکثریت کے قلوب میں اللہ تعالےٰ
کے فضل و کرم سے یہ احساس نہ پیدا ہو جائے کہ اس ادارہ کے طلبہ صرف علوم دنیا حاصل کرنے نہیں آتے
کہ یہ جنس دوسری سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں بھی سستی اور ارزاں قیمت پر ملتی تھی اور ملتی ہے بلکہ اس کے قیام کا
مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمان طلبہ اسلامی شعائر و خصوصیات سے بیگانہ نہ ہونے پائیں، یونیورسٹی محض گریجویٹ
بنانے کی کل بنی رہے گی اور دہریت، الحاد و لامذہبی کے جراثیم پھیلتے اور بڑھتے رہیں گے تا آنکہ شاید سو [illegible]
سال کے بعد کوئی ٹوکنے والا بھی نہ رہے گا۔

مسلم یونیورسٹی نے اسی سال سے اپنے شعبۂ اردو کو وسعت دی اور ایم اے کا درجہ کھولا ہے۔ بعض جرائد
کی طرح ہم کارکنان یونیورسٹی کو اس بات کے لیے سزاوار مبارکباد نہیں سمجھتے کہ جو قدم یونیورسٹی کے قیام کے بعد
ہی اٹھنا چاہیے تھا وہ اب تیرہ سال کے بعد اٹھایا گیا ہے۔ علی گڑھ اگرچہ اردو کا ایسا قدیم مرکز نہیں جیسا
دہلی یا لکھنؤ ہے۔ مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو کا جدید دور بہت کچھ سرسید، ان کے رفقا اور
علی گڑھ تحریک ہی کا رہین منت ہے۔ اس لیے بیجا نہ ہوگا اگر ہم یونیورسٹی کی مجلس تعلیمی سے یہ توقع کریں کہ
وہ ہر سال بہت سے کامیاب طلبہ کو سند عطا کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرے کہ مسلم یونیورسٹی میں

[illegible] سے مستحق وہی طلبہ قرار دیے جائیں جو عام طور پر صحیح و فصیح اردو لکھنے اور بولنے کی قابلیت پیدا کر
[illegible] اردو کے تمام شعبوں سے بخوبی واقف ہوں۔
عثمانیہ یونیورسٹی کے مقابلہ میں مسلم یونیورسٹی کو موقع کے لحاظ سے جو آسانیاں حاصل ہیں ان کی بنا پر کوئی
وجہ نہیں ہے کہ اس طرف توجہ کی جائے تو یہاں کے مستند اہل زبان حیدرآباد کے طیلسانین سے بہتر نتائج نہ پیش کریں۔

اسی سلسلہ میں دہلی اور لکھنؤ کی یونیورسٹیوں کا ذکر ناگزیر ہے جنھوں نے اب تک چراغ تلے اندھیرا کر رکھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان یونیورسٹیوں کا انتظام جس قسم کے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہ انگریزی زبانوں اور مغربی علوم کے مقابلے میں ہندوستانی زبان کی کیوں پروا کرنے لگے، لیکن اگر دہلی و لکھنؤ کے اخبارات برابر یاد دہانی کرتے رہیں اور وہ اصحاب جن کو اردو کا درد ہے اور جو اسے السنۂ عالم کی بزم میں عزت کی جگہ دلانا چاہتے ہیں ارباب حل و عقد کو توجہ دلاتے رہیں تو یقین ہے کہ جلد ہی ان یونیورسٹیوں میں بھی اردو کا علیحدہ شعبہ قائم ہو جائے گا۔

تعجب ہے کہ دہلی کے جو لوگ نہایت ہی قلیل مدت میں ایک آل انڈیا اردو کانفرنس رچا سکتے اور اردو کی تنظیم کی تشہیر کر ڈالتے ہیں، باوجود اپنے اثر و نفوذ کے اور سارے ہیجان کے اب تک دہلی یونیورسٹی سے اردو کی اہمیت تسلیم کرانے میں کامیاب نہ ہوئے۔

لکھنؤ کی انجمن اردو تو عرصہ سے مسٹر سید آل رضا ایڈوکیٹ کے دولت خانہ پر خواب استراحت میں مصروف ہے۔ صاحب موصوف شعر خوب کہتے ہیں۔ اور شاعر قوم کے سپاہی سمجھے جاتے ہیں۔ خدا کرے کہ ان کو اپنے تغافل کا احساس ہو جائے اور وہ انجمن کو بیدار کر کے اسے نئی زندگی بخشیں۔ اور اگر ان کو وکالت کی مصروفیتوں اور شعر گوئی میں انہماک کی وجہ سے اتنی مہلت نہیں کہ انجمن کی خدمت کر سکیں تو کم سے کم ان پر لازم ہے کہ اپنے ساتھ کے منتخب ہونے والے دیگر حضرات میں سے کسی دوسرے کارکن کو انجمن کا دفتر حوالہ کریں۔

یہاں بھی دہلی کی نقل اتارنے کی کوشش میں ایک اردو تنظیم کا نام اخبارات میں آتا رہا ہے۔ اگر اس تنظیم والوں میں کچھ زندگی اور کام کرنے کا ولولہ ہے تو چاہیے کہ انجمن اردو کو فنا ہونے سے بچانے کے لیے مناسب کارروائی کریں اور اس شہر کی شان و منزلت کے مطابق اگر نہیں تو کم سے کم اپنی بساط کے موافق انجمن اردو کو چلائیں۔

جمیل الدین عالی صاحب نے جو حال ہی میں مسلم یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر ہو گئے ہیں حسب وعدہ اس شمارے
کے لئے ایک بہت اچھا مضمون بھیجا ہے جس کے لیے افسوس ہے کہ اس نمبر میں جگہ نہ مل سکی۔ انشاء اللہ دوسرے شمارے
میں شامل کر دیا جائے گا۔

ابھی تک بعض اُن احباب نے جو ایڈیٹر الناظر پر بہت کرم کرتے ہیں اور جن کے مضامین کا سلسلہ ابتدا ہی سے شروع ہو جانا چاہیے تھا، باوجود یاد دہانیوں کے الناظر کو محروم التفات ہی رکھنا پسند فرمایا ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ قدیم و جدید معاونین کی عنایت سے چند ہی ماہ کے اندر مضامین کا اچھا خاصا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے اور اب آسانی سے ۶۴ صفحے کا پرچہ نکالا جا سکتا ہے۔ ذرا روپیہ کی آمد کا سلسلہ بھی درست ہو جائے تو غالباً جنوری ہی سے رسالہ کا حجم ۸۰ صفحے کر دینا ممکن ہوگا۔

مسٹر سلطان حیدر جوش جو دورِ سابق میں بزمِ الناظر کے رکن رکین تھے آجکل شبابِ رفتہ کی یاد تازہ کرنے کی دھن میں اسی دلچسپ موضوع پر ایک مستقل تصنیف تیار کر رہے ہیں۔ انھیں کی کشش علیگڈھ سے گئی تھی۔ جہاں اسکے بعض اجزا خود مصنف کی زبان سے سنکر لذت اندوز ہوا وہیں ایک دوسری تصنیف کا مسودہ ساتھ آیا ہے جس سے انشاء اللہ ناظرینِ الناظر کے کام و دہان کی بھی ضیافت ہوگی۔

حضرت "عبداللہ" ملا پودھاموی صاحب، جناب بسمل اور ارشدین، دیکھیے کب کروٹ لیتے اور اپنی محبت کا تحفہ بھیجکر روایاتِ قدیم کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

استاد محترم جناب پنڈت منوہر لال زتشی صاحب کی شفقتِ بزرگانہ سے حضرت ریاض کا وہ مطبوعہ مجموعۂ غزلیات دیکھنے میں آیا جو دو تین سال ہوئے الہ آباد یونیورسٹی کے ادب دوست پروفیسر پنڈت امرناتھ جھا صاحب نے اسی پریس کو ملکیہ پور میں بڑی نفاست کے ساتھ اپنے احباب میں تقسیم کرنے کی غرض سے طبع کرایا تھا۔ یہ دیکھا کتابوں کے سائز پر ہے۔ ۱۱۶ صفحوں میں ۶۹ منتخب غزلیات اور ۱۲ قطعات ہیں۔ ابتدا میں نظمی رگھوپتی سہائے صاحب فراق کا مقدمہ ۲۰ صفحے پر ہے۔ کئی صاحبوں سے تحریک کی گئی تھی کہ حضرت ریاض کی شاعری پر کچھ لکھیں اور سب ہی کہتے تھے کہ انکا کچھ کلام جمع کر کے دیا جائے۔ الناظر اور دیگر رسائل میں کثرت سے غزلیں چھپی ہوئی موجود ہیں مگر انکو کیا نقل کرانا یا سارے انبار کو دوسری جگہ منتقل کرانا آسان نہ تھا۔ اس مجموعہ کے دستیاب ہو جانے سے یہ مشکل حل ہو گئی اور جناب ا۔ ز۔ صاحب لکھنوی نے جو کبھی زمانہ اور الناظر میں اس قسم کے مضامین تحریر فرمایا کرتے تھے ازراہِ محبت باوجود پیرانہ سالی اور مصروفیتوں کے سالہا سال کے بعد پھر قلم اٹھایا اور ایک مضمون تیار کر دیا ہے جو انشاء اللہ عنقریب ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔

تعارف

ذیل میں بعض قدیم علمی سرمایوں کی جدید کتابیں حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔

(۱) **خوابِ پریشاں** - جناب منشی امیر احمد علوی صاحب بی اے نے شیکسپیئر کے ڈرامہ "مڈسمر نائٹس ڈریم" کو اردو کا لباس پہنایا تھا۔ منشی سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ نے اسی زمانہ میں اسے اپنے اخبار میں شائع کیا تھا اور ابتدا میں [illegible] سے متعلقات تحریر فرمایا تھا۔ اب یہ ترجمہ ڈرامہ بجنسہٖ اسی [illegible] کے کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ حجم ۸۰ صفحے طباعت بالکل معمولی۔ تقطیع کتب درسی۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ۔
کتب خانہ امیر محل۔ کاکوری ضلع لکھنؤ

(۲) **فلسفہ کی دوسری کتاب** مسٹر عبدالماجد بی اے کے وہ فلسفیانہ مضامین جو الناظر اور دوسرے رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے اب کتابی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ پہلا مجموعہ فلسفہ کی پہلی کتاب کے نام سے دو سال ہوئے چھپا تھا اب دوسرا مجموعہ شائع ہوا ہے جس میں سات مضامین ہیں۔ تقطیع کتب درسی حجم ۱۵۶ صفحے طباعت عمدہ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ۔ - دارالمصنفین۔ اعظم گڈھ۔

(۳) **کشکولِ فکر** - مسٹر سلطان حیدر جوش کے افسانے اور متفرق مضامین جو الناظر اور دوسرے رسالوں میں چھپتے تھے کئی جلدوں میں شائع کیے جائیں گے۔ گیارہ مضامین کا پہلا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے شروع میں جوش صاحب کے ایک عزیز مولوی حاجی محمد طیب صاحب کی التماس ہے اور خود مصنف کی عکسی تصویر۔ تقطیع کتب درسی حجم ۱۸۰ صفحے۔ طباعت دیدہ زیب۔ قیمت ۱ر ملنے کا پتہ۔
حاجی محمد طیب صاحب۔ معرفت: [illegible] علیگڈھ

(۴) **دیوانِ مومن** - مولوی ضیاء احمد صاحب ضیاء بدایونی ایم اے معلم فارسی مسلم یونیورسٹی نے کئی سال ہوئے مومن کے قصائد حواشی کے ساتھ مومن کے مختصر سوانح و خصوصیات کلام لکھ کر الناظر پریس میں طبع کرائے تھے۔ اب اسی طرح مومن کی غزلیات، فردیات و رباعیات کا مجموعہ حواشی کے ساتھ مرتب کیا اور کلام مومن پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ شروع میں حکیم مومن خاں کی عکسی تصویر [illegible] ڈاکٹر سید محمد حفیظ صاحب [illegible] الہ آباد یونیورسٹی کا تعارف اضافہ کیا ہے۔ [illegible] حجم [illegible]
قیمت [illegible] ملنے کا پتہ: - [illegible] صاحب لالہ رام دیال اگروال تاجر کتب الہ آباد

نئی کتابیں

[illegible] ۔ مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کا تازہ ترین افسانہ ۔ ۲ حصوں میں ۔ حجم ۲۰۰ صفحے ۔ قیمت ۱؎ ۸؍

سی پارۂ دل ۔ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کی غزلیات کا مجموعہ مع تعارف از شاہد تکلیم مرحوم سابق ایڈیٹر نقاد ۔ قیمت ۶؍

جام صہبائی ۔ پنجاب کے نوجوان شاعر علیہ السمیع پال آفر صہبائی کی رباعیات و قطعات کا مجموعہ ۹؍

گنجینۂ اسکاؤٹنگ ۔ پہلے اسکاوٹ کی تحریک یورپ و امریکہ کے علاوہ مشرق میں بھی پھیل رہی ہے اور نوجوانوں کی جسمانی و اخلاقی تربیت کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے ۔ اس موضوع پر مسٹر شبیر احمد بی اے سکنڈ ماسٹر مسلم یونیورسٹی اسکول نے یہ مفید و مفصل کتاب لکھی ہے ۔ حجم ۳۰۰ صفحے قیمت ۱؎ ۸؍

ملیبار ۔ تحریک خلافت کے دوران میں مالابار کی موپلا قوم کو خوب شہرت حاصل ہوئی ۔ حکیم شمس اللہ قادری صاحب نے اس رسالہ میں موپلاؤں کے وطن کا جغرافیہ و تاریخ اور اس قوم کے حالات لکھے ہیں ۔ قیمت ۱۰؍

حالات حزیں ۔ نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی کا ایک پر مغز لکچر مشہور فارسی شاعر شیخ علی حزیں کے حالات و شاعری پر ۔ قیمت ۳؍

تفسیر المعوذتین ۔ حافظ ابن قیم جوزی ... سورۂ فلق و سورۂ ناس کی قابل قدر تفسیر لکھی تھی ۔ جس کا اردو ترجمہ نا ... ہے ۔ قیمت ۸؍

اسلامی تصوف ۔ حافظ ابن قیم کی کتاب طریق الہجرتین و باب السعادتین حصہ اول کا اردو ترجمہ ۔ جس میں تصوف اسلام، فقر مسنون، طریقت اور حقیقت کے اصول و قواعد بیان کرکے بتایا ہے کہ شاہراہ شریعت ہی سعادت کا حقیقی ذریعہ اور سالک کا مقصود و مطلب ہے ۔

صولت شیر شاہی ۔ یعنی سلطان عادل شیر شاہ سوری رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری جس نے محض اپنی ہمت، شجاعت، اور حسن تدبیر سے ہندوستان کی سلطنت حاصل کی اور بڑی قوت، قابلیت، تدبر و انصاف سے حکومت کی اور ایسے آئین و قوانین وضع کیے جن کی نظیر نا مشکل ہے ۔ حجم ۲۰۰ صفحے ۔ کتابت طباعت دیدہ زیب ۔ قیمت ۱؎ ۴؍

حیات محسن ۔ نواب محسن الملک مرحوم سابق سکریٹری علیگڈھ کالج و معتمد ریاست حیدرآباد دکن کے مفصل سوانح حیات اور ان کی عظیم الشان [illegible] بیان ۔ از منشی محمد امین زبیری سابق ایڈیٹر [illegible] حجم ڈھائی سو صفحے ۔ قیمت ۱؎ ۸؍

[illegible] ۔ [illegible] مرحوم کا قابل دید انتخاب از مولانا حاجی ابو بکر محمد شیث صاحب جونپوری ناظم دینیات مسلم [illegible] ۔ حجم ۲۲۴ صفحے ۔ چار رنگ ۔ قیمت ۸؍

ملنے کا پتہ ۔ [illegible] بک ایجنسی ۔ لکھنؤ

نمبر ۶ جلد ۳۶ دسمبر ۱۹۳۴ء

قصص سلیمان

(از جناب الحاج مفتی [illegible] صاحب علوی [illegible])

علماے بنی اسرائیل نے عظمت و جبروت سلیمانی کا نقشہ دکھانے کے لیے اپنے شہنشاہ اعظم کی بابت ایسے ایسے عجیب و غریب افسانے مستند مذہبی کتابوں میں درج کیے ہیں کہ انکو اردو زبان میں منتقل کیا جائے تو طلسم ہوشربا کا ایک دفتر مرتب ہو اور دنیاوی قصوں کا بازار سرد ہو جائے۔ مگر ہمارا موضوعِ سخن "بنی اسرائیل کی تباہی" ہے نہ کہ انکے عروج و کامیابی کی قصیدہ خوانی۔ شان و شوکت کی مدح سرائی اس ضرورت سے یہ دکھائی گئی کہ وہ داستان زوال کا دیباچہ ہے اور اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر ہم اس بوستانِ خیال سے صرف تین مختصر کہانیاں بطور نمونے بیان کی جاتی ہیں تاکہ ترک الکل فوت الکل کا الزام نہ آئے اور ناظرین اس گلستانِ عجائب سے بہار فصل کا قیاس کر لیں۔

(۱)

ہوائی قالین

جب شہنشاہ بنی اسرائیل کو قادر ذوالجلال کی سرکار سے تمام انسانوں، جنوں، پریوں، حیوانات، وحوش و طیور پر حکومت عطا ہوئی تو اس عظیم الشان سلطنت کی نگرانی اور محافظت کے لیے ایک ہوائی قالین بھی عنایت ہوا جس پر دولتِ اجلال فرما کر آپ اقطاعِ عالم کا گشت لگاتے اور رعایا کی خبرگیری فرماتے

تھے - یہ قالین دھانی رنگ کے ریشم کا تھا اور اس پر نفیس زردوزی کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے - یہ ہوا کے دوش پر چلنے والا شہر ۶۰ میل لمبا اور ۶۰ میل چوڑا تھا - سرداران فوج، شہزادے، وزرا، امرا، اور لشکری ہمرکاب ہوتے تھے - آصف بن برخیا وزیر اعظم - بادشاہ کے دیوان منشی "رام" - چیتے، شیروں کا سپاہ امنوع اور طیور کے سردار بھی خدمت کے لیے حاضر رہتے تھے - سرعت کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ دمشق میں صبح کو ناشتہ کرتے اور ترکستان میں شام کا کھانا تناول فرماتے تھے -

ایک دن بادشاہ کے دل میں خطرہ آیا کہ اب دنیا میں کوئی شخص مجھ سے زیادہ ذی مرتبت نہیں ہے - ہوا کے فرشتے نے فوراً چالیس ہزار لشکری قالین پر سے گرا دیے اور بادشاہ کو فہمائش کی کہ آپ کی عزت و منزلت ایک مقتدر کی عبادت سے ہے مالک الملک کی عظمت یاد رکھیے تو سب آپ کے مطیع فرمان رہیں ورنہ دوسرے بنی آدم پر آپ کو فضیلت نہیں ہے

ایک دن بادشاہ مع اپنے لشکر کے قالین پر سوار عجائبات عالم کا تماشا دیکھ رہے تھے کہ ایک وادی پر گزر ہوا جس میں چیونٹیاں آباد تھیں بادشاہ کو تمام حیوانات اور حشرات الارض کی آواز سننے اور گفتگو سمجھنے کی قابلیت مالک دوجہاں نے عنایت کی تھی آپ نے سنا کہ ایک چیونٹی اپنے ہم قوموں سے کہتی ہے "اپنے اپنے گھروں میں چھپ جاؤ - ایسا نہ ہو کہ لشکر کا انبوہ تم کو کچل ڈالے"

بادشاہ نے یہ سن کر ہوا کو حکم دیا کہ قالین نیچے اتارے - حکم کی تعمیل ہوئی وادی النمل کی سب چیونٹیاں طلب کی گئیں اور ان سے سوال کیا گیا کہ تم میں سے کس نے مکانوں میں پوشیدہ ہو جانے کی ہدایت کی - ایک سیاہ رنگ کی چیونٹی جو اس وادی کی ملکہ تھی اور اس کا نام کشا تھا حاضر ہوئی اور عرض پرداز ہوئی کہ میں نے یہ ہدایت کی تھی کیونکہ مجھ کو اندیشہ تھا کہ شاید میرا کوئی محکوم لشکر کے تماشے میں مصروف ہو کر ایک ساعت کے لیے خالق ارض و سما کی حمد و ثنا سے غافل ہو جائے اور اس کی مختصر زندگی کی وہ ساعت بیکار ضایع ہو -

بادشاہ نے متحیر ہو کر اس چیونٹی کو اٹھا لیا - اپنے دست مبارک پر جگہ دی اور دریافت کیا کہ اس نے دنیا میں کوئی شخص سلیمان سے بزرگ تر بھی دیکھا ہے یا نہیں - چیونٹی نے جواب دیا کہ میرا مرتبہ آپ سے اعلیٰ ہے - اگر میں خداوند کی سرکار میں صاحب عظمت نہ ہوتی تو خدا آپ کو میرے پاس نہ بھیجتا اور آپ مجھ کو اپنے ہاتھ پر جگہ نہ دیتے بادشاہ نے یہ سن کر چیونٹی کو پھینک دیا اور ہوا کو حکم دیا کہ قالین کو روانہ کرے - چیونٹی نے آواز دی کہ "جائیے جائیے مگر خدا کا نام کسی وقت فراموش نہ کیجیے گا - آپ مالک الملک سے سرتابی نہ کریں تو کوئی آپ سے سرتابی نہ کریگا"

محل میں داخل ہونا چاہے تو اس دروازے کی داہنی طرف زمین کھودے۔ ایک صندوق شیشہ کا ملیگا
اور اسی میں قصر کی کنجیاں محفوظ ہیں۔"
ہدایت کے مطابق کنجیاں نکالی گئیں۔ آہنی دروازہ کھول کر عمارت میں قدم رکھا تو ایک دروازہ خالص سونے
کا بنا ہوا ملا۔ وہ کھولا گیا۔ اسکے بعد دو ڈیوڑھیاں اور تھیں۔ اُن سے گزر کر عمارت میں پہنچے۔ متعدد کمرے
جواہرات سے آراستہ و پیراستہ ملے۔ بیش قیمت موتیوں کا گنجینہ اور گراں بہا اجناس کا ذخیرہ نظر آیا۔ دالان
میں فرش زمین پر ایک تصویر سانپ کی بنی تھی۔ اس کو دبایا تو ایک تہ خانے کا پتہ چلا جس میں بیشمار سونا
اور چاندی تھی۔ تہ خانے کے دروازے پر لکھا تھا "اس محل کا مالک بڑا معزز و محترم تھا۔ جنگل کے درندے بھی اسکے
خوف سے کانپتے تھے۔ وہ اپنے عروج و اقبال کے وقت اس محل میں فروکش تھا۔ تخت عدالت پر بیٹھا
اور جہانبانی کی داد دیتا تھا۔ جب موت کا وقت آیا تو کوئی طاقت اس کو پنجۂ اجل سے چھڑا نہ سکی اور تاج
اسکے سر سے گر گیا۔" اسکے بعد محل خاص میں داخل ہو۔ تمام باتیں نظر آئیں گے۔
اب بادشاہ نے محل خاص میں قدم رکھا۔ دروازے پر منقوش تھا "اس محل کے آباد کرنے والے جہاں
مدتوں عیش و عشرت سے رہے۔ اب اُنکے خزانے موجود ہیں مگر قبروں میں انکی ہڈیوں کا بھی نشان باقی نہ رہا۔"
اس محل کا ایک کمرہ دیکھا جو نایاب جواہرات سے بھرا تھا۔ دیوار پر عبارت ذیل کندہ تھی۔
"میں اس محل کا کبھی مالک تھا۔ اس میں رہتا، چین کرتا تھا۔ میں دولتمند تھا۔ شوکت و
قوت، عدل اور عقل میں ... خوش ذائقہ غذائیں کھاتا اور لطیف پانی پیتا تھا۔ لباس فاخرہ زیب تن کرتا
اور ہر ممکن عیش سے بہرہ مند ہوتا تھا۔ مجھ سے دنیا ڈرتی تھی مگر اب وہ ساعت آگئی کہ میں ڈرتا ہوں۔"
دوسرے کمرے کے تین دروازے تھے۔ ایک پر لکھا تھا "اے آدم کے بیٹے تجھکو فارغ البالی دھوکے میں
نہ پھنسائے۔ تو بھی ایک دن گلاب کے پھول کی طرح مرجھا جائیگا اور عیش و آرام سے منہ موڑ کر ملک عدم
کا مسافر ہوگا۔" دوسرے دروازے پر لکھا تھا "جلدی نہ کر۔ دنیا میں تیرا حصہ بہت تھوڑا ہے۔ اس سے
آہستہ آہستہ منتفع ہو۔ ہوشیار! خبردار! دنیا ایک سے دوسرے کے پاس جاتی ہے۔ یہی پہلے ہوا ہے اور یہی
ہمیشہ ہوتا رہیگا۔" تیسرے دروازے پر منقوش تھا "تجھکو سفر درپیش ہے اسکے لیے توشہ جمع کر۔ تو ہمیشہ زمین پر
نہ رہیگا۔ یاد رکھ کہ موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے۔"
ان دروازوں سے گزر کر بادشاہ ایک وسیع اور مرصع شہ نشین میں پہنچے۔ وہاں ایک خوبصورت
بت بشکل انسان وسط میں تھا اور اُسکے اردگرد بہت سے چھوٹے چھوٹے بت تھے۔ جب بادشاہ ان بتوں
کے قریب پہنچے تو بڑے بت نے جنبش شروع کی اور اُس سے آواز نکلی "دوڑو، مددگار شیطانو جلد آؤ۔ بادشاہ قوم کو

نباہ کرنے آیا ہے۔ اسکے بعد اُس بُت کے نتھنوں سے دھواں اور شعلے نکلنے لگے۔ محل میں زلزلہ کی سی کیفیت محسوس ہوئی۔ رعد کی گرج کی سی آواز ہوئی اور سب ایک ساتھ غل مچانے لگے۔

بادشاہ نے آواز بلند کہا "کیا تم مجھ کو نہیں جانتے ہو کیا تم نہیں جانتے کہ میں بنی اسرائیل کا بادشاہ سلیمان ہوں اور خدا نے مجھ کو تمام مخلوقات پر حکومت و سرداری مجھے عطا کی ہے اگر تم بغاوت کرو گے تو میں تم کو سزا دوں گا۔"

یہ کہکر بادشاہ نے اسم اعظم کا ورد کیا۔ سب بُت خاموش ہو گئے اور منہ کے بل زمین پر گر پڑے اور شیاطین کی روحیں جو اُن پتھروں میں مقید تھیں بھاگ کر سمندر کی لہروں میں جا چھپیں تاکہ بادشاہ بنی اسرائیل کے تصرف سے محفوظ رہیں۔

بعد ازاں بادشاہ مع ہمراہیوں کے بُت کے پاس آئے اور اسکے منہ میں ہاتھ ڈال کر ایک چاندی کی تختی نکالی جس کی بابت گمان کیا گیا کہ وہ اس طلسم کی لوح ہے اور عبارت کا مکمل حال اس میں درج ہوگا بادشاہ اُن حروف کو پڑھ نہ سکے تو ایک ایک کو بلایا گیا جو یونانی زبان جانتا ہو اور اُس نے عرض کی کہ یہ تحریر یونانی زبان میں ہے اور اس میں لکھا ہے۔

"میں شداد بن عاد دس ہزار صوبوں کا بادشاہ تھا۔ دس ہزار گھوڑے میری سواری میں تھے دس ہزار والیانِ ریاست میرے محکوم تھے دس ہزار جوان جرار کو میں نے بہادری سے تہ تیغ کیا مگر جب موت کا فرشتہ لینے آیا تو میں بے بس ہو گیا۔

جو شخص اس تحریر کو دیکھے اس کو لازم ہے کہ دنیا کے عیش و آرام پر نازاں نہ ہو اور یہاں کے ترددات سے متفکر و پریشان رہے انجام سب کا موت ہے اور کسی شخص کی یادگار سوائے نام نیک کے کچھ نہیں ہے۔"

(۶)

خاتم سلیمان

بنی اسرائیل کے شہنشاہ اعظم کو مالک دو جہاں نے ایک عجیب و غریب انگوٹھی عنایت کی تھی جسکے نگینے پر اسم اعظم کندہ تھا اور اسکی برکت سے تمام جن و انسان بادشاہ کے مسخر تھے۔

ایک دن موقع پاکر بھوتوں کے راجہ اشمیدئی نے جو اس انگشتری کی قوت سے بادشاہ کا محکوم تھا وہ انگوٹھی دریا میں پھینک دی۔ حضرت سلیمان کا جاہ و جلال رخصت ہوا۔ ارکانِ سلطنت میں تزلزل عظیم واقع ہو گیا۔ اشمیدئی بادشاہ کی صورت بن کر تخت حکومت پر قابض ہوا اور حضرت سلیمان کو مجنون و دیوانہ کا

خلاف نے کر کے سر سے نکلوا دیا۔ وہ شہر میں ہر ایک امیر و امیر کے پاس جاتے لیکن کوئی اُن کو شناخت نہ کر سکتا تھا۔ بعض وفاداروں کو خفیف شباہت معلوم ہوتی تھی وہ تحقیق کرتے تو دونوں بے تہمت پایا جاتا۔ "اشمیدئی" قصر شاہی میں موجود تھا اور ہر شخص اسی کو سلیمان سمجھتا تھا۔

شہنشاہ گلی کوچوں میں کہتے پھرتے تھے کہ میں بنی اسرائیل کا بادشاہ سلیمان ہوں لیکن خلقت انکو دیوانہ تصور کرتی تھی اور کسی کو اُنکے قول سے ذرہ برابر صداقت محسوس نہ ہوتی تھی۔

صحیفہ "واعظ" کے باب اول آیت ۱۲ لغایت ۱۸ میں ہے کہ "میں یروشلم میں بنی اسرائیل کا بادشاہ تھا اور میں نے دل لگایا کہ جو کچھ آسمان کے نیچے کیا جاتا ہے اُس سب کی تحقیق و تفتیش کروں کیونکہ خدا نے بنی آدم کو یہ سخت دُکھ دیا ہے کہ وہ مشقت میں مبتلا رہیں۔ میں نے بڑی ترقی کی بلکہ اُن سبھوں سے جو مجھ سے پہلے یروشلم میں تھے زیادہ حکمت حاصل کی لیکن معلوم ہوا کہ حکمت میں بہت غم ہے اور علم میں ترقی دُکھ کی فراوانی ہے"

یہ دردمندانہ اقوال عہد نامہ قدیم میں محفوظ ہیں لیکن اُس وقت تقدیر کا ستارہ گردش میں تھا، ابتلا اور مصیبت کا دَور تھا۔ ان فلسفیانہ مواعظ کو کون سنتا ہر طرف سے یہی جواب ملتا تھا کہ یہ شخص مجنون ہے اور اس کو سلیمان بننے کا خبط واشتہار ہے

شدائد مالایطاق سے فرار مرسلین کی سنت ہے مجبور ہو کر دارالحکومت سے ہجرت کی۔ شہر چھوڑ کر جنگلوں کی خاک چھانی۔ وہاں بھی سکون میسر نہ ہوا۔ اور کسی جگہ آرام نہ ملا۔ جنگلوں بیابانوں کی خاک چھانتے تین برس گزر گئے۔ کبھی روٹی میسر آئی اور کبھی نہ آئی تن پر کپڑا کبھی تھا اور کبھی نہیں آخر کار رہ نوردی کرتے اور بھیک مانگتے ہوئے اپنے موروثی دشمن بنی عمون کے دارالسلطنت "عظیم" میں پہونچے۔

بھوکے پیاسے نیم برہنہ شہر کے چوک میں کھڑے تھے کہ راجہ کا باورچی اجناس خوردنی کا بار گراں لیے ہوئے اُدھر سے گزرا۔ اس جوان کو شارع عام پر سراسیمہ اور بدحواس دیکھ کر اشارے سے اپنے پاس بلایا اور حکم دیا کہ اُس کا سامان شاہی محل تک پہونچا دے غریب الوطن اس خدمت کو قوت لایموت کا وسیلہ سمجھ کر راضی ہوا اور اُس بار گراں کی حمالی کی۔ مطبخ میں پہونچکر باورچی نے مزدوری روٹی کھلائی اور اُس کی درخواست پر خدمتگزاری کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔

چند روز یوں ہی گزرے۔ دن رات کی خدمت و بندگی تھی مگر شکم سیر رہتا تھا اس لیے یہی منظور کیا۔ رفتہ رفتہ باورچی کو معلوم ہوا کہ اس مزدور کو کھانا پکانے میں کچھ دخل ہے اور بعض اقسام کے شاہی کھانے خوب پکا سکتا ہے۔ اُس نے ایک دن چند قابیں لطیف اغذیہ کی پردیسی کی تیار کی ہوئی راجہ کے دسترخوان

پہ پیش کیں۔ حاکم کو پسند آئیں اور یہ مزدور منظورِ نظرِ سلطانی ہو کر مطبخ کا داروغہ مقرر ہو گیا۔
بختِ برگشتہ کو اتنی جمعیت و فراغت بھی ناگوار ہوئی۔ راجہ کی لڑکی قمارہ کی آنکھ اتفاقاً اس مصیبت زدہ پر پڑی اور سودا سے محبت میں گرفتار ہو کر ننگ و ناموس کو خیرباد کہنے پر تیار ہو گئی۔ عشق چھپنے کی چیز نہیں۔ پہلے ماں کو خبر ہوئی۔ اُس نے بیٹی کو سمجھایا بجھایا، شیب و فراز سے آگاہ کیا۔ ہم چشموں میں بے آبروئی سے ڈرایا مگر محبت کی دیوانی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ راجہ تک خبر پہنچی۔ اُسکو بہت طیش آیا اور عاشق و معشوق کے قتل پر مستعد ہو گیا۔ مصیبت کے دن ابھی پورے ہوئے تھے آخری وقت میں رائے تبدیل ہو گئی۔ اور کشمکشِ حیات سے نجات دینے کے بدلے اُس نے ان دونوں گرفتارانِ بلا کو ریگستان میں چھوڑ دیا۔ تاکہ دونوں مصائب و آلام سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دنیا سے رخصت ہوں۔

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے　　ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

[illegible] رشتۂ اقبال ان مظلوموں سے ہزار دفعہ دھاگا تو بے اب گیا، ریگستان میں بھی حیات کا رشتہ نہ ٹوٹا اور دونوں بے نان و آب پڑتے جنگلوں اور بیابانوں کو عبور کرتے ایک بستی تک پہنچے جو سمندر کے کنارے واقع تھی

قمارہ کے بدن پر کچھ زیورات باقی رہ گئے تھے انکو بیچ کر ایام گزاری کرنے لگے۔ ایک دن بازار سے مچھلی خریدی اور قمارہ کو صاف کرنے کے لیے دی۔ اُس مچھلی کے شکم سے وہی گم شدہ انگشتری برآمد ہوئی قمارہ نے باہر کر دکھائی مظلوم بادشاہ نے فوراً شناخت کر کے اپنی انگلی میں پہنی اور تاجِ زر و جلال کا شکر ادا کیا

انگوٹھی پہنتے ہی صورت بدل گئی چہرے پر جاہ و جلال برسنے لگا۔ جنات حاضر ہوئے اور شہنشاہ مع قمارہ کے یروشلم پہنچایا۔ اُن کی صورت دیکھتے ہی اشمیدئی بھاگا اور تاجِ سلطنت دوبارہ حضرت سلیمان کے سر پر رکھا گیا۔

چند روز کے بعد شہنشاہ نے عمون کے راجہ اور رانی کو یروشلم میں طلب کیا۔ وہ اپنے داروغۂ مطبخ کو پہچان نہ سکے۔ اُن سے جواب طلب کیا گیا کہ داروغہ اور شہزادی قمارہ کا خون کیوں کیا گیا۔ راجہ خوف زدہ ہو کر عاجزی سے عرض کرنے لگا کہ وہ دونوں قتل نہیں کیے گئے بلکہ ایک سنگین جرم کی پاداش میں ریگستان میں قید کو بھیجے گئے تھے۔ معلوم نہیں کہ جیتے ہیں یا مر گئے۔

شہنشاہ نے پوچھا کہ تم اُن دونوں کو شناخت کر سکتے ہو؟ عرض کی بیشک۔ اس جواب پر منشی کو حکم دیا کہ بیگم دربار میں حاضر کی جائے۔ وہ لباسِ فاخرہ زیب تن کیے ہوئے والدین کے سامنے آئی تو راجہ حیران

ہوگیا۔ ارشاد ہوا کہ "دیکھو اور پہچانو۔ میں سلیمان بنی اسرائیل کا بادشاہ ہوں۔ مقدر کی گردش سے ملک بن تمہارا باورچی تھا اور یہ وفادار خادم تمہاری بیٹی "نعامہ" ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ تم اس کی داستان عشق اپنے خاندان کیلیے موجب ننگ و رسوائی سمجھتے تھے مگر آج سے اپنی قسمت پر ناز کروگے کہ تمہاری لڑکی شہنشاہ بنی اسرائیل کے محل میں داخل ہوئی۔ یہی دنیا کا کارخانہ ہے"

(۳)

روحۃ الکبریٰ

حضرت سلیمانؑ نے صحیفۂ "واعظ" اور "امثال" میں عورتوں کی بہت مذمت کی ہے۔ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں "میں نے موت سے تلخ تر اُس عورت کو پایا جسکا دل پھندا اور جال ہے اور جس کے ہاتھ ہتھکڑیاں ہیں جس سے خدا خوش ہے وہ اُس سے بچ جائیگا۔ لیکن گنہگار اُسکا شکار ہوگا میں نے ہزار میں ایک مرد پایا لیکن اُن سبھوں میں عورت ایک بھی نہ ملی؟"

دوسری جگہ لکھتے ہیں "تیرا دل اُس کی راہوں کی طرف مائل نہ ہو۔ تو اُسکے راستوں میں گمراہ نہ ہونا۔ کیونکہ اُس نے بہتوں کو زخمی کرکے گرادیا ہے بلکہ اُسکے مقتول بے شمار ہیں۔ اُس کا گھر پاتال کا راستہ ہے اور موت کی کوٹھریوں کو جاتا ہے۔"

لیکن وہ خود جنس لطیف سے بہت مانوس تھے محل میں ایک ہزار بیبیاں اور حرمیں تھیں۔ مگر آپ کو سب سے زیادہ الفت "سمیا" سے تھی جو فرعون مصر کی صاحبزادی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ شہزادی نازو انداز حسن و جمال میں بے مثال تھی۔ اپنے وطن سے ایک ہزار آلات موسیقی ہمراہ لائی تھی۔ اور اُس کو ہزاروں دلکش گیت یاد تھے۔

حضرت سلیمانؑ کا سب سے بڑا کارنمایاں مقدس عبادت گاہ کی تعمیر تھا۔ جس دن اس اہم بالشان خدمت سے فراغت ہوئی اسی روز شہزادی "سمیا" سے عقد ہوا ہیکل سلیمانی کی تکمیل سے تمام قوم خوش تھی اور سارے شہر یروشلم میں چراغاں تھا۔ لیکن قصر شاہی میں اُس رات دو عیدیں جمع تھیں۔ فرعون کی بیٹی سے شادی کی خوشی تکمیل عبادت گاہ سے بھی زیادہ تھی۔ تمام اراکین ریاست شہنشاہ اعظم کی مدح و ثنا سے رطب اللسان تھے اور بیت عروس عالم کی خوابگاہ کے لیے ایک عجیب شامیانہ بنوایا تھا جس میں بیش بہا موتی ایسی صناعی سے جڑے تھے کہ شب تاریک میں ستاروں کی طرح جھلملاتے تھے۔

دانشمند حاکم انسان ہی تھے۔ عیش و راحت کے طلسم میں ایک ساعت کے لیے یاد خدا سے غفلت ہوگئی۔ حسب معمول نصف شب کے بعد بیدار ہوئے اور معبود حقیقی کے سامنے سر نیاز جھکانے کا

مرزا غالب کا کچھ غیر مطبوعہ کلام
اور اس کی شانِ نزول

(از جناب پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے)

میرے کتب خانے میں ایک قلمی بیاض ہے جس میں سوا اور چیزوں کے مرزا غالب دہلوی کے کوئی پچاس خط اور چند نظمیں ہیں۔ یہ خط اور نظمیں زیادہ تر غیر مطبوعہ ہیں اور وہی اس مضمون کا ماخذ ہیں۔ — ادیب

جس زمانے میں مرزا غالب دہلوی کلکتہ میں مقیم تھے تو قدرتاً وہاں کے سخن سنج اور سخن فہم حضرات سے رسم و راہ ہو گئی تھی۔ مرزا کے ان کلکتوی دوستوں میں مرزا ابوالقاسم خاں قاسم اور مرزا احمد بیگ خاں طپاں[1] بھی تھے۔ غالب ان دونوں کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ذیل میں مرزا غالب کے خطوں کے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں جن سے ان تینوں صاحبوں کے باہمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

اقتباسات متعلق مرزا ابوالقاسم خاں | (۱) کلکتہ کے قیام کے زمانے میں لکھتے ہیں۔

"قبلۂ من اگرچہ اثبات ماے قدوم بزرگان چنانکہ ایں است آں ہمہ کہ خورشید بخرابی تابد و بہشت نزاید ابر بر خس و خاری بارد و نگاہ خود بی شمارد بہ نیاز چاکری امید آنکہ در ماتم روز یک دو ساعت از روز باقی ماندہ بہ پشتکدۂ راقم نزول اجلال فرمایند و مرزا صاحب[2] را با خود آرند۔"

(۲) کلکتہ سے دہلی جاتے ہوئے مرشد آباد سے لکھتے ہیں:۔

"انداز غمخواری کہ از لطف زبان جناب در حق خویش دیدہ ام نہ چنانست کہ اندکے از بسیار آں شرح توانم داد بخدا بہ چاکری اخلاص شما داغ فراق دہلی بدلم سر بود۔ شکرست و صد ہزار شکر کہ غربت یک گونہ از ارباب وطن یافتم تا حیات کہ دیگر امید وصال نسبت جناب مرزا صاحب[3] وعدہ داد کہ بدہلی

---

[1] مرزا احمد بیگ خاں طپاں اور ان کے استاد مرزا جان طپش اپنے تخلص جرأت سے لکھتے تھے۔

[2] مرزا صاحب سے یہاں مرزا احمد بیگ خاں مراد ہیں۔

[3] ایضاً

اقتباسات متعلق مرزا احمد بیگ خان طپاں

(۱) "آنکہ من فرزان شما به جان دوستم ... دانست هر چه گوئید بسر
منت ایم و بغرق بهایم اما از قبیله ولی مرزا مردم دهلی آگه نیستید چند ذکر جید در اهداک ملازمت حکیم مرحوم از من
می محمد بلا از شما بدگمان می شوند۔"

(۲) "بعد از رسیدن نامهٔ مرزا احمد بیگ خان به کام اندرم مهربانی ... چه شد و دوستی نگارنت ...
صریح دانستم که مرزا صاحب با من ربط ملاقات بیک طریقه فرستادن نامه ... یافتم با من مسدود کرده من نیز
خود را از تحریر یک ... بکناره کشیده ام۔"

(۳) "داغ گرمی این اتفاق ام که احباب کلکته مثل نواب علی اکبر خان و مولوی ولایت حسین در پلے
وقت ... جواب مرزا احمد بیگ خان از دو ماه ... بنام من نوشته اند۔ حالیا حکیم ... نظر از آمات
خبر از که جوییم و بگو ... یابم که حال آن ناحیه چیست۔"

(یہ خط غالباً مولوی سراج الدین احمد کو لکھا گیا)

(۴) "آنچه از جانب قبله و کعبه مرزا احمد بیگ صاحب مرقوم بود آویزهٔ گوش هوش گردید ... من
بے تصنع و بے تکلف مرزا احمد بیگ خان را مثل نصرالله بیگ خان[۲] از آبای خود می شمارم و هرگز پیش میرزا
درمیانهٔ خود و عم عالی فرق نمی کنم . . . حال من سراسر کدورت مرزا صاحب گردیده عرض
می توان کرد که والله شما را عم حقیقی و بزرگ معنوی خویشتن می دانم۔"

(۵) "انصاف بالائے طاعت مرزا احمد بیگ خان عالم مهر و جهان وفا بند ... سه ماه از حال من چشم
پوشیده بودند و از تحریر دست باز کشیده۔ هفته ای گزرد که دو تا نامه از آنجناب رسید۔ عذر کوته قلمیها خواسته
بودند و حالا به تحریر در آورده۔ این سو نیز پاسخ نامه روان شده۔"

(کوئی صاحب کانپور کے رہنے والے ہیں ان کا خط غالب کو ۷ شوال مطابق ۱۱ اپریل روز یکشنبہ کو وصول
ہوا۔ اُس کے جواب میں سے یہ اقتباس لیا گیا ہے)

(۶) "والا نامه رسید و خبر فراق دائمی مرزا احمد رسانید۔ سبحان الله چه پایه سنگین دل سخت جانم
که نامه در تعزیت مرزا احمد انشا می کنم و اجزائے وجودم از هم نمی ریزد۔ می گفت که به دهلی می آیم وعده
فراموش، بے مروت، راه گردانید تا به سر منزل دیگر راند . . . وائے بے یاری یاران خلد،
دریغا بے یاری پسران خود . . . والله که غم زده ی بازماندگان احمد بیگ خان یعنی فرزند فرزین[۳]

---

[۱] صاحب پنشن کے مقدمے میں مرزا غالب کے مقابل تھے۔
[۲] مرزا غالب کے چچا کا نام ہے جو انگریزی فوج میں رسالدار تھے۔
[۳] مرزا احمد بیگ خان کے بڑے بیٹے۔

ایک مرد کا یادگار رہا تھا۔ قلیاں اور قتیل کے تخلصوں کی مناسبت سے ظاہر ہے کہ قتیل کے شاگرد قلیاں ہی ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض تذکروں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا احمد بیگ خاں قلیاں مرزا محمد حسن قتیل کے شاگرد تھے۔ تذکرۂ نسیم سخن میں یہ بھی لکھا ہے کہ قلیاں دہلی کے رہنے والے اور کلکتہ میں عدالت صدر دیوانی میں مختار رہے۔ معلوم نہیں کہ مرزا ابو القاسم خاں کو "درد کا یادگار" کہنے سے غالب کی کیا مراد تھی۔ قاسم خواجہ میر درد کی اولاد میں تھے یا اُن کی شاعری کا سلسلہ درد تک پہونچتا تھا۔

خط کا عنوان ظاہر کرتا ہے کہ قاسم اور قلیاں میں ایک صاحب شیعہ اور ایک سُنّی تھے۔ ذیل کے تین اقتباسات مرزا ابو القاسم خاں سے تعلق رکھتے ہیں اُن سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قاسم شیعہ تھے اور اگر یہ قیاس صحیح ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قلیاں سُنّی تھے۔ غالب مرزا ابو القاسم خاں کو لکھتے ہیں:-

(۱) "جناب را بسید الشہدا علیہ السلام سوگند کہ آزا لبس نہ نمایند۔"

(۲) "شاد و خرم بزی کہ در دو جہاں دستگیر تو سید الشہداست"

(۳) "دیروز تبرکے کہ فرستادہ بودند رسید و در دو عالم سرفراز گردانید۔ صاحبِ نذر؟ زمانِ ظہور خویشتن سلامت دارد و بہ اعلیٰ مراتب صورت و معنی رساند؟"

آخری اقتباس میں قرینہ کہتا ہے کہ "صاحبِ نذر" سے امام مہدیؑ آخر الزماں مراد ہیں۔

انھیں مرزا ابو القاسم خاں کو ایک مرتبہ مرزا غالب نے مسہل لینے کا مشورہ دیا جس سے اُنھیں فائدہ پہونچا۔ چنانچہ اسکے شکریہ میں اُنھوں نے ذیل کا قطعہ لکھکر غالب کو بھیجا:-

"قطعۂ ابو القاسم خاں باسد اللہ خاں غالب"

اے مسیح زماں تو می دانی	بجا بہت او ادستے کہ مر است
بو علی کے رسد بہ تشخیصت	کہ فلاطوں مثال تو داناست
می سزد گر بگویمت بوعلی	در فلاطوں بجوانمت زیباست
مسہل (کذا) دادی و بفرمودی	بیل آر بگیاں کہ شفاست
زاں عمل دور شد مرض بالکل	گر بگویم تو ئی مسیح بجاست

اس قطعے کے جواب میں مرزا غالب نے ایک قطعہ اسی زمین میں فی البدیہہ لکھکر ابو القاسم خاں کو بھیجا۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قاسم نے جس شخص کی معرفت اپنا قطعہ غالب کو بھیجا تھا اُسی کے ہاتھ دال اور اچار بھی بھیجا تھا۔ چنانچہ غالب نے اس تحفے کی شاعرانہ انداز میں تعریف کی ہے اور تحفہ بھیجنے والے کو دعائیں دی ہیں۔ غالب کا وہ قطعہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:-

ـ قطعہ بھیجنے کے بعد غالب کو خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں کوئی غلطی ہو گئی ہو اور وہ مخالفین کے ہاتھ میں پڑ جائے۔ چنانچہ انھوں نے اسی دن اسی زمین میں ایک اور قطعہ کہہ کر ایک خط کے ساتھ بھیجا۔ اس خط میں قاسم کو قسم دے کر لکھا کہ جو قطعہ میں پہلے بھیج چکا ہوں وہ میں نے آپ کے تادی کے سامنے ندامت عجلت اور پریشانی میں بغیر فکر کی اعانت کے محض قلم کی مدد سے کہہ ڈالا تھا۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ آپ کے قطعہ کا جواب قرار پائے۔ وہ تو گویا نقطہ دال اور اچانک رسید تھی۔ اب جو قطعہ بھیج رہا ہوں یہ البتہ آپ کے قطعے کا جواب ہے۔ اس کو جو چاہے دیکھ لے کچھ خوف نہیں ہے۔ غالب کا یہ خط اور قطعہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"رقعۂ اسد بقاسم"

"قبلۂ جان و دل سلامت۔ بامداداں کہ قطعہ در جواب والانامہ انشا کردہ ام آں را مستور رلواہ است کہ در چہ سراسیمگی بچہ زودی رقم زدہ ام حاشا کہ جواب قطعۂ جناب را نمی ارزید۔ گویا غرض از تحریر آں قطعہ رسید دال و آچار بود و دیگر ہیچ۔ امید کہ آں را آب بشوئید یا بہ آتش بسوزید چہ آں را بے اعانت فکر و بیاری خامہ نگاشتہ ام۔ مبادا ستمے وانستہ باشد و بدست معاندین افتد۔ ۔ ب انبیا شہ علیہ السلام سوگند کہ آں اکسیر تانیا و از ہم گزرانند۔ قطعہ کہ دریں ورق مرقوم است جواب قطعۂ مرقومۂ آں مخدوم است ہر کہ خواہد نگرد کلا باک نیست۔ شب رفتہ ن برنخلہ و روغن بیا۔ فیروزک آب آشامیدہ بودم امامے آں را نپزیرفت ورنج تپش نشد۔ امروز بطور خود ترکیبے کہ بنیل سہل شانہ موید باشد عمل آوردہ ام۔ بجد اکہ اگر ایں گریوہ را دررہ نداشتے قطعہ را خود تابع رہے دست اخلاص ساختہ بجانزمت رسیدے اگر مرگ اماں داد دریں دو سہ روز بسعادت پابوس رسیدہ خواہد شد۔"

---

۵ خواجہ حالی یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں:۔

"کلکتہ کے قیام کے زمانے میں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور اپنے اعتراضوں پر قتیل کا قول سند میں پیش کیا تھا۔ مگر مرزا ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں خسرو کے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے .... انھوں نے قتیل کا نام سن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں دوالی سنگھ فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا۔ اور اہل زبان کے سوا کسی کے قول کو قابل استناد نہیں سمجھتا۔ اور اپنے کلام کی سند میں اہل زبان کے اقوال پیش کیے۔ اس پر معترضین نے زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑنے لگی۔" اس خط میں مخاطب یہی معترضین مراد ہیں۔

"قطعۂ دوم در جواب قطعۂ قاسم"

قدر دانا لطیفه‌ای دارم — بنویسی اگر ز بنده رواست
کلک اندیشه‌ام ازین تحریر — آب و رنگ نشاط طبع تو خواست
بنده را از کرم ستوده‌ستی — مشت خاشاک را چه قدر و بهاست
بوعلی و مسیح و افلاطون — هرچه گفتی بگو که از تو سزاست
بی ادب باشم ار کنم تکذیب — بی خرد باشم ار شمارم راست
نسبت من به بوعلی سینا — صاف همچون سراب با دریاست
بو که در چارسوی کلکته — که چنین قحط مکرمت‌هاست
بوعلی گفتنم روا باشد — خرس در کوه بوعلی سیناست
سپس از شوخی زبانه — گویم احوال قطعه‌ای که تراست
لفظش آیینه دار حسن ادا — معنیش پود و تار فکر رساست
نقطهٔ حرف حرف اشعارش — مردم چشم مردم بیناست
ای روانم فدای هر گفتت — مرحبا این چه طبع معنی زاست
تو کلیمی و اوج طور سخن — پنجه بر ساعدت ید بیضاست
در صف دشمنان ز بهر نهیب — نامه را در کف تو حکم عصاست
از من اصلاح آرزو کردن — سر به سر عجز تو از حیاست
چون تو خود داده‌ای قسم به خدا — بخدا هرچه هست نیک و بجاست
لیکن این بیت زان همه ابیات — خللی دارم ار بگویم راست
"سهل دادی ز بیخودی — دل آر بجان که شماست"
آخر لفظ سهل از سر سهو — کسره بنوشته‌ای که موقع یاست
یای توحید بگذار این جا — کسره خود به مضاف الیه خطاست
فن انشا زیان کرد ازین — ایک عیب طریقهٔ املاست
به دعا ختم می‌کنم نامه — زانکه سرمایهٔ فقیر دعاست
وقف تو باد از خزانهٔ غیب — هرچه در دین و هرچه در دنیاست
شاد و خرم بزی که در دو جهان — دستگیر تو سید الشهداست

اہلِ نظر دونوں قطعوں کا مقابلہ کریں اور دیکھیں کہ اگر یہ قطعہ غالب کے کمالِ فن کی سند ہے تو پہلا قطعہ اُن کی ماعذر دامنی اور بدیہہ گوئی کی دستاویز۔

فغانِ آرزو

(از جناب منشی سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

جانے والے منزلِ مقصد نشاں دکھلائیے
ہم سے بے حس نقشِ پائے رفتگاں دکھلائیے

وہ تو اے صیاد اپنا دل ہے ایسا شوق ہے
تا چمن دکھلا دیا ہم آشیاں دکھلائیے

تھا مگر سوزِ نفس ہی ضامنِ شانِ حیات
اور تو کیا دیکھ سکتے کچھ دھواں دکھلائیے

جنبشِ لب اُن کی کیا کیا کچھ ستم ڈھاتی رہی
ہم زباں ہوتے ہیں کر کے بے زباں دکھلائیے

شانِ جاں بازی کا اس مقتول کی کیا پوچھنا
جس کے تو رہ آپ وقتِ امتحاں دکھلائیے

عہدِ پیری تک رہی ہنگامہ زا یادِ شباب
آنکھ کھل جانے پہ بھی خوابِ گراں دکھلائیے

یاد ہی تھی ہمیں دامن کی شانِ بیکسی
دور تک مڑ مڑ کے اہلِ کارواں دکھلائیے

در قفس کا وا، نشیمن سامنے، لیکن فضول
اے شل پا نہ وحسرت ناتواں دکھلائیے

سوئے کعبہ جا پڑی دل سے نہ نکل کر چشمِ شوق
وہ یہیں تھے جلوہ فرما ہم جہاں دکھلائیے

زندگی کم ہو کے بڑھنا عشق کا اعجاز ہے
موت آنا تھی نہ آئی نیم جاں دکھلائیے

دمبدم پردے کی جنبش دل میں دوڑاتی تھی لہر
ترسی آنکھوں سے تماشا کم نہاں دکھلائیے

ہر بُنِ مو سوزِ فرقت سے زبانِ سوز تھا
ایک شعلہ کارواں در کارواں دکھلائیے

اُن خماری انکھڑیوں کی ہائے رے سرمستیاں
دیر تک لے لے کے ہم انگڑائیاں دکھلائیے

جو سماں پیشِ نظر تھا دل سے مٹتا کس طرح
بند آنکھوں سے بھی جلتا آشیاں دکھلائیے

قتل کا بیڑا نہ کس کس نے اٹھایا آرزو
زندگی جب تک تھی ہر رنگ جہاں دکھلائیے

جسکے لیے کوئی عربی لفظ نہ مل سکا۔ اس لیے میں پھر یہی عرض کروں گا کہ سب سے پہلے ترجمہ کے اصول مقرر کر لیے جائیں۔ اور ان پر سختی سے عمل کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ورنہ کوئی معقول نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

"سبقلامی" کے متعلق یہ عرض ہے کہ واقعی یہ نیا لفظ ہے اور بغیر تشریح کے اس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ چونکہ یہ ایک طویل بحث ہے، اس لیے مولوی وحید الدین صاحب سلیم مرحوم نے وضع اصطلاحات کے متعلق جو کتاب تحریر فرمائی ہے اسکو دیکھے بغیر اس کا حل مشکل ہے۔ یہ نظریہ انگریزی اور سنسکرت کے (سابقہ Prefix) اور (لاحقہ Suffix) کے خیال پر مبنی ہے مرزا صاحب نے سمجھا ہے کہ اس میں امتزاج نہیں ہے، لیکن کتاب دیکھنے پر معلوم ہو جائیگا کہ جو مرکب الفاظ بنیں ہیں لگبہ ان میں امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً آدھرم۔ کپوت۔ سپوت۔ سبقلامی وغیرہ۔

اب مرزا صاحب کے مکالمہ کے متعلق یہ عرض ہے کہ موصوف نے باوجود جدید الفاظ کے ترجمہ سے خاص دلچسپی ہونے کے میری تجاویز پر صرف سطحی نظر ڈالی ہے میں نے اُم خانیہ کو ہرگز غلط نہیں کہا، نہ اسکی جگہ "سخت والدہ" کو صحیح بتایا۔ بلکہ میرا مفہوم صاف ہے کہ ام خانیہ" یا سخت والدہ سے کوئی Dura Mater کے معنی نہیں سمجھ سکتا۔ اور مرزا صاحب نے اُم الامراض۔ اُم الفساد اور اُم الخبائث کے متعلق بھی یہ غور نہیں فرمایا کہ یہ مضاف۔ مضاف الیہ کی ترکیب ہے۔ بخلاف اس کے ام جافیہ مرکب توصیفی ہے۔ اور یہاں اُم کے معنی اصل کے نہیں ہیں۔

اسی سلسلہ میں مرزا صاحب نے "حس غیر مانوس" اور "راضی" لفظ کو تو پسند فرمایا لیکن Intuition کے خالص عربی ترجمہ کو پسند نہیں فرمایا بلکہ لفظ حدس کو ایسا غیر مانوس عربی لفظ قرار دیا جو "سوائے علمائے کبار کے معمولی آدمیوں کے فہم سے بالا تر ہے" حالانکہ پہلے سے یہ اصطلاح ملک میں رائج ہے اور عربی مدارس کی ابتدائی منطق کی کتابوں کا پڑھنے والا کوئی طالب علم اسکے سوا دوسرا لفظ استعمال ہی نہیں کر سکتا انھوں نے جو ترجمہ بدیہی کیا ہے وہ غلط ہے۔ بدیہی کے لیے انگریزی لفظ Self Evident یا Evident ہو سکتا ہے۔ اور ہر بدیہی چیز Intuitive نہیں ہے۔ مثلاً دو اور دو چار ہوتے ہیں، یہ بدیہی ہے۔ سورج سے روشنی ہوتی ہے یہ بدیہی ہے۔ لیکن ایک سیب کے زمین پر گرنے سے کشش اجسام کا اصول بداہت کے ساتھ کسی دماغ میں نہیں آسکتا۔ یہ صرف نیوٹن Newton ہی تھا جسے Intuition یا حدس کے ذریعہ سے قانون قدرت کا یہ زبردست راز معلوم ہو گیا۔ اسی طرح ارشمیدس کو پانی میں نہاتے ہی یکایک یہ معلوم ہوا کہ اجسام کا مساوی الحجم پانی سے کیا تعلق ہے۔ غرضکہ دنیا کے جتنے اصول ہیں ان میں سے اکثر بذریعہ حدس کے معلوم ہوئے ہیں۔ اسے

کشف ۔ القا ۔ الہام اور اسی قسم کے الفاظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن چونکہ منطق میں اسکے متعلق پہلے سے ایک مخصوص لفظ موجود ہے اس لیے میں مدس کو محض اجنبیت یا التباس لفظی کی وجہ سے زبان سے خارج کرنا مناسب نہیں سمجھتا ۔ معلوم نہیں مرزا صاحب اپنے اصول کے خلاف ایک دوسرا لفظ جو یقیناً مدس نہیں کیوں رائج کرنا چاہتے ہیں ۔ اسکے علاوہ بدیہی کے لفظ میں ایک خاص اشکال یہ ہے کہ Intuitionism کا ترجمہ بدیہیہ کرنا پڑیگا ۔ اور Intuitionist کا بدیہیت ۔ اور ان الفاظ میں بھی التباس کا خطرہ ہے ۔ جیسا کہ میں جانتا ہوں علی گڑھ کالج میں فی البدیہہ کو اکثر آزاد قسم کے لڑکے کچھ اور کہا کرتے تھے ۔

انگریزی	ترجمہ مجوزہ مرزا صاحب	تبصرہ
Altruism	غیر پرستی	"غیر پرستی" میری تجویز ہے لیکن اسکے مقابلہ میں خود پرستی مرزا صاحب کو منظور نہیں Egoism کے لیے انانیت کا لفظ غلط ہے اگر وہ عربی ہی چاہتے ہیں تو انائیت ہونا چاہیے

لیکن اسی سلسلہ میں مرزا صاحب نے مل کے فلسفہ Utilitarianism کو فلسفۂ خود غرضی بتایا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ "کومت" نے اس نظریہ کو الٹ ڈالا یہ دونوں باتیں واقعہ کے خلاف ہیں ۔ Utilitarianism فلسفۂ خود غرضی نہیں ہے بلکہ یہ وہ مذہب اخلاق ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ سوسائٹی کے جملہ اعمال کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ افراد جماعت کو زیادہ سے زیادہ مسرت حاصل ہو ۔ مل اپنے آپ کو کومت کا شاگرد کہتا تھا ۔ علم النفس میں مذہب تجربی رکھتا تھا ۔ اخلاق میں مذہب منفعت (افادیت) Utilitarianism کا قائل تھا اور سیاسیات میں جمہوریت پسند تھا ۔ اسکے آگے جو ملوات کومت کے متعلق ہے اُسے موجودہ تنقید سے کوئی تعلق نہیں ہے

انگریزی	ترجمہ مجوزہ مرزا صاحب	تبصرہ
Asceticism	مرتاضیت	آخر زہد پر اس لفظ کو کیوں ترجیح دی گئی جو حقیقتاً عجیب قسم کی عربی ہے
Conduct	عمل	مرزا صاحب کا خیال ہے کہ کیرکٹر متعدد کنڈکٹ کا مجموعہ ہے یہ صحیح نہیں ہے ۔ اخلاقیات کی اصطلاح میں کیرکٹر اُس عادت کو کہتے ہیں جو مختلف واقعات و اعمال کو

کسی خاص مقصد کے لیے ڈھالتی ہے۔ یہ ایک داخلی چیز ہے۔ لیکن کنڈکٹ بالارادہ کسی عمل کے کرنے کا نام ہے ۔ الغرض کیریکٹر اظہار یا خارجی فعل ہے کیریکٹر کا۔ لہذا میں پھر عرض کروں گا کہ کیریکٹر کے لیے کردار اور کنڈکٹ کے لیے چلن یا روش زیادہ موزوں ہیں میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب پھر عرض ہے کہ نسل اور قوم میں بہت بڑا فرق ہے۔ قوم ایک سیاسی اصطلاح ہے جس کا انگریزی ترجمہ People ہے اسی کے مقابلہ میں ملت کے لیے Nation ہے قوم اُس جماعت کا نام ہے جو باعتبار نسل و زبان معاشرت و مذہب متحد ہو۔ ملت اُس قوم کو کہتے ہیں جو سیاسی اعتبار سے آزاد اور صاحب سلطنت ہو۔ لیکن کسی ایک نسل کے آدمیوں کا ایک ہی قوم سے متعلق ہونا ضروری نہیں مثلاً جرمن فرانسیسی ایرانی، ہندی اقوام گو علیحدہ علیحدہ ہیں۔ لیکن ایک ہی نسل یعنی آریہ سے متعلق ہیں اسی لیے وہ علم جو نسلوں سے بحث کرتا ہے اسے نسلیات یا Ethnology کہنا چاہیے Twentieth Century ڈکشنری میں بھی یہی لکھا ہوا ہے۔ اور فرانسیسی لغت میں بھی مندرجہ ذیل الفاظ ہیں۔	علم الاقوام	Ethnology

Ethnologie = Science qui traite
de la formation et des Caractères
physique des races humanes

یعنی اتھنالوجی وہ علم ہے جو انسانی نسلوں کے بننے

		اور اُن کی جسمانی خصوصیات سے بحث کرتا ہے۔ جرمن زبان میں Volfer-funde یا Volfer-lehre کہتے ہیں اور Volfer کے معنی آبادیاں ہیں۔
Fanatic	متعصب، متشدد	دونوں صحیح نہیں۔ اصل میں اس کا ترجمہ "مذہبی جوش سے مجنونانہ ہوجاتا" ہے۔ آئندہ لفظ Passion کے سلسلہ میں اس کی تشریح کرونگا۔
Good		انگریزی لفظ اسم بھی ہے صفت بھی۔ اس لیے اس کے دو ترجمے کیے ہیں۔
Good Will		ملاحظہ کیجیے اکبر صاحب کی آبادیات ترکیب سید علی کی علم الاخلاق Muirhead صفحہ ۲۰۱ سطر ۱۹ ملاحظہ فرمائیے
Idea	تصور	تصویر میں صورت کے لفظ کو ذہن میں رکھیے اور پھر غور فرمائیے کہ Image کا کیا ترجمہ ہوگا۔ Perception بھی اسی سلسلہ میں آتا ہے۔ حقیقت میں یہ اصطلاح نفسیات کی ہے۔ اور ہر مترجم کو اس قسم کی اصطلاحوں میں غرض کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ رد و بدل کرنا پڑیگا۔ اسی لیے میں نے لفظ [illegible] کو تصور پر ترجیح دی ہے۔
Idealism	ذہنی	ذہنی کی انگریزی Mental ہے اور تصوریت ایک مذہب فلسفہ ہے۔ اس لیے ذہنی درست نہیں
Imperative	واجب	چونکہ "واجب" فقہ کی اصطلاح ہے۔ اس لیے لازم زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ التباس سے بچنے کے لیے بھی یہ لفظ زیادہ مناسب ہوگا۔
Individual -ism	خودغرضی	غلط ہے۔ فردیت ایک مذہب فلسفہ ہے۔ اس لیے اس کے آخر میں یا اور ت کا اضافہ کیا گیا ہے۔

Instinct	جبلت	صحیح نہیں۔ محرک ہی صحیح ہے۔ اور یہ لفظ Reason کا مفہوم ہوا ہے کہ ارتقائین کا مسلک اس زبان سے اصل [illegible] ہے
Impulse	جذبۂ فوری	یہ جذبہ نہیں ہے۔
Necessitarianism	جبر	جناب مرزا صاحب تپاں نے اس مضمون میں سات جگہ تعجب کا اظہار فرمایا ہے۔ مجھے ان کے کسی تعجب سے اتفاق نہیں۔ البتہ اس اصطلاح کے سلسلہ میں جو تعجب ہے وہ واقعی مجھے بھی تسلیم ہے۔ میں مرزا صاحب سے اس ترجمہ میں بالکل متفق ہوں غالباً میں جبر و جبریہ لکھنے کے بجائے قدر اور قدریہ لکھ گیا۔ مجھے اپنی غلطی تسلیم ہے۔
Objective Right		مرزا صاحب نے میرا ترجمہ پسند فرمایا ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہاں حق کے معنی قانونی ہیں یا اخلاقی۔ اس لیے کہ انھوں نے صاحب کو صحیح نہیں سمجھا۔
Pedagogics		انگریزی لفظ کے املا میں غلطی نہیں کی گئی۔ براہِ کرم کوئی لغت ملاحظہ فرمایئے
Passion	جذبہ	اس اصطلاح کے متعلق مجھے خصوصیت سے کچھ عرض کرنا ہے۔ جذبہ اردو میں رائج ہو گیا ہے۔ اور غالباً اس کا رواج مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کی تصنیف فلسفۂ جذبات کی وجہ سے زیادہ ہو گیا۔ یہ ترجمہ Emotion کا ہے۔ گو جذب عربی لفظ ہے لیکن عربی زبان میں اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے بہرحال چونکہ یہ لفظ غلط العام ہے اس لیے مجھے اس سے سروکار نہیں کہ اردو زبان میں کہاں سے آیا اور کیوں آیا حال یہ ہے کہ سب اس کے معنی سمجھتے اور لے Emotion کا ترجمہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن اب اس پر غور فرمایئے کہ اس لفظ میں جوش اور ہیجان کے معنی بھی پنہاں ہیں یا نہیں۔

یہاں گر شام کو ہم دونوں گاؤں واپس آجائیں اور شکار ساتھ کھائیں۔ افسوس ہے اس: مدد پہنچا تم نہ وصلہ
گھنٹوں میں بیت عزیز نے نہ صرف مجھے انتہائی اصرار کے ساتھ روک لیا بلکہ میرے بیوی بچوں کو بھی بلائے
رکھا یا دیکھا ہی کہ "میں" تعلیمات غزالی" بس صرف چند دن کے لیے علیگڑھ سے وطن گیا تھا اور معلوم
نہ تھا کہ پھر کب ملاقات ہوگی۔ بڑی مشکل سے ۲۶ ستمبر کو مجھ دوبارہ مجھے واپسی کی اجازت ملی اٹھ واپس پہنچ کر
موٹر سے اترتے ہی پہلی خبر جو کانوں نے سنی یہ تھی کہ ندواں اس دنیا میں نہیں ہیں۔

آپ میری حیرت کا اندازہ نہیں کرسکتے . مجھے سکتہ سا ہوگیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کان ہرگز
اس خبر کے سننے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے دل بالکل اس غم کو برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتا تھا۔
کیونکہ مجھے تو ان سے اپنی وعدہ خلافی کی معذرت کرنا تھی اور نہ معلوم ان سے کتنے کام باقی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ طبیعت بیقرار ہوگئی اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے ان کی موت کا واقعہ مختصر یہ ہے۔ ۲۴ ستمبر کی شام کو شکار سے واپس
ہوئے۔ صرف چند جنگلی کبوتروں کے، انھیں شکار میں کچھ نہ ملا جنھیں انھوں نے گھر واپس آکر پکوا کے کھایا۔

خود کرنے کو آئے شکار ہو کے چلے!

اکثر ان کی زبان پر رہتا تھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ یہ مصرعہ انھیں پر صادق آئے گا .. رات کو گھر کی بورڈی چاندنی
میں اپنے عالیشان مکان کی اوپر کی منزل کی چھت پر صبح کے دو بجے تک اپنی زیر تالیف مثنوی "گوتم بدھ"
کے اشعار کہتے رہے، پھر وہیں شبنم میں سو گئے۔ صبح اٹھے تو کسل تھا اور حرارت بھی تھی۔ اسی حالت میں
نہائے۔ اتوار کا دن تھا اس لیے آرام کیا مگر بخار چڑھ آیا جس کا معمولی علاج ہوا دوسرے دن بخار ہی کی
حالت میں کچہری میں، پیش مقدمات کی پیروی کی۔ تین بجے واپس ہوئے تو حالت بہت خراب تھی رات
کو سرسام ہو گیا۔ کسی کو پہچانتے نہ تھے۔ تیسرے دن صبح آٹھ بجے زبان بند ہو گئی گیارہ بجے دن کو سخت
اضطراب کی حالت میں دم توڑا . . . ہوش کی حالت میں دل پر بار بار ہاتھ رکھتے تھے اور شدید درد بتاتے
تھے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ حرکت قلب رک گئی حکیم کہتے ہیں کہ خون میں زہر پھیل گیا۔ اس لیے
اور بھی کہ مرنے کے بعد ناخن اور ہونٹ اور گلے کے نیچے ایک جسم سیاہ پڑ گیا تھا، غرضکہ مرض الموت سے
مفر نہیں۔ ... چھوٹے بچے کو بار بار گود میں لیتے تھے، مرنے سے پہلے بستر مرگ کے چاروں طرف اپنے
اہل و عیال کو حسرت و یاس سے دیکھتے تھے خصوصاً بیوی بچوں اور بھائیوں کو، اور اپنے مکان اور سارے سامان
کو دیکھتے تھے۔ معلوم نہیں اس آخری ساعت میں دل پر رنج و غم کا کیسا غلبہ ہوگا مگر افسوس زبان سے
کچھ نہ کہہ سکے۔ کہا تو صرف اتنا کہ "اب ہم جاتے ہیں!" وہ بھی کس تکلیف سے کہ بس سننے والوں کے
جگر شق ہو گئے۔ ـــ

دماغی کمزوری رہتی تھی جس کے سبب کبھی کبھی یکایک انھیں چکر آجاتا تھا اور وہ بیہوش ہو جاتے تھے۔ ذہن کے [illegible] اس سے خائف رہتے تھے کہ کسی دن یہ مرض رنگ نہ لائے۔ میں نے سنا تھا کہ پچھلے دنوں کبھی [illegible] ابھی پر انھیں راستہ میں اس مرض کا ایک شدید حملہ ہوا تھا اس لیے میں نے ان کے متعلق استفسار کیا۔ معلوم ہوا کہ اب مرض کی وہ شدت نہیں مگر مرض باقی ہے۔ تعجب ہے کہ قوت بالکل درست ہے باقی اور اس مرض سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ . . . اس اثنا میں پان پر پان اور سگرٹ پر سگرٹ چلتے رہے، اور شاید ہماری گفتگو کبھی ختم نہ ہوتی کہ ایک نوکر نے مقدمہ زیر سماعت ہونے کی خبر سنائی، اور یہ "محفل برخاست"[1] ہوئی۔

شام کو ہمارے ہاں آئے۔ گرمی کے موسم میں شام کو نہا کر صاف شفاف ململ کے کرتے اور ایک سفید دھوتی میں موٹر پر بیٹھ کر باہر نکلنا یا بے تکلف دوستوں سے ملاقات کرنا انھیں بہت پسند تھا۔ اس لباس کو وہ ہندستان کا قومی لباس کہتے تھے اور کہتے تھے کہ اسے پہن کر طبیعت میں فراخی پیدا ہوتی ہے۔ ہم جب فرصت میں یکجا بیٹھتے تھے دنیا بھر کی باتیں کرتے تھے۔ اس وقت بھی ہوا، باتیں کرتے رہے۔ جب چاند ادھر ہوا اور چاندنی چھٹکنے لگی اور فضا میں نور اور وہاں موسیقی کی کیفیت پیدا ہو چلی تو ہم لوگ اٹھے اور موٹر پر شہر سے باہر نکل گئے اور کئی میل کا چکر لگا آئے۔ یہ ہمارا دستور تھا جسے مفصل آگے بیان کروں گا۔ دلچسپ یہ تھا نہر پر کے بیٹھے۔ مگر پانی کم اور گندہ تھا اور طبیعت میں فرحت نہ پیدا ہوئی اس لیے اٹھ کر چلے آئے ..... دوسری دفعہ میں گھر گیا۔ آواز دی "بھگت!" قانونی کتابوں کے انبار میں گھرے ہوئے تھے فوراً کام چھوڑ دیا آواز آئی "چلے آؤ جلیل" میں اندر گیا اور باتیں شروع ہو گئیں۔ میں نے اپنی یونیورسٹی کے بی اے آنرز اور ایم اے کے امتحان اردو کا نصاب دکھایا۔ غور سے برابر پڑھتے رہے، خوش ہوئے، داد دی بعض مفید مشورے بھی دیے . افسوس کیا خبر تھی کہ یہ دلچسپ ملاقاتیں آخری ملاقاتیں اور یہ پر لطف صحبتیں آخری صحبتیں ہیں، اور بہت جلد وہ وقت آئے گا کہ صرف ان کی یاد سو جان رونے کے لیے باقی رہ جائیگی۔ جس وقت یہ خیال آتا ہے کہ "ہائے وہ نورانی شکل اور وہ چہرہ شاداب!" وہ قوی، بھاری اور

---

[1] میر

محفل برخاست ہے پتنگے   رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر   تارے کہیں نام کو رہے ہیں
آنکھ بھی تو دیکھتی کوئی دم   وہ بھی نہ رہیں گے جیسے ہیں یاں .....
دنیا کا یہ حال اور ہم کو   کچھ فکر نہیں ہے سو رہے ہیں!!

بتلائے آج وہ دوستوں پر جان چھڑکنے والا کہاں ہے؟ . . .

اے میرے پیارے جگت! (کیونکہ اپنے حلقۂ احباب میں تم اسی نام سے پکارے جاتے تھے) تم نے اپنی مشہور "آفاق گیر" تخیل سے کام لیکر اور اپنی روحانیت کی مدد سے اپنی نظموں، غزلوں اور سب زیادہ اپنی رباعیوں میں مسئلۂ حیات و ممات کو حل کرنے کی بڑی کوشش کی۔ ہم جب کبھی تنہا بیٹھتے تھے تو زیادہ اسی مسئلے پر بحث ہوتی تھی۔ اب کہ یہ مشکل ترین راز تم پر منکشف ہو گیا ہے، اسکے علم سے اپنے ایک عزیز دوست کو محروم نہ کرو۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم مجھے اب بھی نہ بھولو، جس طرح میں تمھیں نہیں بھولا ہوں اور پھر مجھے اس راز سے آگاہ کر دو؟ . . . .

. . لیکن یہ میں کیا بک رہا ہوں؟ میرا جگت اب کہاں! شاید میرا دماغ خراب ہو گیا ہے شدتِ غم کے باعث میں پاگل ہو گیا ہوں . . . بے شک میرا دماغ اس وقت اس شئے سے بالکل خالی ہے جسے سادہ لوح دنیا "عقل" کے لفظ سے موسوم کرتی ہے اور اس وقت اس پر اس کا فریب نہیں چل سکتا . .

آج اکتوبر کی بارہ تاریخ ہے۔ میں تعطیلات کے بعد علی گڑھ واپس آچکا ہوں اور اپنے پیشے کے دھندے سے لگ گیا ہوں۔ سوچتا ہوں، میں نے یہ سفر کیوں کیا تھا؟ دل کہتا ہے "رواں کو رونے کے لیے! اس سفر میں گھر سے کیا ساتھ لایا؟ "رواں کی مفارقت کا داغ جو جیتے جی میرے دل سے محو نہ ہوگا۔

داغ فراق دل میں امانت ہے عشق کی — جب تک جییں گے دل سے مٹایا نہ جائیگا (جلیل قدوائی)

میرے اور رواں کے تعلقات ہم وطن ہونے کے باعث بہت پرانے تھے۔ شاید بارہ تیرہ برس ہوئے میں اناؤ ہائی اسکول کا طالب علم تھا جب مجھ سے ان سے شناسائی ہوئی۔ وہ اسی وقت کافی اچھے وکیل اور مشہور شاعر تھے، علاوہ اسکے وکیل ہونے کے سبب سے وہ میرے محترم بزرگ مرحوم[1] مولوی خان بہادر قاضی نذیر احمد صاحب وکیل و آنریری مجسٹریٹ اناؤ کے دوستوں میں تھے۔ میں ایک معمولی طالب علم تھا اور عمر

---

[1] میرے چچا بھی تھے اور حقیقی پھوپھا۔ اناؤ کے معزز لوگوں میں سے تھے اور مجھے بے حد چاہتے تھے۔ اناؤ میں میری دلچسپی کی دو ہی جگہیں تھیں۔ ایک مرحوم کی کوٹھی، دوسرے رواں کا گھر۔ تین سال پہلے وہ انتقال کر گئے۔ اب رواں کے بعد کوئی جگہ نہیں رہی۔ اگرچہ ان کا ادب کا مذاق بہت بلند نہ تھا مگر ان کے ہاں بڑے بڑے مشہور ادبی رسائل آتے تھے۔ میرے ادبی ذوق کی سیرابی انھیں رسالوں اور مرحوم کی ہمت افزائی سے کی۔ ان کی تصویر نظروں میں پھرتی ہے۔

ہائے کیا کیا صورتیں آنکھوں سے پنہاں ہو گئیں!

میں اُن سے کوئی پندرہ برس چھوٹا تھا، اس لیے ابتدا میں بہت تکلف اور حجاب رہا لیکن رفتہ رفتہ بالخصوص
جب سے میں اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ آیا اور مسلم یونیورسٹی سے میرا ملازمت کا تعلق بھی ہو گیا، ہمارے تعلقات
میں وسعت آ گئی اور گو علی گڑھ سے آنا، سال میں صرف چند بار، وہ بھی تھوڑے دنوں کے لیے ہوتا
تھا، ہمارے تعلقات اس قدر بڑھ گئے کہ آخر آخر ہم دونوں نہ صرف ایک دوسرے کے بے تکلف دوست
ہو گئے، بلکہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ کم دوستوں میں ایسی بے تکلفی ہوئی۔ اُن کی زندگی اور گھر کے کم راز مجھ سے پوشیدہ
تھے، میری زندگی اور گھر کے کم واقعات ایسے ہیں جن سے وہ باخبر نہ تھے۔ اُن کے گھر اور میرے گھر میں
گویا بھائی چارہ تھا۔ آج اُن کی موت پر میرا گھر اور خاندان اسی طرح ماتم کر رہا ہے جس طرح خود اُن کا خاندان۔
تعلقات کی یہی نوعیت تو ہے کہ ان کی موت مجھے ایک ذاتی حادثہ معلوم ہوتی ہے اور اُن کے اٹھ جانے
کے بعد واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں رہا۔

میں زوار کی کس کس بات کو یاد کروں۔ میں نے کہا ہے کہ وہ انسانیت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ وہ
ہندو تھے مگر ایسے وسیع المشرب کہ اُن کے دل میں ہر مذہب کے آدمی کی محبت تھی بشرطیکہ وہ وسیع خیال
اور صاف دل ہو۔ دراصل اُنھیں مہاتما بدھ کی تعلیم و تلقین میں جتنی صداقت نظر آتی تھی اتنی کسی مذہب
میں نہیں۔ اُن کو پڑھے لکھے آدمیوں کی صحبت میں بیٹھنا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اور اُن سے تبادلۂ
خیال کرنا خصوصاً مذہبی معاملات پر بے حد پسند تھا۔ میرے علاوہ اُن کے بعض اور گہرے دوست مسلمان
تھے۔ مرنے سے چند ہی دن پہلے آثر صاحب[1] اور یعقوب[2] صاحب سے ملنے کے خیال سے وہ ہردوئی اور
سانڈی جانے کا ارادہ رکھتے تھے مگر میں بعض مجبوریوں سے ساتھ نہ دے سکا، یہ ارادہ ملتوی کر دیا گیا۔
اُن کے میل جول اور برتاؤ میں آج کل کے تعصب و تنگ نظری کی بو نہیں پائی جاتی تھی۔ اُن کا اخلاق
نہایت بلند تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے دل سے حامی تھے اور ملک کے آئے دن کے مذہبی مناقشات پر افسوس
کرتے تھے۔ اپنے کلام میں بھی یہ خیالات نظم کیے ہیں۔ ؎

---

[1] آثر صاحب نواب مرزا جعفر علی خاں آثر، ڈپٹی کلکٹر ہردوئی مشہور شاعر و نقاد، کبھی [illegible] میں تھے۔ آپ کی ذات تعارف
سے مستغنی ہے۔

[2] یعقوب حسن صاحب سانڈی کے سب سے بڑے رئیس و تعلقہ دار جناب چودھری محمد [illegible] صاحب جن کی ذات گرامی قدیم تہذیب
و شرافت کی یادگار ہے، اور جو [illegible] مسلمان فرقۂ سادات میں جو ملک کے نامور خاندانوں میں شمار ہوتا ہے اُسکے [illegible]۔
آپ سانڈی ضلع ہردوئی اور دوالی پور کے رئیس ہیں۔ آپ نہایت ذہین طباع اور شعر و ادب کا نہایت اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں۔

قفس کے ہم نواؤں چپ ہیں ابھی بہت چپ ہے ::: نہ جانے کیا لکھا ہے ہم اسیروں کے مقدر میں

غم جو ہو قہر پھیلا جاتا ہے ::: اللہ کا قہر پھیلا جاتا ہے
اب ہمت دلوں میں اک حالت تھی ورنہ ::: اب خون میں زہر پھیلا جاتا ہے

اس وقت ہو اپنی قوم شاداں بہر ::: جب ایک ہی جذبے سے ہوں معمور تن تن
کل قوم کے دل میں درد ہر فرد کا ہو ::: اور دل میں ہو ہر فرد کے کل قوم کا درد

گاندھی جی کے بڑے پرستاروں میں تھے اور ملک کو جلد سے جلد آزاد دیکھنے کے آرزومند۔ گو اپنی مجبوری سے اُن کی "گوپیوں"[1] میں شامل نہ تھے مگر جب کبھی کوئی خاص خبر آتی یا جلوس وغیرہ نکلتے یا گرفتاریاں عمل میں آتیں تو اُن کا چہرہ فرطِ خوشی سے چمک اُٹھتا تھا اور خون جوش مارنے لگتا تھا جیسے ایک پابہ زنجیر شیر آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔ اکثر ایسے وقت میں فخریہ اور پُرجوش اشعار پڑھتے تھے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ اپنے بزرگوں کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا لیکن وہ اپنے بڑے بھائی بابو کنھیا لال صاحب کو اُن سے کم نہیں سمجھتے تھے اُن کی حد سے زیادہ تعظیم کرتے تھے۔ میں نے اُن کے ہاں اچھے بڑے آدمیوں کو آتے دیکھا۔ کسی کے لیے وہ اپنی آرام کرسی نہیں چھوڑتے تھے مگر اپنے بھائی صاحب کو دیکھتے ہی کھڑے ہو جاتے تھے اور اُن کو اپنی آرام کرسی پر بٹھاتے تھے اور اُن کے پیر چھوتے تھے اور ہاتھ جوڑتے تھے اور بالکل بچھ جاتے تھے۔ اسی طرح اپنے چھوٹے بھائی بابو تربھون ناتھ صاحب کو جو کانپور میں وکالت کرتے ہیں بہت چاہتے تھے اور اگر کچھ عرصہ تک اُن سے ملاقات نہ ہوتی اور کام سے فرصت نہ ملتی تو راتوں رات موٹر سے جا کر انھیں دیکھ آتے تھے۔ اپنے بچوں سے محبت ہر باپ کو ہوتی ہے مگر اُن کی محبت ظاہری نہیں باطنی تھی۔ بظاہر وہ اُن سے بے تعلق رہتے تھے یا زیادہ سے زیادہ اُن سے دوستانہ سا برتاؤ رہتا مگر اُن کی ذرا سی تکلیف سے بے چین ہو جاتے تھے اور اُن کی بیماری کے زمانہ میں رات رات بھر جاگ کر اُن کی تیمارداری کرتے۔ جس رات انتقال کے لیے مجھ سے بات چیت ہوئی ہے اُسی رات کا واقعہ ہے کہ اُن کے منجھلے لڑکے ہرگیان نے جس کی عمر کوئی بارہ برس کی ہوگی اُن کے پاس آکر اُن کے کان میں کچھ کہا سن کر زور سے ہنسے اور کہا "ضرور ضرور" مجھ سے پوچھا "جانتے ہو کیا کہتا ہے؟" اپنے بعض دوستوں کو اس نے کھانے پر بلایا ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ کھانے کی میز اور کرسیوں پر کھانے کھلانے کی اجازت دیدیجئے

ل مرحوم گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا ::: اُس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں!

ایسا مجلسی [illegible] ہی رہی کہ کبھی ان سے مسلسل گھنٹہ دو گھنٹہ سائلوں سے بے خوف اور فارغ ہو کر
گفتگو ہو سکتی۔ ہاں جب میرے مکان پر ہوتے یا سیر و سفر میں، اس وقت ظاہر ہے کہ یہ کیفیت قائم نہیں
رہ سکتی تھی۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ کسی چھٹی میں ہمارا باہر جانے کا پروگرام ہے۔ وقت معینہ پر موٹر بھی
کھڑا ہوا ہے۔ پہنچا تو معلوم ہوا کہ کسی آنریری مجسٹریٹ کے اجلاس کا مقدمہ آیا ہوا ہے [illegible]
کا پچاس ساٹھ روپیہ کا نقصان ہوگا۔ مجبوراً پروگرام ملتوی کیا گیا مگر چونکہ میں بھی قانون چھوڑ رہا تھا
مجھے ساتھ ضرور لیجاتے کہ مجھے کچھ کام ہی آجائے ..... لیکن اتنی کثیر آمدنی کے باوجود وہ پیسہ کو
جوڑنا نہیں جانتے تھے۔ ایک زندگی کا بیمہ تو ضرور کرا لیا تھا باقی کچھ نہیں۔ کچھ کرایہ کی دوکانیں ہیں۔
طبیعت نہایت فیاض اور شاہ خرچ واقع ہوئی تھی اپنے بال بچوں، عزیزوں، دوستوں اور نوکروں
پہ بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے۔ پبلک کے کاموں یا خیرات کی مد میں بھی خوشی خوشی روپیہ دیتے
تھے۔ ابھی ایک نئے رام لیلا کی تحریک میں سو روپیہ چندہ دیا تھا ایک دفعہ میری موجودگی میں لالہ دیوان چند
صاحب جو آج کل آگرہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں اور اس وقت ڈی اے وی کالج کانپور کے
پرنسپل تھے اپنے کالج کے چندہ کے لیے آئے، سو روپیہ انھیں دیا۔ لیکن وہ نام و نمود سے بھاگتے تھے کبھی
کھلے خزانے کسی تحریک کو لیکر میدان میں نہیں آتے تھے۔ اچھا کھانا کھاتے تھے۔ عمدہ لباس پہنتے تھے۔
آگرہ میں میرے علم میں زرداں سے بڑھ کر قیمتی اور بہترین سِلی ہوئی شیروانیاں کسی نے نہیں پہنیں۔ اُنکی
بیگم صاحبہ حیدرآباد کی ہیں، اس لیے بعض دفعہ شیروانیاں براہِ راست وہاں سے سِل کر آتی تھیں۔
آخر عمر آرام طلب ہو چلے تھے جو اُن کی ابتدائی مشقت و دلسوزی کا انعام تھا۔ پھر عمارت بنوانے اور باغ
لگانے کا بھی شوق تھا۔ روپیہ آتا جاتا تھا، در عمارت پر صرف ہوتا جاتا تھا۔ نواب آصف الدولہ کا
یہ شعر بارہا اُن کی زبان سے سُنا ہے

جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے   عمارت بناتے چلے جایئے

ان کی زنانی کوٹھی اور مردانے حصہ اور دوکانات اور باغ وغیرہ پر اس میں شک نہیں کوئی تیس چالیس ہزار روپیہ
صرف ہوا ہوگا۔ دو دو موٹریں رکھ چھوڑی تھیں جن پر علاوہ کچہری جانے کے جی کھول کر تفریح کرنے بھی جاتے تھے۔
اور اپنے احباب کو بھی خوب سیر کراتے تھے۔ میں نے بھی خوب خوب اُنکی موٹروں پر سیریں کی ہیں۔ میں جب چھٹی
میں جاتا تو دیکھ کر بالکل فارغ ہو جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باوجود اس آرام و عیش کے جو اللہ نے انھیں دے
رکھا تھا اور باوجود اپنے پیشے کے ساتھیوں کے اُنھیں اس دنیا میں سچے دوست کم ملتے تھے۔ خصوصاً ایسے
دوست کے طلبگار تھے جو قانون، عدالت، اور جرم اور سزا، اور [illegible]، اور مار پیٹ اور تعزیرات ہند کے

مسلمانوں سے بات کرتے اور اُنھیں الٰہ آباد میں یہی چیز ممتاز تھی۔ اکثر ہم سے کہتے تھے کہ وہ بڑا امیر [illegible]
ہو جائے۔ وکیل بن کر آؤ گے۔ اُنھیں خیال تھا کہ

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

کہ مذاق کچھ اور منظور تھا۔ میں وکیل نہیں ہوا، نہ صرف یہ بلکہ وہ کبھی کبھی کامل "بیٹا" بھی کہا۔ افسوس!
شاعر تھے اور علم و ادب کے عاشق زار۔ میں نے کسی وکیل میں جو اپنے پیشے میں بھی چوٹی پر ہو علم و ادب
کا ایسا چسکا نہیں پایا۔ در اصل وہ علمی ہی مشاغل کے لیے بنے تھے مگر قدرت کی ستم ظریفی نے انھیں وکیل بنایا۔
کہا کرتے تھے کہ "قدرت نے وکالت کے پیشے سے پیٹ بھرنا مقدر میں لکھ دیا ورنہ اس کام سے میری روح گھٹتی
ہے۔ اور اوقات کُشی کرتا ہوں" اب نئی کتابیں کم خریدتے تھے مگر کتاب مل جائے پڑھے ضرور یا پڑھتے
تھے۔ جب چھٹیوں میں اُن سے ملتا نئی کتابوں کا تقاضا کرتے اور جو کتابیں میرے پاس ہوتیں انھیں مستعار
لے کر پڑھ ڈالتے تھے۔ الٰہ آباد میں کوئی اچھا ادبی کتب خانہ نہیں ہے، اس لیے کبھی کبھی میں نے انھیں علی گڑھ یونیورسٹی
کی لائبریری سے بھی کتابیں لے کر مستعار بھیجیں۔ اپنا ذاتی ادبی کتب خانہ مہیا کرنے کا بھی ارادہ تھا جو افسوس کہ
پورا نہ ہو سکا۔ انگریزی میں اول درجے کے ایم اے تھے اور بہترین انگریزی شعرا کا کلام زبانی یاد تھا۔ یہ ضرور ہے
کہ جدید انگریزی شعرا و مصنفین سے اور نئی ادبی تحریکات سے کم واقف تھے۔ شاید یہی وجہ
ہے کہ انھیں گالزوردی کے Skin Game کے ترجمے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ کبھی ترنگ میں آکر
انگریزی نظم کو اُردو غزل کے انداز سے ترنم کے ساتھ اس طرح پڑھتے تھے کہ لطف آجاتا تھا۔ یہ اُن کا اپنا ایجاد
تھا۔ یہ بات اگر کسی اور کی بابت کوئی کہتا تو میں اسے بدمذاقی کی دلیل سمجھتا مگر ان کا معاملہ بالکل
دوسرا ہے۔ میں نے سچی بات کہی ہے۔ ان سے مور کی Dear harp of my country
کی صدا میرے کانوں میں اب تک گونج رہی ہے۔ شکسپیر، ملٹن، بائرن، ٹنی سن اور ورڈز ورتھ سے
خاص شغف تھا۔ فٹز جیرلڈ کی "رباعیات عمر خیام" کو ادبی معجزہ سمجھتے تھے۔ میتھو آرنلڈ کی
[illegible] تو تعویذ کی طرح ہر وقت ساتھ رہتی تھی اس لیے اور بھی کہ ان دنوں گوتم بدھ کی
زندگی اور اس کی تعلیم پر اُردو میں ایک مثنوی لکھ رہے تھے۔ یہ مثنوی افسوس کہ نامکمل رہ گئی۔ کام قریب
قریب ختم ہو چکا تھا۔ آخر کے چند باب لکھنا باقی تھے۔ مگر ان کے بعد کوئی ایسی جامع ہستی نظر نہیں آتی جو اس
مثنوی کو مکمل کر دے۔ فارسی کا مذاق بے انتہا پاکیزہ تھا، بالخصوص حافظ اور خیام کے تو پرستار رہتے۔ ان
دو شعرا کا اثر اُن کی رباعیوں میں نظر آتا ہے۔ خیام کی چار رباعیوں پر جو تصویریں [illegible] ان پر سے

[illegible] کے نام سے ہندستانی اکیڈمی یو پی، الٰہ آباد نے شائع کیا ہے۔

گورنمنٹ ہند Illustrated Weekly of India میں چھپی تھیں، انھیں بڑے اہتمام سے فریم کرا کے مہاراجہ ڈرائنگ روم میں آویزاں کیا تھا۔ اُن کے اس سجے ہوئے ڈرائنگ روم اور اُنکی لائبریری اور دفتر کے دروازوں میں اب قفل پڑ گئے ہیں۔

اُردو اور ہندی تو گویا اُنکی مادری زبانیں تھیں۔ ہندی میں بہاری لال اور رحیم کے دوہے مزے لے لیکر پڑھتے تھے اور اُنکے لطف کو بڑے لطف سے بیان کرتے تھے۔ اُردو میں غالب کو چوٹی کے شعرا میں جگہ دیتے تھے۔ سودا کے طنزیات کے قائل تھے اور اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ اُردو شاعری میں کوئی سودا کا تبع نہیں پیدا ہوا۔ منشی دیاشنکر نسیم اور سرشار کے کمال کے بہت مداح تھے، اور سرور جہاں آبادی، اکبر الہ آبادی اور دورِ حاضر کے شعرا میں اقبال کے خاص طور پر دلدادہ تھے۔ جوش کی تعریف انکی جدید کی آثر صاحب سے معترف تھے خصوصاً اُنکی تنقید کے۔ آج کل کے غزل گو شعرا میں اصغر، جگر اور عزیز کا کلام دل سے پسند تھا۔ عزیز لکھنوی صاحب کے شاگرد تھے اور اگرچہ اصلاح و مشورہ عرصہ سے بند تھا تاہم اُن سے برتاؤ آخر دم تک نہایت سعادتمندانہ اور نیازمندانہ تھا۔ اُستاد کا بیحد احترام کرتے تھے اور ان سے صد درجہ عقیدت رکھتے تھے۔ خصوصاً اُنکی زبان کے معلومات کے دل سے قائل تھے۔ انھیں بیمار یا تکلیف میں سُن کر بے قرار ہو جاتے تھے اور ہر طریقہ سے انھیں آرام پہونچانے کی فکر کرتے تھے۔ جگر مرادآبادی عرصہ تک اُن کے ہاں ایک دوست کی حیثیت سے مقیم رہے۔ انھیں دنوں آثر صاحب بھی اناؤ میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور جب چھٹیوں میں یہ خاکسار بھی پہونچ جاتا تھا تو شعر و سخن کی بڑی پُرلطف صحبتیں رہتی تھیں۔ رواں کی وجہ سے اناؤ میں کئی بہت بڑے اور شاندار مشاعرے ہوئے۔ جگر کو وہ مثل اپنے بھائی کے سمجھتے تھے اور اُنکے کلام کو والہانہ انداز سے سنتے اور پڑھتے تھے اور سر دُھنتے تھے۔ کہتے تھے اُردو میں ایک ہی شاعر ہے جسکی زندگی اور شاعری میں تطابق ہے۔ جگر شاعری "برتتا" بھی ہے دوسرے صرف شاعری "کرتے" ہیں۔ ہر وقت انھیں اپنے ساتھ رکھتے تھے اور اُنکے آرام کو اپنے آرام پر مقدم سمجھتے تھے۔ مجھ سے بیحد محبت کرتے تھے۔ میری وجہ سے علی گڑھ کے مشاعروں میں شریک ہوئے اور پچھلے سال باوجود کثرتِ کار اور مالی نقصان کے ڈبائی ضلع بلند شہر کے مشاعرہ کی صدارت کی۔ طبیعت ایسی رندانہ بلکہ قلندرانہ پائی تھی کہ شعر و ادب کی بات چیت پر کھانا پینا بھول جاتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ رات کے آٹھ بجے کا وقت ہے، چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ اُنکی کوٹھی میں یا باغ میں ہماری پُرلطف صحبت جمی ہوئی ہے کہ طبیعت میں ہیجان یا طغیانِ احساس اُٹھا اور ہم موٹر پر ایک دم سوار ہو کر کسی طرف چل دیئے۔ ایک پُرانی کملی، دو ایک تکیے، پانوں کا ڈبہ، قوام کی شیشی اور سگرٹ، یہ زادِ سفر ہوتا۔ جس مقام پر فضا خوشگوار اور دلچسپ دیکھی جہاں بے دھڑک، بے دریغ، بے تکان باہر

معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص زندگی بھر اسی سوچ بچار میں رہا کہ آخر ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں چلے جائیں گے؟ ... یہاں کس لئے آئے ہیں؟ ... کون سا عالم ہوتا ہے؟ کیا موت ... ہے یا نہیں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہی مسائل اُن کے "دل کی آواز" معلوم ہوتے ہیں اور بار بار انھیں مسائل کو اور انھیں ذہنی اُلجھنوں کو وہ اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں اور ایک خشک فلسفی کی زبان میں نہیں بلکہ اپنی زبان میں جسے ... اگر اس سے میرا مفہوم واضح ہو جائے۔ کوثر کی ذہنی ... یہاں میں نمونے پیش کرتا ہوں ۔

ہر سمت بلاتی ہے احباب کی تدبیر مجھے　　　آگے لیجاتی ہے کہاں دیکھیے تقدیر مجھے
نظم ہستی کو سمجھتا ہوں میں اک خواب جنوں　　　کون بتلائے مرے خواب کی تعبیر مجھے
مدعا غور احقیقت ہے مرا پردۂ زیست　　　توڑ دینا ہے یہ آئینۂ تصویر مجھے

نزع میں آکر کھلا ہے عالم فانی کا راز　　　اے مری جاتی ہوئی دنیا بڑا دھوکا ہوا
اور اب کوئی ورق لے کاتب تقدیر الٹ　　　اُس کو کیا دیکھوں جو ہے سو بار کا دیکھا ہوا

سہل سی اک بات ہے مرنا مگر از قید زیست　　　روح کے آزاد ہونے کو زمانا چاہیے
اقتضائے نظم ہستی ہے بہ نیرنگ نمود　　　زندگی اور موت کا دھوکا نکلنا چاہیے
رنج و راحت کی کشاکش میں بہت مٹ لی　　　کچھ تو اے دل اب قدم آگے بڑھانا چاہیے

فکر عقبیٰ کی کریں یا ہم غم دنیا کریں　　　عقدۂ ہستی کو کس ناخن سے آخر وا کریں
ایک عالم محو نظارہ ہے اور وہ پردہ دار　　　گر اسی کا نام پردہ ہے تو وہ پردا کریں
جانے والے چل دیے دنیا کی بستی چھوڑ کر　　　رونے والے ایک دن کیا عمر بھر رویا کریں

اگر کچھ روز زندہ رہ کے مرجانا مقدر ہے　　　تو اس دنیا میں آخر مقصد تخلیق جاں کیا تھا
یہی ہستی اسی ہستی کے کچھ ٹوٹے ہوئے رشتے　　　دگرنہ ایسا پردہ میرے اُنکے درمیاں کیا تھا

مرجھا کے پھول مسکرا کر اک کلی صورت دکھاتی ہے　　　یہی قانون فطرت آپ عالمگیر دیکھیں گے

گل ایک غنچے نے بادِ سموم سے یہ کہا — ہزار بار خزاں اس چمن میں آئی ہے
نہ گل ہوئی ہے نہ شمعِ حیات گل ہوگی — ہزار بار یوں اس انجمن میں آئی ہے

مسئلہ جبر و اختیار بھی نہایت سنجیدگی سے اور طبیعت پر بہت جبر کر کے کیا گیا ہے۔ اسی قسم کے اور نہ معلوم کتنے مسئلے جو کہہ دیے گئے۔ موت و حیات کے مسائل پر ہر ذی فہم اس زندگی میں سوچتا ہے۔ بہرحال اپنی ذہنی ورزش کی یادگاریں اپنے دیوان میں چھوڑی ہیں۔ لیکن یہ کہنا ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ "رقصِ حیات" کے ایک حصے کے صرف بیس اوراق میں، اسی پاس صنف میں جیسی کہ غزل ہے بار بار اور اصرار کے ساتھ ان مسائل کا ذکر آنا "خالی از علت" نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شاعر کے مرکزی خیالات ہیں۔ یہ انکی روح کی بیتابی اور جد و جہد کی روشن دلیل ہے! نہ صرف یہ بلکہ ہمیں یہ کہنے کی جرأت کرنا پڑے گا کہ شاید کیا ہندو کیا مسلمان اور کیا لکھنؤ کے شعرائے باکمال، کیا دہلی کے اساتذہ، ان تمام میں کسی ایک شاعر کے دیوان میں ان مسائل پر نہ صرف اس نسبت سے بلکہ اس کثرت سے اور ایسے واضح روشن اشارے نہیں ملتے۔ تمام غزل گو شعرا میں اور جو وحدت وجود کے سطحی اور رسمی مضامین کے دلدادہ ہیں، شاید کسی شاعر نے ان مسائل پر ٹھنڈے دل سے اور مسلسل غور نہیں کیا۔ شاید اس کی ساری زندگی انہیں الجھنوں کی نذر ہوئی۔ اس لحاظ سے رواں اپنی آپ مثال ہیں اور اردو شاعری میں ان کا خاص درجہ ہے۔ انکی رباعیوں میں بھی انہیں موضوعات کی تکرار ہے ؎

کیا تم سے بتائیں عمرِ فانی کیا تھی — بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
اک گل کی مہک تھی یا ہوا کا جھونکا — اک موجِ تماشا تھی زندگانی کیا تھی

یہ ہستی محض و کل نہیں ہونے کی — ہستی پابندِ کل نہیں ہونے کی
محفل بدلے گلشن بدل جائے مگر — یہ شمعِ حیات گل نہیں ہونے کی

ہے ماتم جو اس کو راحت یہ ہے — ہم ہا بر [illegible] رنج غربت یہ ہے
جاتے ہیں کہاں سے اور جانا ہے کہاں — اس کی بھی خبر نہیں مصیبت یہ ہے

پابندیٔ جان و دل ہے زنجیرِ حیات — اللہ اللہ ری فکرِ توقیرِ حیات
آغاز کی کچھ خبر نہ انجام کا علم — کونین ہے پھر بھی محو تدبیرِ حیات

---

[1] اکثر میرے دوستوں نے خوش گمانی سے میں نے "رباعیات کا مجموعہ" کہا تھا۔ حالانکہ مجموعہ کلام مجھے جاننے کا حق ہے۔ [illegible]

معلوم ہوتا ہے کہ انکی زندگی میں باوجود فراغت و تن آسانی کے روّاں کے جسم کے اندر روح ہمیشہ بے چین رہی کہ دنیا
کی ہستی [illegible] احساس منافق دنیا میں اپنا ہمسر اور ہمدم نہ تھی۔ ان نمونوں میں اگر اس غزل کو بھی شامل کر لیا جائے جو شروع
میں نقل کی ہے تو اس خیال کو پوری پوری تقویت پہنچتی ہے کہ ہر چند وہ سب سے ملتے رہے، دنیا کی ہر قسم کی
لطف اندوزیوں سے بہرہ ور رہے، انھوں نے کھایا پیا عیش کیا، غرضکہ ہر طرح فارغ البال زندگی گذری مگر
انکی تنہائی میں خوشی و یکسوئی نہ تھی اور یہ دنیا درحقیقت زیادہ حساس لوگوں اور سوچ بچار کرنے والوں کو راس
بھی نہیں آتی۔ روّاں کی دو اور رباعیوں سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے ؎

اسباب جہاں سے دل کو بہلائیں ہم　　　اس طرح کا دل بھلا کہاں پائیں ہم
خلوت میں ضیقِ دل کی ایذا ہے وہی　　　اب اپنے سے بھاگ کر کہاں جائیں ہم

دنیا سو سو طرح سے بہلاتی ہے　　　سامانِ خوشی سے روح گھبراتی ہے
اب فکرِ فنا نے کھول دی ہیں آنکھیں　　　کلفت ہر بات میں نظر آتی ہے

کیا اب بھی انکی روح کی بے چینی کے متعلق شبہ ہو سکتا ہے؟ شاید انکی ساری رباعیوں میں انکے اصلی رنگ طبیعت کی
ایسی غماز رباعیاں نہیں مل سکتیں۔ یوں بھی رباعی میں وہ اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ
تمام اردو شاعری میں جید، مترنم، پُرجوش، سانچے میں ڈھلی ہوئی اور عمیق خیالات و جذبات سے مالامال گویا
صحیح معنوں میں رباعیاں صرف روّاں نے کہی ہیں۔ انکا نام بحیثیت رباعی کے ایک نہ ایک دن
لازوال شہرت حاصل کر کے رہے گا

غرضکہ کہاں تک بیان کیا جائے . کئی سال ہوئے روّاں نے مجھ سے ایک دوستانہ شکایت کی تھی
وہ ایک ذاتی بات تھی مگر اس موقع پر اسکا اظہار بیجا نہیں۔ میں نے اپنے افسانوں یا شعر و شاعری کی کتابوں کے
انتساب کے سلسلہ میں انھیں کہیں یاد نہیں کیا تھا۔ جب مجھ سے یہ شکایت کی گئی تو میں نے اپنے کو بہت ٹٹولا
کہ آخر اس بھول کی کیا وجہ ہے مگر کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے اپنی ندامت کا اظہار کیا اور وعدہ کیا
کہ میں آیندہ کسی بہتر طریقہ پر اسکی تلافی کرونگا اور حق دوستی ادا کرونگا ..... اگر اس وقت مجھے یہ معلوم ہوتا
کہ ایک دن مجھے حق دوستی یوں ادا کرنا پڑیگا تو میں وہ الزام اپنے سر لیتا لیکن ہرگز ہرگز ایسا وعدہ نہ کرتا
مگر انسان مستقبل سے بیخبر ہے اور کارپردازانِ قضا و قدر کا انتظام اسکی سمجھ سے باہر . . . . .
یہ ٹکڑا بہت طویل ہو گیا مگر ؎

دل تمام ہوا اور درد باقی ہے سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے
ابھی نہ جانے کیا کیا لکھنا باقی ہے۔ مجبوراً بادلِ ناخواستہ اس تذکرے کو اپنے دوست کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

دل کے داغوں میں جھلک اُن کی نظر آتی ہے جناب
بھولی سی جو صورتیں آنکھوں سے نہاں ہو گئیں ا

یہ حسرت ہے ہے زبان مجھے اُن کا ایک شعر اور یاد آیا!

گل صحبتیں ساری خواب کی سی باتیں ہیں دوستوں کے ملنے کو روح اب ترستی ہے!

یہ دونوں کے لیے ہے کیونکہ اگرچہ اسے ہم اُن کی نگاہِ التفات کے سزاوار نہیں مگر کیا عجب کہ ہمارے دوست کی روح کو ابھی اس دنیا کی یاد باقی ہو اور یہی حسرت اُدھر بھی ہو!

پروازِ خیال

(از جناب وحید الدین صاحب حمید مونسپل کمشنر لکھنؤ)

کہتے ہو تم کہ رازِ محبت عیاں نہ ہو — اچھا جو مجھ میں طاقتِ ضبطِ فغاں نہ ہو
اے ہم صفیر موسمِ گل کا بیاں نہ ہو — کُنجِ قفس میں تذکرۂ آشیاں نہ ہو
آئے گی ہر کسی کے لیے موت ایک دن — ممکن نہیں کہ تفرقۂ جسم و جاں نہ ہو
رسا ہے دیوی نہیں مسرتِ زمانِ قلق — بے برگ و بار شاخ کو خوفِ خزاں نہ ہو
تیرے بغیر عیش بھی سوہانِ روح ہے — جنت نہیں قبول اگر تو وہاں نہ ہو
نیری حد نشا سکے یہ کہتا ہے آسماں — روئے زمیں پہ کوئی وفا کا نشاں نہ ہو
لے جا سکے مجھے اُڑا کے وہاں بے بولے شوق — جس در کے آستاں پہ کوئی پاسباں نہ ہو
خود جذبِ شوق راہ کی سختی کرے گا سہل — نالاں ابھی سے اے جرسِ کارواں نہ ہو
ناآشنا مرنے والا بس اتنی ہی زندگی — کشتی ہے موت صبر کرو نوحہ خواں نہ ہو
سیرِ چمن سے اپنی غرض تھی نشاطِ روح — اے باغباں خدا کے لیے بدگماں نہ ہو
جھکو نہ دیکھنا یہ تصورِ نگاہ ہے — ایسا کوئی مقام نہیں تو جہاں نہ ہو

دیں اس غزل کی داد سخن فہم اگر حمید
تو اپنی خوں فشانی سب رائیگاں نہ ہو

دُلاری

محبت و بیگانگی کا ایک دلچسپ افسانہ

(از جناب ڈاکٹر محمد اعظم صاحب کریوی)

دلّی میں مشہور تھا کہ دُلاری چاوڑی بازار کی حور زادی لڑکی ہے۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال تھا کہ زہرا اس کی ماں نہیں ہے، بلکہ اُس نے دلاری کو لڑکپن سے پالا پوسا تھا۔ دُلاری کے والدین کا پتہ کسی کو نہ تھا لیکن اس کی صورت۔ بات چیت اور طرز معاشرت سے گمان کیا جاتا تھا کہ وہ کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی ہے۔ اسکے حُسن کا چرچا شہر بھر میں تھا حویلی میں وہ اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔ سب اسکے حُسن کے خریدار تھے لیکن کوئی ایسا نہ تھا جو اُسے پاپ سا گڑھے سے نکال کر اپنی سوسائٹی میں لینے کےلیے تیار ہو۔ لوگوں کیلیے وہ آگ کی اس تیز چنگاری کی طرح تھی جو سردی میں ہاتھ سینکنے کا تو کام دے سکتی ہے لیکن گھر میں جگہ دینے سے تمام گھر اور گھر کے ساز و سامان میں آگ لگنے اور بھسم ہو جانے کا ڈر رہتا ہے۔

دُلاری کا اس دنیا میں اپنا کوئی نہ تھا۔ بسر اوقات کے لیے اُسکے پاس دولت کی کمی نہ تھی۔ وہ فرصت کے اوقات میں یا تو کپڑوں پر بیل بوٹے کاڑھتی یا کتابیں پڑھا کرتی۔ سہ پہر کے وقت وہ اپنے بالاخانہ پر ایک بند کمرہ میں ستار کے ساتھ گھنٹوں کوئل کی طرح کوکا کرتی۔ کسی کو سنانے کے لیے نہیں بلکہ خود اپنا دل جلانے کے لیے۔ وہ اپنے نوکروں سے بہت کم باتیں کرتی تھی۔ دُنیا اُسے نفرت و شبہ کی نظروں سے دیکھتی تھی اور وہ بھی دنیا اور دنیا والوں سے متنفر تھی —— دُلاری کے حُسن و شباب کا زمانہ اسی طرح گذر رہا تھا۔

(۲)

فروری کا مہینہ اور سہ پہر کا وقت تھا۔ مس دلاری ایک خوشنما دوشالہ اوڑھے اپنے مکان کی سب سے اونچی چھت پر کھڑی چاندنی چوک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آج کسی بڑے افسر کا جلوس لال قلعہ سے نکل کر چاندنی چوک سے گزرنے والا تھا اس کے لیے بہت دنوں سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دلّی کے جس حصہ سے جلوس نکلنے والا تھا وہ خوب سجایا گیا تھا۔ چاندنی چوک میں جلوس پہونچنے کا وقت ساڑھے چار بجے کا تھا۔ دُلاری اسی جلوس کو دیکھنے کے لیے چھت پر کھڑی تھی چوک سے اس کا مکان کچھ دور تھا پھر بھی اسکی چھت سے بازار کا کچھ حصہ دکھائی دیتا تھا۔ ۵ بجے کے قریب انگریزی بینڈ کی آواز گونجی اور چاروں طرف ہلچل مچ گئی۔ بازار میں جلوس آگیا لیکن مکان کے آڑ میں ہونے کی وجہ سے دُلاری، دل کو اچھی طرح

ہو گئی تھی۔ وہ صرف شور و غل ہی سن رہی
تھی کہ یکایک اسے پہلے کی سی آواز سنائی دی۔ کچھ
دھواں آسمان کی طرف اٹھتا نظر آیا اور پھر ——
دوڑو —— پکڑو —— پکڑو —— کی آوازیں سنے
لگیں۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے معلوم ہوتا تھا کہ سوار دو
سا بھی دوڑ رہے ہیں سے ڈولارس کا دل دھڑکنے
لگا۔ حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے بیتاب ہو گئی۔
گھبراہٹ میں وہ اپنے کسی نوکر کو بھی آواز نہ دے
سکی۔ دوڑتی ہوئی نیچے والی منزل میں
پہنچی۔ جب وہ اوپر گئی تھی تو اپنے کمرہ کا دروازہ کھلا
چھوڑ گئی تھی۔ واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ دروازہ
بند ہے ... دروازہ کھول کر اندر گئی تو یہ دیکھ کر کہ پردہ
کے پیچھے کوئی چھپا کھڑا ہے وہ سہم گئی ... وہ اپنی کسی
خادمہ کو پکارنے والی ہی تھی کہ پردہ ہٹا اور اس کے
پیچھے سے ایک حسین خوبرو نوجوان باہر نکلا اور اس نے
ڈولارس کو آداب عرض کیا۔ جب تک پردہ ہٹا وہ
خوف زدہ تھی لیکن پردہ دور ہوتے ہی ڈولارس کی
گھبراہٹ جاتی رہی اس نے نہایت نرمی سے
دریافت کیا۔ —— "تم کون ہو"

"ایک خونی!"

اس نوجوان کا چہرہ "خونی" کا سا نہیں معلوم ہو رہا تھا
ڈولارس نے کہا .. دریافت کیا "کیا میرا خون کرنے
آئے ہو"

نوجوان نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا!
—— نہیں ہرگز نہیں۔

"تو تم خونی کیسے ہوئے"

"ابھی میں نے ایک خون کیا ہے"

"کس کا خون؟"

"جس کا سرکار جلوس نکال رہی تھی"

ڈولارس کے ہوش اڑ گئے۔ کیا واقعی اس آدمی نے
ابھی کسی کا خون کیا ہے کیا ایسا خوبرو نوجوان کسی
کا خون بھی کر سکتا ہے اور خون بھی اپنے اعلیٰ افسر
کا جس کو چاروں طرف سے گوری اور کالی فوجیں
اپنے حلقہ میں لیے ہوئے تھیں ڈولارس کو یقین نہ آیا
اس نے سوچا کہیں یہ شخص پاگل تو نہیں ہے۔ لیکن
پھر اسے یاد آیا کہ جب وہ چھت پر تھی تو زور کا دھماکا
ہوا تھا اور "پکڑو" "پکڑو" کی آوازیں بھی آئی تھیں اور
اب تک چاندنی چوک میں شور و غل ہو رہا تھا۔ وہ تھوڑی
دیر تک نوجوان کی طرف حیرت آمیز نظروں سے دیکھتی
رہی اور پھر پوچھا۔ "تم نے کس طرح خون کیا؟"
اس نوجوان نے جواب دیا "بم پھینک کر" تھوڑی
دیر خاموش رہ کر اس نے پھر کہنا شروع کیا۔۔۔
"میں آپ کا مکان کئی سال سے جانتا ہوں۔ مجھے
یہ بھی معلوم تھا کہ آپ کے اس خاص کمرہ میں کوئی
دوسرا آدمی نہیں آسکتا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ بم
پھینکنے کے بعد اگر میں اس کمرہ میں امان پا گیا تو
پھر پولیس مجھے گرفتار نہ کر سکے گی۔ گو اس سے پہلے
میرا آپ سے تعارف نہ تھا پھر بھی مجھے آپ کے
اخلاق سے یہ توقع امید تھی کہ اگر میں آپ کے
مکان میں پہنچ کر آپ سے امان کا طلبگار ہوں گا تو

آپ انکار نہ کریں گی۔"

ڈولاری کو نوجوان کی باتیں عجیب معلوم ہوئیں۔ وہ دنیا سے متنفر تھی لیکن آج اس نوجوان کی شائستہ و مہذب گفتگو سن کر اُسے ایک نیا تجربہ حاصل ہوا۔ اُس کے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ دنیا والے اُسکے حُسن کے طلبگار تھے لیکن اس نوجوان کا معاملہ برعکس تھا وہ تو امان چاہتا تھا۔ ڈولاری نے پوچھا — "تم بلا خطا قصور کسی کا خون کیوں کرتے ہو۔ یہ تو نہایت شرمناک بات ہے"

نوجوان سوچنے لگا — "کیا میں اپنی انجمن کا بھید بتا دوں — کہیں یہ عورت پولیس سے نہ کہہ دے — بازاری عورت کا اعتبار ہی کیا۔ مگر اُسے کچھ پروا نہیں —" اُس نے جواب دیا — "کیونکہ یہ بھارت ورش ہمارا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ یہاں غیر ملکی راج کریں۔ غیر ملکیوں کے خون بہانے سے ایشور خوش ہوگا"

ڈولاری نے متانت سے کہا — "یہ تمہاری غلطی ہے۔ غیر ملکی بھی ہماری ہی طرح انسان ہیں انسان کا خون بہانا کسی مذہب میں روا نہیں۔ تم ایک خون کرو گے تو اسکے بدلے میں دس بیگناہوں کا خون ہوگا۔ ایشور فساد سے راج نہیں دلا کرتا۔ تم اپنی ان حرکتوں سے پاک ہندوستان کو بدنام کر رہے ہو شرم! شرم!!"

نوجوان نے ہنس کر کہا "تم ابھی سیاست سے ناواقف ہو ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی ہو"

ڈولاری [illegible] — "میں ایسی خونی سیاست سے ناواقف ہی رہنا پسند کرتی ہوں۔ خیر جانے دو کیا تم اپنا نام بتا سکتے ہو؟"

"میرا نام مہیش ہے"

ڈولاری نے پھر مسکرا کر پوچھا — "اچھا خونی صاحب اب کیا صلاح ہے"

مہیش نے پہلی بار ڈولاری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا — "کیا آپ مجھے صرف آج اپنے کمرہ میں رہنے کی اجازت دے سکتی ہیں"

ڈولاری نے ٹوک کر کہا "مجھے "آپ" کے بجائے تم سے مخاطب کیجیے"

مہیش کی رگوں میں گویا بجلی دوڑ گئی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے کھو گیا۔ اُسے چپ دیکھ کر ڈولاری نے کہا "تم بڑی خوشی سے میرے یہاں ٹھہر سکتے ہو" مہیش خاموش تھا شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ "ٹھہروں یا چلا جاؤں" باہر نکلنے میں اُسے پولیس کا خوف تھا اور ٹھہرنے میں وہ خود اپنے آپ سے ڈر رہا تھا اس کو اپنے دل پر قابو نہ تھا۔ وہ اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ ڈولاری نے اُسے پاس والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

(۳)

انسان وہم و خیال کا پُتلا ہے۔ گو وہ خوب سمجھ کر ایک راہ اختیار کرتا ہے پھر بھی وہم میں مبتلا ہو کر کسی دوسری راہ چلا جاتا ہے۔ مہیش کسی انقلابی جماعت کا رکن تھا۔ کسی اعلیٰ افسر پر بم پھینکنے کے لیے وہ خاص طور سے مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ مہیش نے بھی ٹھیک موقع پر بم پھینکا اور بڑی پھرتی سے پہلے سے طے کی ہوئی جگہ یعنی ڈولاری کے خاص کمرہ میں جا چھپا جہاں

وہ بھی کسی کی بُری نظروں سے بچ گیا۔ دُلاری کا مکان
جانوں چوک سے اتنی دُور تھا کہ کسی کو شک ہی نہیں
ہو سکتا تھا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن دُلاری کے
مکان پر پہنچ کر مہیش ایک نئی اُلجھن میں پڑ گیا۔ جسے
وہ ایک طوائف کی لڑکی سمجھتا تھا وہی اب اسکی
نظروں میں دیوی معلوم ہونے لگی وہ انقلابی جماعت
کا رکن تھا محبت اور پریم سے اُسے نفرت تھی وہ
ان چاؤں کو انسان کی بڑی کمزوری سمجھتا تھا جنت
جانا ہی اس کی زندگی کا مقصد تھا لیکن دُلاری
سے مل کر اُسے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ دُنیا کا سب سے
قابل تعریف جذبہ محبت اور پریم ہی میں پوشیدہ
ہے محبت کے بغیر دُنیا میں لطف نہیں۔ اس کی
آنکھوں کے سامنے سے گویا ایک پردہ ہٹ گیا۔
پہلے کی وہ دُنیا جسے وہ پھیکی اور بے رس سمجھتا تھا
اب ایک نئے روپ میں دکھائی دینے لگی وہ
انقلابی جماعت کی قسم اور عہد و پیمان کو بھی بھول گیا۔
دو دن تک دُلاری اور مہیش ایک ساتھ رہے
اس قلیل عرصہ میں دونوں میں ایسی محبت ہو گئی جو
برسوں میں بھی نہیں ہوتی۔ ان دو ہی دنوں میں
دُلاری کی کایا پلٹ ہو گئی۔ گھر کی مائیں متحیر تھیں
کہ "ملکن" کو کیا ہو گیا۔ گو دُلاری نے مہیش کو بہت
پوشیدہ رکھا تھا پھر بھی اس کا راز ایک نائکہ "تھیا"
سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ تھیا نے مہیش کا ذکر دوسری
ماماؤں سے کر دیا اور پھر ان میں کانا پھوسی ہونے
لگی اور اُنھوں نے سمجھ لیا کہ اب "ملکن" بھی اپنی ماں
"آما" کا پیشہ اختیار کرنے والی ہیں۔

دو دن کے بعد رات کے وقت مہیش دُلاری سے
رخصت ہو کر گورکھپور چلا گیا۔ چلتے وقت اس نے
بطور یادگار ایک انگوٹھی جس پر اُس کا نام کھدا ہوا
تھا دُلاری کو نذر کی اور دُلاری کو اپنا پوشیدہ پتہ
بھی بتا دیا حالانکہ انقلابی جماعت میں یہ سخت جرم تھا۔

مہیش اچانک ایک نو وارد کی طرح دُلاری
کے مکان میں آیا اور دو دن کے بعد وہ ہمیشہ کے
لیے اُسے یادگار چھوڑ گیا۔ یہ یاد دُلاری کے لیے کلفت
تھی یا آرام کا باعث۔ یہ بتانا مشکل ہے۔

(۴)

ایک تہ خانہ میں انقلابی جماعت کے تیرہ[۱۳] ارکان
موم بتی کی روشنی میں بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔
جب ان کی جماعت کا کوئی رکن کوئی خاص کام سرانجام
دیتا تھا تو وہ اسی مقام پر اس سے پورا حال سنتے
تھے آج مہیش کی باری تھی وہ دلی میں افسر کا خون کر کے
آیا تھا اسی کا حال سننے کے لیے انقلابی جماعت کا جلسہ تھا۔ یہ
تہ خانہ ایک غیر آباد جنگل میں تھا جلسہ شروع ہونے سے پہلے
سب ارکان قسم کھاتے تھے کہ "ہم گزشتہ جلسے سے
آج تک بالکل پاک رہے ہیں اور ہم نے اپنی
جماعت کا کوئی بھید کسی سے نہیں کہا ہے" آج
بھی حسب معمول سب ارکان باری باری قسمیں کھانے
لگے آخیر میں مہیش کی باری تھی سب نے دیکھا
کہ مہیش کی زبان لڑکھڑا رہی ہے۔ انھوں نے سمجھا
کہ شاید خون کا ڈر یا گناہ کا خیال اس پر طاری ہے۔

...سکی اجازت ملنے پر مہیش اپنے کام کی کہانی سنانے لگا۔ ... کے بعد بھاگنے تک کا حال تو اس نے ... کہا پھر اس سے کہنا شروع کیا "چونکہ میں ... بھیس میں تھا مجھے کوئی نہ پہچان سکا۔ ہر طرف چاروں طرف "پکڑو" "پکڑو" کا شور تھا۔ میں اطمینان سے چاندنی چوک سے لال قلعہ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔" اتنا سن کر سب ہنس پڑے۔ صدر نے کہا "پولیس کتنی بے وقوف ہے" مہیش نے پھر کہنا شروع کیا "خیر میں تو بڑے آرام سے لال قلعہ کے پاس پہنچ گیا اور ادھر فوجی سواروں نے چاندنی چوک کے تمام مکانوں کو گھیر لیا۔ میں لال قلعہ سے بائیں جانب ریلوے لائن کی طرف مڑا ہی تھا کہ قلعہ سے قریباً دو سو فوجی گورے ہاتھوں میں بندوقیں لیے باہر نکلے۔ میں ایک لمحہ کے لیے کچھ گھبرایا لیکن پھر سنبھل گیا اور میں نے بلند آواز سے انگریزی میں کہا۔ "دوڑو، دوڑو۔ جنرل صاحب کا خون ہو گیا" یہ سنتے ہی گورے بے تحاشہ چاندنی چوک کی طرف دوڑ پڑے" سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ مہیش کہنے لگا "ان گوروں کو چاندنی چوک کی طرف بھاگتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی پھر اپنے بچاؤ کی فکر پڑ گئی۔ اتفاقاً میری نظر شراب کے ایک خالی کاٹھ کے پیپے پر پڑی جو قلعہ کے پاس ایک خندق میں پڑا تھا۔ میں آہستہ آہستہ خندق میں اترا اور اس خالی پیپے میں گھس گیا۔ میرے حق میں یہ بہت اچھا ہوا کیونکہ تھوڑی ہی دیر میں مجھے ادھر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ میں اسی پیپے میں برابر دو دن دم سادھے پڑا رہا اور موقع ملتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ یہیں میری حکایت ختم ہو گئی۔"

سب ارکان نے مہیش کو شاباشی دی۔ صدر نے خاص طور سے تعریف کی پھر بھی مہیش کے چہرہ پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ سکا۔ تمام ارکان نے اسکی طرف حیرت سے دیکھا۔ صدر نے اسکے چہرہ کی طرف غور سے دیکھ کر کہا "کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟" مہیش کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس نے صرف سر ہلا دیا۔ اسکے بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔

(۵)

مہیش سے ڈلاری کی پھر ملاقات نہ ہو سکی۔ کبھی کبھی ڈلاری کا خط آ جاتا تھا لیکن براہ راست نہیں۔ لفافہ کے بجائے اسکو بذریعہ پارسل خطوط ملا کرتے تھے اور مہیش بھی اسی طرح جواب دیتا تھا۔ کچھ عرصہ تک تو ڈلاری کو مہیش کے خطوط ملتے رہے پھر یکبارگی بند ہو گئے۔ وہ روزانہ پارسل کی راہ دیکھا کرتی لیکن اب اسکے نام کوئی پارسل نہ آتا تھا۔ شک و شبہہ کی وجہ سے وہ ڈاکیہ سے بھی کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کرتی تھی وہ اکثر سوچا کرتی "کہیں مہیش کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گیا" مہیش کے جرم کا خیال آتے ہی وہ خوف کے مارے کانپنے لگتی۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ مہیش نے قصداً اس سے خط و کتابت بند کر دی ہے جس دن مہیش نے جلسہ میں قسم کھا کر اپنے صدر کے سامنے جھوٹی باتیں بنائیں اسی دن سے مہیش کا دل اسے ملامت کرنے لگا۔ گو انقلابی جماعت میں اب مہیش قدر کی

نظروں سے دیکھا جاتا تھا سدا بھی اسکی بڑی عزت
کرتے تھے لیکن شیری کی سزا نے حمید کو اس
سے لگا وہ سوچتا تھا۔ "آہ، میں اپنے مدد نہ کر
نہ دہ سکا" دوسروں کی نگاہوں میں اس کی عزت تھی۔
لیکن خود اپنی نگاہوں میں وہ ذلیل ہو گیا تھا۔ دلاری
کی یاد آتے ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا
تھا اس وجہ سے اس نے دلاری سے خط و کتابت
بند کر دی تھی۔

محبت والے اسے حمید کے دل کی کمزوری کہہ
سکتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ اس کی ناتجربہ کاری تھی۔

(۶)

جلوس پر بم پھینک کر مجرم کا صاف بچ نکلنا
تعجب سے خالی نہ تھا۔ خفیہ پولیس بڑی محنت و کوشش
سے تفتیش کر رہی تھی۔ ہندوستان کے نامی گرامی
تجربہ کار خفیہ پولیس کے افسر دلی میں آگئے تھے۔
تقریباً تین سو نوجوان بھی شبہ میں گرفتار کیے جا چکے تھے
لطف یہ کہ صرف شہر دلی میں گیارہ گھروں سے بم اور
بم بنانے کا سامان بھی برآمد کر لیا گیا تھا۔ کئی ایسے
کاغذات بھی تلاشی میں مل گئے تھے جن کی مدد سے میرٹھ
لکھنؤ اور بلیا کے بھی کچھ نوجوان گرفتار کر لیے گئے
تھے۔ ثبوت میں میرٹھ کے ایک نوجوان کا خط پیش کیا
جاتا تھا جس میں لکھا تھا "گھر والوں نے قو کو بچے کا
بڑا خوف بنا دیا ہے اب اسکو ایک خوبصورت بلا
لے دو تب بھی وہ تمہاری بات نہ مانے گا"
پولیس نے اس خط میں "بچے" کا مطلب "بم"
اور "قو" کا مطلب "سرکاری افسر" نکالا اس کا ثبوت
یہ تھا کہ یہ خط اس نوجوان کے کیش بکس سے نکلا تھا
پولیس کہتی تھی کہ اگر "بچے" کا مطلب "بم" نہیں تو
اس معمولی خط کو کیش بکس میں رکھنے کی کیا ضرورت
تھی۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا، مگر خفیہ پولیس کا اعلیٰ
افسر خوش نہ تھا اس کا خیال تھا کہ پولیس اپنی
چالاکی سے جھوٹا مقدمہ بنا رہی ہے پھر بھی وہ "بم"
والے حادثے سے اتنا ناراض تھے کہ اصل مجرم نہ سہی
تو مشتبہ اشخاص ہی سے انتقام لے رہے تھے۔ دہلی
کا غصہ گدھوں پر نکل رہا تھا۔ جس طرح اسکول کا ماسٹر
اپنی بیوی سے لڑ کر اس کا غصہ اپنے شاگردوں پر اتارتا
ہے اسی طرح پولیس اپنا انتقام معصوم لوگوں سے
لے رہی تھی اس کا خیال تھا کہ انقلابی جماعت والے
ان نوجوانوں سے سازباز رکھتے ہیں۔

خفیہ پولیس کے افسروں میں مسٹر بوس بہت مشہور
تھے۔ ان کی ماتحتی میں کرشنا کانت نام کا ایک ہنس مکھ
اور پر مذاق نوجوان کام کرتا تھا۔ کرشنا کانت پہلے کسی
تھیٹریکل کمپنی میں مسخرہ کا پارٹ کیا کرتا تھا بعد میں وہ
مسٹر بوس کی مہربانی سے خفیہ پولیس میں ایک جگہ پا گیا
بم والے کیس میں مسٹر بوس بھی بھکاری کے بھیس میں
تفتیش کرتے پھرتے تھے۔ رات کو دونوں ایک جگہ
ملتے اور دن بھر کی رپورٹ مکمل کرتے۔

ایک دن کرشنا کانت نے مسٹر بوس سے کہا کہ
جس دن جلوس پر بم پھینکا گیا تھا اسی دن ملک دلاری
کے یہاں ایک خوبصورت نوجوان ٹھہرا تھا۔ وہ دن

[illegible] کہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا
[illegible] "کون دلاری؟" کرشنا کانت
نے [illegible] پتہ بتا دیا۔ مسٹر بوس دلاری
کے حالات زندگی سے بخوبی واقف تھے۔ تاہم
ان کو شناسائی تھی لیکن یہ بات انھوں نے کرشنا کانت
سے نہ کہی۔ دوسرے دن مسٹر بوس بھکاری کے بھیس
میں دلاری کے مکان کے سامنے پہنچے۔
دلاری اس وقت کھڑکی کے پاس بیٹھی کسی خیال میں
محو تھی۔ مسٹر بوس آج سے دو سال پہلے اسے دیکھ
چکے تھے۔ ان کی تیز نظر نے پہچان لیا کہ
آج کی دلاری پہلے کی دلاری نہیں ہے۔ انھوں نے
ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اسی وقت دلاری نے
سر کا آنچل ٹھیک کرنے کے لیے اپنا داہنا ہاتھ اٹھایا
مسٹر بوس نے بڑی خوشی کے ساتھ دیکھا کہ وہ کلمہ کی
انگلی میں ایک خوشنما طلائی انگشتری پہنے ہوئے ہے۔
وہ دل ہی دل میں کچھ سوچتے ہوئے اپنی قیام گاہ
کی طرف واپس گئے۔

(۷)

اس واقعے کے ایک ہفتہ کے بعد دلاری کی انگلی
سے وہ انگوٹھی کھو گئی۔ ان دنوں دلاری کے یہاں
ایک نئی خادمہ ملازم ہوئی تھی۔ یہ بہت غریب اور
نیک تھی اس وجہ سے اس پر کسی قسم کا شک نہ کیا
گیا۔ انگوٹھی کھو جانے سے دلاری کے دل کو سخت
صدمہ پہنچا۔ اسکو خبر بھی نہ ہوئی کہ وہ انگوٹھی مسٹر
بوس کے پاس پہنچ گئی۔

مسٹر بوس نے جب انگوٹھی پر مہیش چندر کا نام کھدا
دیکھا تو انھوں نے اپنی ڈائری دیکھی اس میں مہیش چندر
کا نام بھی انقلابی جماعت کے ارکان میں درج تھا۔
مہیش چندر کے متعلق لکھا تھا۔ "خوبصورت، تندرست
جوشیلا نوجوان ہے حکومت کا جانی دشمن ہے۔" مسٹر
بوس اس انکشاف سے بہت خوش ہوئے۔ انکو
یقین ہو گیا کہ بم والے کیس میں مہیش چندر ضرور شریک
ہے۔ لیکن اس کا پتہ کیسے چلے؟ ان کی سمجھ سے
باہر تھا۔ وہ دو دن تک اسی فکر میں مبتلا رہے۔ وہ
بخوبی جانتے تھے کہ دلاری کا دل بہت نازک ہے
طوائفیں دولت کی پجاری ہوتی ہیں دولت کی
لالچ میں وہ بہت آسانی سے دنیا کا راز بتا سکتی
ہیں لیکن دلاری نے طوائفوں میں پرورش پا کر بھی
طوائف کا دل نہیں پایا تھا۔ وہ دولت کی
لالچ یا دھمکی سے مہیش کے متعلق ہرگز کوئی بات نہ
بتائے گی۔ جن دلوں پر لالچ اور خوف کا اثر نہیں
ہوتا ان پر قابو پانا آسان نہیں ہے۔

خفیہ والوں کا طوائفوں سے بہت کام نکلتا رہتا
ہے۔ دلاری کی فرضی ماں "تارا" سے مسٹر بوس کی
خوب شناسائی تھی۔ ان دنوں دلاری طفلی کے گہوارہ
میں جھول رہی تھی۔ اس وقت بھی دلاری شرم و
حیا کی پتلی تھی۔ مسٹر بوس دلاری کو بڑی عزت کی نظر
سے دیکھا کرتے تھے۔ جب دلاری نے حسن و شباب
کے سہانے سبزہ زار میں قدم رکھا اور وہ دنیا والوں
سے الگ ہو کر رہنے لگی تو مسٹر بوس کے دل میں دلاری

ڈالی کے بیہوش ہوتے ہی اس کی خادماؤں نے اسے گھیر لیا۔ وہ بیہوشی کے عالم میں بڑبڑا رہی تھی —— دھوکا —— فریب —— مرد بڑا بے وفا اور دھوکے باز ہوتا ہے —— اسی بڑبڑانے میں ڈالی کی زبان سے ہیش کا پورا پتہ بھی نکل گیا۔

اس واقعہ کے ایک مہینے کے بعد ہی اخبارات میں شائع ہوا کہ ہیش چندر اپنے کچھ ساتھیوں کے گورکھپور میں گرفتار ہو گیا ہے —— لیکن یہ کون جانے کہ ڈالی اس دنیا میں موجود نہ تھی اس سے پیشتر ہی محبت وہ گناہ کا شکار ہو کر وہ محبت دوسری دنیا میں پہنچ چکی تھی جہاں وہ چندر سے ملنے کا انتظار کر رہی تھی۔

(وشال بھارت)

قطعہ تاریخ وفات خیام العصر حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم

(از جناب شیخ بنے میاں صاحب جوہر جامعہ دہلی)

کیا کروں میں بیاں ریاض احمد | ہوں ترا نوحہ خواں ریاض احمد
چھٹ گیا ہم سے عمر بھر کے لیے | ہائے جادو بیاں ریاض احمد
اپنی قسمت پہ کیوں نہ روئے ہند | اب ہے تجھ سا کہاں ریاض احمد
وہ جو وجہ فروغ اردو تھا | اٹھ گیا مہرباں ریاض احمد
ملک میں ہے بپا ترا ماتم | سب ہیں محو فغاں ریاض احمد
اپنی کاوش کی داد کس سے لیں! | ہیں کہاں قدرداں ریاض احمد
تیرا اردو کو چھوڑ کر جانا | ہے بڑا ہی زیاں ریاض احمد
تجھ سے قائم تھا نظم ملک سخن | تو ہی تھا حکمراں ریاض احمد
اب کہاں لطف شعر گوئی کا | نہیں شیریں بیاں ریاض احمد
ہیں گرفتار رنج و غم ادبا | گیا یارب کہاں ریاض احمد
تجھ سے تھی خاص و عام کو الفت | تھا حبیب جہاں ریاض احمد
پھر تسکیں تو آ تصور میں | قلب ہے نیم جاں ریاض احمد
سال رحلت گواہ ہے جوہر | ہے مکین جناں ریاض احمد

۱۳۵۳ھ

عورت

(از جناب مولوی سید کلب محمد صاحب باقی ہانسوی)

مقصود نگاہ اہل بینش — سرمایۂ ناز آفرینش
جنت ہے مراد تیرے دم سے — دل ہے تو ہے شاد تیرے دم سے
تسکین کو اضطراب کر دے — تو چاہے تو انقلاب کر دے
پردہ ترا شوق آفریں ہے — جلوہ ترا ذوق آفریں ہے

اللہ یہ شان دل نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

تکمیل دل انتظار تیرا — اہل جہاں تمنا ر تیرا
ہے غیر سے دلبری دلیری — دل چھین لیا نگاہ پھیری
تم نے جب یہ خطا کہیں کی — تیری طرف التفات نہیں کی
دی تو نے سزا کہ مار ڈالا — آنچل سر کا دیا سنبھالا

اللہ یہ شان دل نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

فرمائش سوز و ساز تیرا — ایمائے نیاز و ناز تیرا
بیگانہ وشی ہے آشنائی — ہر سعی حجاب خود نمائی
منہ پھیرے ہوئے کشادہ کاکل — دنیا کے وجود سے تجاہل
پھیلا ہوا دل کے واسطے جال — حیلہ کہ سکھائے جاتے ہیں بال

اللہ یہ شان دل نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

جب تو نے کہیں یہ حال دیکھا — ہے تیر نظر کا دل کو یارا
بس بن گئی ایک بت مصور — ایسی کہ شکار ہو نہ پائے
گردن موڑی، نظر جھکائی — سینہ ڈھکا، لجائی

ہندو مسلمانوں میں اتحاد کیونکر ہو سکتا ہے؟

کانپور کی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشیں

(از ظفر الملک)

(۱)

۱: مورخہ کو مارچ ۱۹۳۱ء کے تیسرے ہفتہ میں کانپور کے ہندو مسلمانوں میں کئی روز تک لڑائی ہوتی رہی۔ جس میں دونوں فرقوں کے سیکڑوں مرد، زن اور بچے ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ جابجا مسجدوں، مندروں اور مکانوں کے جلنے، لٹنے اور مسمار ہو جانے سے لاکھوں روپے کی املاک برباد ہوئی اور لوٹ مار کا بازار گرم رہنے سے جو مالی نقصان ہوا اس کا صحیح اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس اُسی زمانے میں کراچی میں ہو رہا تھا۔ اس ہولناک حادثہ کی خبروں سے متاثر ہو کر کانگریس نے بنارس کے مشہور فلسفی ڈاکٹر بھگوان داس کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جس کے اراکین پنڈت پرشوتم داس ٹنڈن، مسٹر تصدق احمد خاں شروانی، خواجہ عبدالمجید، راقم السطور ظفر الملک اور سکرٹری پنڈت سندر لال تھے۔ شروانی صاحب اور خواجہ صاحب نے عدیم الفرصتی کی بنا پر کمیٹی میں شرکت سے معذوری ظاہر کی تو ڈاکٹر بھگوان داس صاحب نے اراکین موجودہ کے مشورہ اور کانگریس کے صدر سردار ولبھ بھائی پٹیل کی منظوری سے ان کے بجائے مسٹر منظر علی سوختہ اور عبداللطیف صاحب بجنوری کو نامزد کیا۔

ملک کے مختلف حصوں میں اس سے پیشتر ہندو مسلمانوں کے درمیان لڑائیاں ہو چکی تھیں لیکن ایسا سنگین حادثہ کبھی پیش نہیں آیا تھا اور کانگریس کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنی ذمہ داری محسوس کر کے تحقیقات کے لیے کمیٹی مقرر کی۔ ان حالات کی اہمیت پر نظر کر کے کمیٹی نے یہ رائے قائم کی کہ سرسری طور پر محض اس حادثہ کی تحقیقات پر قناعت نہ کی جائے بلکہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات کی پوری چھان بین کر کے حقیقی وجوہ اختلافات دریافت کیے جائیں اور غور و فکر کے بعد ایسی تجاویز مرتب کی جائیں جن پر عمل پیرا ہو کر اہل ملک اس مصیبت عظمیٰ سے نجات حاصل کر سکیں۔ اس لیے کمیٹی نے سوالات کی ایک طولانی فہرست مرتب کی اور کانپور کے ہر طبقہ اور فرقہ کے سربرآوردہ افراد کی خدمت

میں بھیجکر ان سے درخواست کی کہ وہ تحریری جوابات ارسال کریں اور کمیٹی کے روبرو اپنی زبانی شہادت قلمبند کرائیں۔

کمیٹی کے اراکین نے ۷۰ ہفتے تک شہر میں گشت کرکے نقصان زدہ مقامات کا معائنہ کرنے، مختلف طبقوں کے اشخاص سے ملنے اور شہر کی عام فضا کو سابق حالت پر لانے کی سعی کرنے کے علاوہ سیکڑوں تحریری بیانات حاصل کیے اور روزانہ مسلسل پانچ گھنٹے تک گیا پرشاد پبلک لائبریری کے ایک حصہ میں عام اجلاس کرکے تقریباً ڈیڑھ سو اصحاب کی شہادتیں قلمبند کیں۔ اور کانپور میں کام ختم کرنے کے بعد بنارس میں کئی مہینے صرف کرکے اپنی رپورٹ مرتب کی۔ یہ ضخیم رپورٹ انگریزی میں تھی۔ اور کانگرس کی جانب سے اپریل ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ مگر تھوڑے ہی سے نسخے تقسیم ہونے پائے تھے کہ حکومتِ صوبجاتِ متحدہ کے حکم سے پولیس نے بقیہ کل نسخے ضبط کر لیے اور اس طرح نہ صرف تحقیقاتی کمیٹی کی چھ مہینے کی محنت اور کانگرس کا ہزاروں روپیہ برباد ہو گیا بلکہ اہل ملک اُن قیمتی اور مفید معلومات سے بھی محروم ہو گئے جو اس رپورٹ کے اوراق میں جمع کی گئی تھی —

رپورٹ کے تین حصے تھے۔ ایک حصہ میں مسلمانوں کے ہندوستان میں وارد ہونے کے زمانے سے عہد حاضر تک ہندو مسلمانوں کے تعلقات کی تاریخ درج کرکے وہ اسباب نمایاں کیے گئے تھے جو باہمی اختلافات کا باعث ہوئے اور جنکی بدولت آئے دن ہندو مسلمانوں کے درمیان لڑائیاں ہوا کرتی ہیں۔

دوسرے حصہ میں حادثۂ کانپور کے ابتدائی و بنیادی اسباب وعلل بیان کرکے لڑائی کے دوران میں جو حالات پیش آئے اُن پر تبصرہ کیا گیا اور اُسکے ہولناک نتائج دکھائے گئے تھے۔

تیسرے حصہ میں وہ سفارشیں تھیں جن پر عمل کیا جائے تو کمیٹی کی رائے میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات باہمی پر خوشگوار اثر پڑے گا اور اس قسم کے حادثات کا بڑی حد تک سدباب ہو جائے گا۔

اسکے علاوہ رپورٹ میں متعدد ضمیمہ جات تھے جن میں نقصانات جانی کے اعداد وشمار، شکستہ اور مسمار شدہ عمارات کی تعداد، مختلف مواقع کی عکسی تصاویر اور بہت سی دوسری تفصیلات فراہم کی گئی تھیں۔ نیز بعض اراکین کی اختلافی تحریریں اور صاحب صدر کی یادداشتیں وغیرہ تھیں۔

رپورٹ کا پہلا اور دوسرا حصہ ممکن ہے کہ حکومت اور اُسکے عمال کے لیے ناقابل برداشت ہو لیکن تیسرا حصہ جس میں کمیٹی کی سفارشیں تھیں ایسا نہ تھا کہ اُس سے حکومت پر کوئی زد پڑتی۔ کیونکہ انہیں تمامتر اہل ملک یا خود کانگرس سے خطاب تھا۔ اور اس کا مقصد واحد یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے

درمیان جو تلخی، منافرت اور بے اعتمادی پیدا ہو گئی ہے مناسب طریقوں سے اُنکا دفعیہ کر کے صلح و آشتی، اتفاق و اتحاد کی فضا پیدا کی جائے۔

اسی سبب سے باوجودیکہ رپورٹ کا کوئی مطبوعہ نسخہ راقم الحروف تک نہیں پہونچ سکا اُن کاغذات کی مدد سے جو رپورٹ کی ترتیب کے دوران میں ہم پہونچتے رہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہل ملک تک کمیٹی کی تجویزات پہونچا دی جائیں اور یہ امید بیجا نہ ہوگی کہ ملک کے وہ گروہ جو ہندوستان کی دونوں بڑی قوموں میں اتحاد و اتفاق دیکھنا چاہتے ہیں ان سفارشات کو ملک میں عام طور پر مشتہر کرنے میں دریغ نہ کرینگے

قبل اس کے کہ کمیٹی کی سفارشیں معرض تحریر میں لائی جائیں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ رپورٹ کا دوسرا حصہ جو کانپور کے واقعات سے متعلق تھا اُسکے بارے میں کمیٹی کے ارکان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ پہلے حصے کے بعض جزئیات سے راقم الحروف کو اختلاف تھا جسے حواشی کی صورت میں کہیں کہیں ظاہر کر دینا ضروری سمجھا گیا اور ایک دوسرے رکن کو تاریخی حصہ کے اس جزو کو رپورٹ میں شامل کرنے سے اختلاف تھا بلکہ کہا جاتا ہے کہ اسی اختلاف سے متاثر ہو کر گورنمنٹ یو۔پی کے بعض صاحب نے رپورٹ کو ضبط کرانے کے لیے خفیہ ریشہ دوانیاں کیں واللہ اعلم۔ تیسرے جزو یعنی ان سفارشات کے بارے میں جنکی اشاعت فی الحال مقصود ہے کافی اختلاف رہا جسکے اظہار کے لیے کمیٹی کے صدر بابو پرشوتم داس ٹنڈن اور کاتب الحروف نے علیحدہ علیحدہ یادداشتیں مرتب کیں۔

کمیٹی کی سفارشات تین قسم کی ہیں:

(الف) مذہبی و تعلیمی

(ب) سیاسی و اقتصادی

(ج) تمدنی و معاشرتی

یہ سفارشات پہلے اسی ترتیب سے درج کی جائیں گی اُسکے بعد اختلافی یادداشتوں کے وہ حصے نقل کیے جائیں گے جن سے وجوہ و نوعیت اختلاف ظاہر ہو سکے اور آخر میں وہ تجاویز درج ہونگی جو انفرادی طور پر بعض ارکان نے اپنی یادداشتوں میں پیش کی تھیں۔

(الف) مذہبی و تعلیمی سفارشات

۱۔ ہمارا خیال ہے کہ مختلف مذہبی جماعتوں کے تعلقات کو بہتر بنانے میں بڑی مدد ملیگی اگر اُن بنیادی صداقتوں پر زور دیا جائے جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں اور لڑکوں کے قلوب، خصوصاً نوجوان

[illegible]

[illegible] ان مشترک صداقتوں کی طرف متوجہ کیے جائیں۔ ہماری رائے میں کانگریس کو [illegible]
[illegible] اور کتابوں کا ایک ایسا سلسلہ تیار کرانا چاہیے جس میں تا بامکان یہ بنیادی صداقتیں [illegible]
[illegible] اور جاذب نظر انداز بیان میں پیش کی جائیں تا کہ ان میں مختلف مذاہب کے صحیفوں سے
[illegible] ترجمے درج کیے جائیں۔ اس کے بعد اس امر کی سعی کی جائے کہ یہ کتابیں
تمام تعلیمی اداروں کے ابتدائی و ثانوی درجوں کے نصاب میں داخل ہو جائیں۔

اس قسم کی کتابوں کی ضرورت اُن سب مجیبوں ہندو، مسلمان اور عیسائی گواہوں نے تسلیم کی جن سے
اس مسئلہ پر رائے دریافت کی گئی تھی۔ صرف ایک صاحب مذبذب تھے۔

ہماری یہ بھی رائے ہے کہ کانگریس کو وقتاً فوقتاً سب جماعتوں کے مذہبی رہنماؤں کے نام اس مضمون
کی اپیلیں شائع کرنا چاہیے کہ وہ اپنے مواعظ میں سامعین کے روبرو جملہ مذاہب کی مشترک بنیادی
صداقتوں پر زور دیا کریں۔

(۲) اس سارے مسئلہ کے متعلق ہمارا جو نقطۂ خیال ہے اُس کی بنا پر ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نوجوانانِ ملک
کی تعلیم کے لیے جو فرقہ وارانہ ادارے قائم ہیں اُن کو قومی (مشترک) بنا دیا جائے کہ یہیں فرقہ وارانہ خیالات
کی تخم ریزی ہوتی ہے۔ اور سب کو معلوم ہے کہ جو لوگ غیر فرقہ وارانہ درس گاہوں میں ہندو مسلمان استادوں
کے زیر تعلیم رہے ہیں، ہندو مسلم تعلقات کے بارے میں بہ نسبت اُن لوگوں کے زیادہ وسیع النظر ہیں
جن کی تربیت علمی کی فضا میں ہوئی ہے اور جسے فرقہ وارانہ درس گاہوں سے جدا کرنا ممکن نہیں۔

اس بارے میں ہماری مستقل سفارشات حسب ذیل ہیں۔

(الف) آیندہ کوئی نیا مدرسہ ایسا نہ کھولا جائے جو ہندو، مسلمان، عیسائی یا کسی جماعت یا اُس کی کسی خاص شاخ
کے نام سے منسوب ہو۔

(ب) جہاں کہیں ممکن ہو موجودہ فرقہ وار درس گاہوں کے نام فوراً اس طریقہ پر تبدیل کر دیے جائیں کہ وہ فرقہ وار
نہ معلوم ہوں اور جہاں کچھ تاخیر ناگزیر ہو، جلد سے جلد یہ تبدیلی پیدا کرنے کی کارروائی عمل میں لائی جائے۔

(ج) دوسرے فرقوں کے افراد کو ان درس گاہوں کی حکمراں جماعت میں رفتہ رفتہ شامل کیا جائے اور ان کو
انتظام میں دخل دیا جائے۔

(د) تعلیم اور لیکچروں کا نصاب ایسا مرتب کیا جائے کہ فرقہ وارانہ زاویۂ نگاہ کے بجائے وسیع النظر قومی
و تمدنی (کلچرل) مطمح نظر پیدا ہو۔

(ہ) دوسرے فرقوں کے طلبا کو خاص طور پر ترغیب دے کر اپنے یہاں شریک کرنا چاہیے اور کسی خاص [illegible]

[illegible] جو نہایت اعلیٰ قسم موجود ہیں ان کو موقوف کر دیا جائے۔

(۲) تعطیلوں کے دوران میں چاہیے کہ بنارس ہندو یونیورسٹی اور قومی جامعہ، دلی کالج اور [illegible]
اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج اور ایسی ہی اسلامی درسگاہوں کے طلبہ خاص خاص موقعوں پر اہم
مواقع پر ہفتہ عشرہ کے لیے ایک دوسرے کو اپنے یہاں مدعو کیا کریں۔ ان ہنگامی ملاقاتوں سے طلبہ کو
لطف اور فائدہ حاصل ہوگا۔ اور نیز ان درسگاہ کے طلبہ کو چاہیے کہ اپنے مہمانوں کو یہ محسوس کرائیں
کہ وہ نہایت محبوب و معزز مہمان ہیں اور انھیں اپنی معاشرتی زندگی میں آزادی کے ساتھ ملائیں۔ اگر
قومی درسگاہیں بھی جو فرقہ وارانہ نہیں کہی جا سکتی ہیں حقیقتاً محدود ہیں کسی ایک فرقہ کے طالبوں کے
لیے، اور انھیں ان حد بندیوں کے توڑنے میں رہبری کرنا چاہیے۔

(۳) تاریخ کی نئی کتابیں اس نہج سے تیار کی جائیں کہ ان سے فرقہ وارانہ ذہنیت پیدا نہ ہو سکے بلکہ قومی
جذبے کے نشو و نما میں ایسی مدد ملے کہ تاریخی اور افسانوی ناموروں کو اور وطن کی نسبت سے ان تمام قومیں
اپنا مشترک ہیرو (ممدوح) تصور کریں۔ بہت سی کتابیں انھیں کے قلم سے یا ان کے زیر اثر اس غرض سے
لکھی گئی ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے حیات میں ایک دوسرے کے خلاف تلخی پیدا ہو اور اسکولوں اور
کالجوں میں جو کتابیں بطور نصاب پڑھائی جاتی ہیں عام طور پر انھیں جذبات کے زیر اثر لکھی جاتی ہیں۔
اگر انسانی تصانیف میں غلطی اور عصبیت کا ہونا ناگزیر ہے تو قلم سے قلم کا رخ ایسی طرف پھیر دینا چاہیے
کہ وہ مندمل شدہ زخموں کو از سر نو کھولنے کے بجائے "پرانی، بدنصیب دور از کار باتوں اور فرقہ
وارانہ جنگوں" کو معاف اور فراموش کرنے میں معین ہوں اور باہمی مودت و ہمدردانہ جذبات کو ابھاریں۔
ادبیات کے دوسرے شعبوں مثلاً نظم و افسانہ میں دونوں فرقوں کے مصنفین کو ایسی تصانیف
تیار کرنا چاہیے جو نئی زندگی کے جوش سے لبریز ہوں اور امید و اتحاد کا نیا پیغام سناتی ہوں۔ مختصر
افسانوں کے لکھنے والے اس بارے میں خاص طور پر امداد دے سکتے ہیں۔ بڑے تعلیمی اداروں کو
جیسے کہ بنارس اور علی گڑھ کی یونیورسٹیاں ہیں اس کام میں حصہ لینا اور دوسرے مصنفین اور
اہل قلم کی رہنمائی کرنا چاہیے۔

(۴) قومی زبان کی بحث کو مندرجہ بالا مسئلے سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ہندوستانی اب عام طور پر قومی
زبان سمجھی جاتی ہے۔ اور یہ زبان فارسی و عربی کے ملک کی دیسی زبان کے ساتھ مخلوط ہونے سے
نشوونما پائی ہے۔ اس کی دو صورتیں یعنی اردو اور ہندی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بعض
کلام کرنے اور دونوں فرقوں کے لیے تحریریں مرتب کرنے سے تیار ہوئی ہیں۔ کبیر، خسرو، رحیم خانخاناں

[illegible] ہیں، اور انہیں ہندی شاعروں نے اپنا لیا ہے [illegible] رہتے ہیں، اسی طرح [illegible]
[illegible] ہندو بھی اعلیٰ شاعر تھے، بعض ناظم تھے، بعض نثر نگار تھے اور بعض زبان کے محقق تھے اردو
[illegible] ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دونوں فرقوں کے باہمی اختلاط کے نشوونما کے ساتھ ساتھ ادب
[illegible] (ہندی و اردو) کو مل کر ہندوستانی ادب کا ایک دریا بن جانا چاہیے اور ایسی
[illegible] ہو اردو اور ہندی کے بہترین عناصر پر حاوی ہو اور جسے بغیر کسی دشواری کے وہ
[illegible] سمجھ سکیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔
[illegible] مقاصد کو زیادہ ترقی ہوتی اگر کانگریس اس پر اصرار کرتی کہ کانگریس اور اس کی
ماتحت مجالس کی جملہ کارروائیاں ہندوستانی زبان میں ہوں اور جس قدر جلد ایسا کیا جائے بہتر ہوگا۔ یہ
امر باعث اطمینان ہے کہ کانگریس کے سالانہ اجلاس ۱۹۲۵ء نے دستور العمل میں ایک دفعہ اضافہ
کر کے ہندوستانی کو کانگریس کی زبان تسلیم کر لیا۔ ہم پرزور سفارش کرتے ہیں کہ دستور العمل کے اس جزو
کا پوری طرح نفاذ کیا جائے۔ زبان اور رسم الخط کے متعلق ہماری دوسری سفارشات حسب ذیل ہیں۔
(الف) جن صوبوں میں ہندوستانی بولی جاتی ہے وہاں کے تمام طلبہ کو لازمی طور پر ہندی اور اردو ناگری و فارسی رسم الخط میں سکھائی جائے۔
(ب) جن صوبوں میں ہندوستانی بولی جاتی ہے وہاں کے تمام کانگریسیوں کو ہندی اور اردو جاننے کی دل سے
کوشش کرنا چاہیے اور جن صوبوں کے لوگوں کی مادری زبان ہندوستانی نہیں ہے انکو ہندوستانی سیکھنا چاہیے
خواہ ناگری حروف کے ذریعے یا فارسی رسم الخط میں۔
(ج) آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور اسکی ماتحت مجالس کو ان صوبجات میں جہاں دونوں رسم الخط رائج
ہیں اپنے اعلانات اور گشتیاں دونوں قسم کے حروف میں جاری کرنا چاہیے۔
(د) ہندی اور اردو کے مصنفین اور مقررین اور مدیران جرائد کو چاہیے کہ مشترک لفظوں کے استعمال کے ذریعے عام
ہندوستانی زبان کے نشوونما میں ہماری امداد دیں اور جہاں تک ممکن ہو عربی فارسی اور سنسکرت کے مشکل الفاظ سے احتراز کریں۔
(ہ) ہماری رائے ہے کہ فارسی رسم الخط زیادہ آسان اور صوتیاتی بنایا جائے۔ ہم خوش ہیں کہ مصنفین
اردو کی توجہ اس مسئلہ کی طرف پہلے ہی سے منعطف ہو چکی ہے۔
(و) ہم اسے بہت ضروری سمجھتے ہیں کہ کانگریس ایک ہفتہ وار اخبار جاری کرنے کی خدمت اپنے
ذمہ لے۔ اس اخبار میں خاص کر ایسے مضامین لکھے جائیں جن سے ان تمام مسائل کے متعلق رائے عامہ
کی تربیت ہو سکے جو کانگریس کے دائرہ عمل میں داخل ہیں۔ یہ مضامین ہندوؤں اور مسلمانوں کے قلم
[illegible] ہندوستانی زبان میں لکھے گئے ہیں جسکی ہم نے اوپر تائید کی ہے۔ ہر مضمون ناگری اور فارسی

[illegible] اردو نمبر ۱۲

[illegible] ہوئے۔ اس طرح پہلے ایک ہندوستانی ذہن بنانے ہر قوم کے [illegible]
[illegible] کی اہمیت پیدا ہوگی اور دوسرے مذہب والے ایک دوسرے کے خیالات [illegible]
[illegible] سکیں گے، اُن کی خوبیوں کو سمجھ سکیں گے اور پھر اپنے خیالات اور نظریات
میں مطابقت پیدا کر سکیں گے۔ دراصل لیکن اس وقت وہ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ ہر جماعت اپنے
شعاروں اور اپنے محبوب رسم الخط میں اپنے ہی خیالات کا مطالعہ کرتی ہے۔

(۵) چند ہندو نوجوانوں کو دستاویزات اس کی ترغیب دینا چاہیے کہ وہ اسلام اور اُس کے متعلقات کا اصل عربی ماخذ کے ذریعہ مطالعہ کریں اور اگر ممکن ہو تو اسی طرح چند مسلمان نوجوانوں کو اصلی سنسکرت کے ماخذوں سے ہندو مذہب کے مطالعہ کا شوق دلایا جائے اور اس مطالعہ کے دوران میں ان طالب علموں کو وظائف دیے جائیں۔

اعلیٰ تعلیم کے تمام اداروں میں مذہب اور تہذیبوں کے تقابلی مطالعہ کو ترقی دی جائے اور قومی تعلیمی اداروں کو ان امور میں رہنمائی کا فرض انجام دینا چاہیے۔

(۶) مقررین، مصنفوں، کارکنان اور مدیران جرائد کو اپنا مقدس فریضہ تصور کرنا چاہیے کہ ایسی باتوں کے کہنے اور شائع کرنے سے احتراز کریں جو ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ کے خلاف مشتعل کرنے والی ہوں۔ اور جو شخص [illegible] ارادۃً جذبات کو مشتعل کرنے کی کوشش کرے اس کے فرقہ کے رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ اس کی اس کارروائی پر علی الاعلان سرزنش کریں۔

([illegible]) شدھی اور تبلیغ کی تحریکات، جس طریقہ پر کہ گزشتہ دس سال میں چلائی گئیں، ملک کے ہندو مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کا خاص سبب ہوئی ہیں اور اُن کو موقوف کر دینا چاہیے۔ اس کا نہ یہ مطلب ہے کہ کسی شخص کو دیانت کے ساتھ مناسب اور ناقابل اعتراض طریقہ پر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے سے [illegible] جائے اور نہ یہ منشا ہے کہ مذہب تبدیل کرنے کا حق کسی شخص سے لے لیا جائے۔ البتہ ہم زور دے کر سفارش کرتے ہیں کہ جو لوگ اپنا مذہب تبدیل کریں اُن کو اپنا نام نہ بدلنا چاہیے۔ ہندوستانی مسیحی جماعت میں اکثر ایسے افراد اور اونچے طبقہ کے افراد نظر آتے ہیں جو اپنے پرانے نام برقرار رکھتے ہیں۔ اس سے [illegible] مدد اس بات میں ملتی ہے کہ محبت وطن کا جذبہ فرقہ واری میں جذب ہونے سے [illegible] ہے اور مذہبی عقائد کے خلوص پر کسی قسم کا اثر ڈالے بغیر معاشرتی تعلقات آسانی سے قائم [illegible] ہیں۔ سچا مذہب دل سے تعلق رکھتا ہے۔ نام اور لباس سے اسے کیا سروکار۔

[illegible] مختصر کہ پنچایتوں کو جن کا ذکر صفحہ ۱۲ میں ہو چکا ہے اس بات پر [illegible]

22-3-95

کے سلسلہ میں کوئی شخص نامناسب یا قابل اعتراض نزاع کھڑا نہ کرے۔
۱۸ سال سے کم عمر کے نابالغوں کا مذہب اُس وقت تک تبدیل نہ کیا جائے کہ اُنکے والدین یا اولیاء انکے
سب ۔ ہم لیں اور اگر ۱۸ سال سے کم عمر کا کوئی نابالغ کسی دوسرے فرقہ کے آدمیوں کو لاوارث
ملے تو اُسے چاہیے کہ فوراً اُس کے مذہب کے لوگوں کے سپرد کردے۔

نظر سے خوش گزرے

بحمد اللہ کہ اٹھارہویں جلد اس نمبر پر ختم ہو گئی۔ دفتر میں بچے ہوئے پرچوں کی ترتیب مکمل ہو جانے کے بعد آئندہ ماہ میں اعلان کیا جا سکے گا کہ کون سے پرچے متفرق طور پر فروخت کیے جا سکیں گے۔ جن صاحب کو درکار ہوں اس وقت مطلع کریں اور جن اصحاب کو سلسلۂ خریداری شروع ہونے کے بعد کوئی پرچہ اتفاق سے نہ پہنچا ہو سب سے پہلے انکی فرمائشات کی تعمیل ہوگی۔

ابھی تک الناظر انگریزی مہینے کی آخری تاریخوں میں شائع کیا جاتا رہا ہے مگر خیال یہ ہے کہ رفتہ رفتہ مہینہ کے شروع میں اشاعت ہونے لگے — مضامین کی تو بحمد اللہ اب کمی نہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ کے فضل سے فراوانی ہے تو بے محل نہ ہوگا۔ اسی سبب سے حجم بڑھانے میں آسانی ہوئی اور انشاء اللہ جنوری کا پرچہ اس سے بھی زیادہ ضخیم ہوگا۔ لیکن قدردانوں کی تعداد میں ضرورت کے مطابق ابھی تک اضافہ نہیں ہوا ہے۔

گزشتہ پچیس سال میں بے بضاعتی کے باوجود الناظر پر ہزارہا روپے صرف کیے گئے لیکن موجودہ کاروبار ابتری کے زمانہ میں مزید مالی قربانی ممکن نہیں ہے، اس لیے کوشش یہ ہونا چاہیے کہ الناظر کے قدردانوں کی تعداد اتنی کافی ہو جائے کہ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ حجم میں مزید مستقل اضافہ رفتار اشاعت پر منحصر ہے اگر موقع ملا، تو انشاء اللہ ۳۵ء میں الناظر کی اشاعت بڑھانے کے لیے مختلف شہروں کا دورہ بھی کیا جائے اور بزرگانِ بدایوں سُن رکھیں کہ سب سے پہلے وہیں حاضر ہونے کا قصد ہے

جن احباب کو الناظر اور اس کے ایڈیٹر سے واقعی محبت و ہمدردی ہو انھیں بجائے خود بھی اسکی سعی فرمانا چاہیے اور ارزاں ایڈیشن کی قیمت تو اتنی کم ہے کہ آسانی سے ہر مقام پر دو چار خریدار پیدا ہو سکتے ہیں۔

عرصہ سے خیال تھا کہ اپنی داستانِ اسیری قلمبند کرکے پیش کردوں تاکہ عام طور پر لوگوں کو معلوم ہو کہ ہمارے ملک کے جیل خانوں کے اندر کس قسم کی زندگی بسر ہوتی ہے اور اس شعبہ کا نظم و نسق کیسا ہے۔ اگر دس بارہ سال پیشتر یہ منصوبہ پورا ہو جاتا تو امید ہے کہ یہ داستان بہت دلچسپی سے پڑھی جاتی اور شاید بعض حالات کی اصلاح بھی ہو جاتی لیکن وقت نے یاوری نہ کی۔ اب انشاء اللہ کانپور کمیٹی کی رپورٹ سے فرصت کرکے یہ داستان الناظر ہی کے ذریعہ پیش کی جائے گی۔

دماغی ہیر آئل

یہ خوشبودار روغن طبی اصولوں پر تیار کیا ہوا بالوں کو بڑھاتا ہے۔ جڑیں اگر کمزور ہو گئی ہوں اور بال گرتے ہوں یا سفید ہونے شروع ہو گئے ہوں آنکھوں کی روشنی میں کمی ہو سر میں درد رہتا ہو تو اس کا استعمال کیجیے۔ دماغی کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ فی شیشی ۱۲ ار فی سیر چھ روپیہ

خضاب مازو

خضاب مازو بہت مشہور ہے مگر ہم نے اسکو ایسی ترکیب دی ہے کہ ممکن نہیں ایک مرتبہ لگانے اور دوبارہ کے لیے وہ اپنا گرویدہ نہ بنا لے۔ قیمت فی سیر پانچ روپیہ

ترکیب استعمال ۔ ہے کہ آملہ خشک کو بھگو دیجیے اگر جلدی ہو جوش دیکر اسکے پانی میں گاڑھا گاڑھا لگائیے حاجت استرہ وغیرہ کی نہیں ہے۔ کسی قسم کا تیل ملکر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک بندش رہے بعد خشک ہو جانے کے کھول ڈالیے بعض کھلی اور بیسن سے دھو کر کسی قدر خوشبودار روغن لگا دیجیے۔ بال لامثل ریشم اصلی رنگ کے ہو جائیں گے۔ کوئی داغ دھبہ یا سیاہی جلد پر نہ آنے دیگی۔

حسن افزا

نہایت اعلیٰ درجہ کا منجن ہے جس کی خوبی صرف ایک ہفتہ لگانے سے معلوم ہو جائے گی۔ رنگ کو صاف کرتا ہے حسن کو نکھارتا ہے۔ جھائیوں کا دشمن ہے۔ صابن یا بیسن کے بجائے اس سے منہ دھونا چاہیے۔ قیمت فی ڈبیہ ۱۲ ر

داحدی صاحب کا منجن اکسیر دنداں

یہ منجن اس نسخہ سے بنایا گیا ہے جو ملا واحدی صاحب ایڈیٹر نظام المشائخ کو ان کی اڈیٹری طبیب کے زمانے میں ۱۹۱۲ء میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے عنایت فرمایا تھا۔ اس سے دانتوں اور مسوڑھوں کی تمام خرابیاں اور تکلیفیں رفع ہو جاتی ہیں۔ بیس سال سے واحدی صاحب اسے خود بھی استعمال کرتے ہیں اور اپنے شہر کے ہر معزز تشنہ کو بھی دیتے ہیں۔ ہر شخص اس کا ثناخواں ہے اور اسے سب سے اچھا منجن تسلیم کرتا ہے۔ سینکڑوں ہلتے ہوئے دانت اس منجن نے جوڑ دیے۔ متعدد آدمی ایسے تھے جنہیں پائیوریا کی شکایت تھی اور ہر کھانے کے ساتھ مسوڑھوں کا خون اور مسوڑھوں کی پیپ پیٹ میں اتر اتر کر ان کی صحت کو برباد کر رہی تھی صرف اس منجن کی بدولت سے ان کے مسوڑھے اچھے ہو گئے اور آج وہ خدا کے فضل سے تندرست ہیں۔ جس منجن سے پائیوریا جیسے موذی مرض کو آرام ہوتا ہو اور جس منجن سے ہلتے ہوئے دانت جڑ جاتے ہوں اس کے دوسرے معمولی فوائد بیان کرنے فضول ہیں۔ یہ خیال کرکے کہ دہلی سے باہر کے لوگوں کے پاس بھی اس منجن کو پہنچایا جائے ہم نے واحدی صاحب سے منجن کا نسخہ حاصل کیا ہے اور وہ کثرت کی لاگت فروخت کر رہے ہیں

قیمت فی شیشی ۸ ر (آٹھ آنے) محصول ۵ ر، دو اور تین شیشیوں پر محصول ۸ ر لگتا ہے۔

نیجر کارخانہ کاظم علی ... و کوٹھی ایسٹرن ... رسالہ نظام المشائخ ۵۸ کوچہ چیلان - دہلی